سرورق پہلے والا ہے، بیک ٹائٹل پر دیا گیا میٹر ۲۰۱۴ء کا ہے

حیدر قریشی کی اب تک کی کتابیں

(یہ کتابیں مختلف شعری، نثری اور نثری و شعری مشترکہ کلیات کے کتابی اور انٹرنیٹ ایڈیشنز میں شائع ہو چکی ہیں)

تخلیقی ادب

سلگتے خواب (غزلیں)　　عمرِ گریزاں (غزلیں، نظمیں اور ماہیے)

محبت کے پھول (ماہیے)　　دعائے دل (غزلیں، نظمیں)

درد سمندر (غزلیں، نظمیں، ماہیے)　　زندگی (غزلیں، نظمیں، ماہیے)

روشنی کی بشارت (افسانے)　　قصے کہانیاں (افسانے)

میری محبتیں (خاکے)　　کھٹی میٹھی یادیں

فاصلے قربتیں (انشائیے)　　سوئے حجاز (عمرہ و حج کا سفرنامہ)

....

تنقید و تبصرے

حاصلِ مطالعہ　　تاثرات　　مضامین اور تبصرے

ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ما بعد جدیدیت

ستیہ پال آنند کی ”.....بودنی نابودنی“

....

اردو ماہیا تحقیق و تنقید

اردو میں ماہیا نگاری.....اردو ماہیے کی تحریک.....

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما

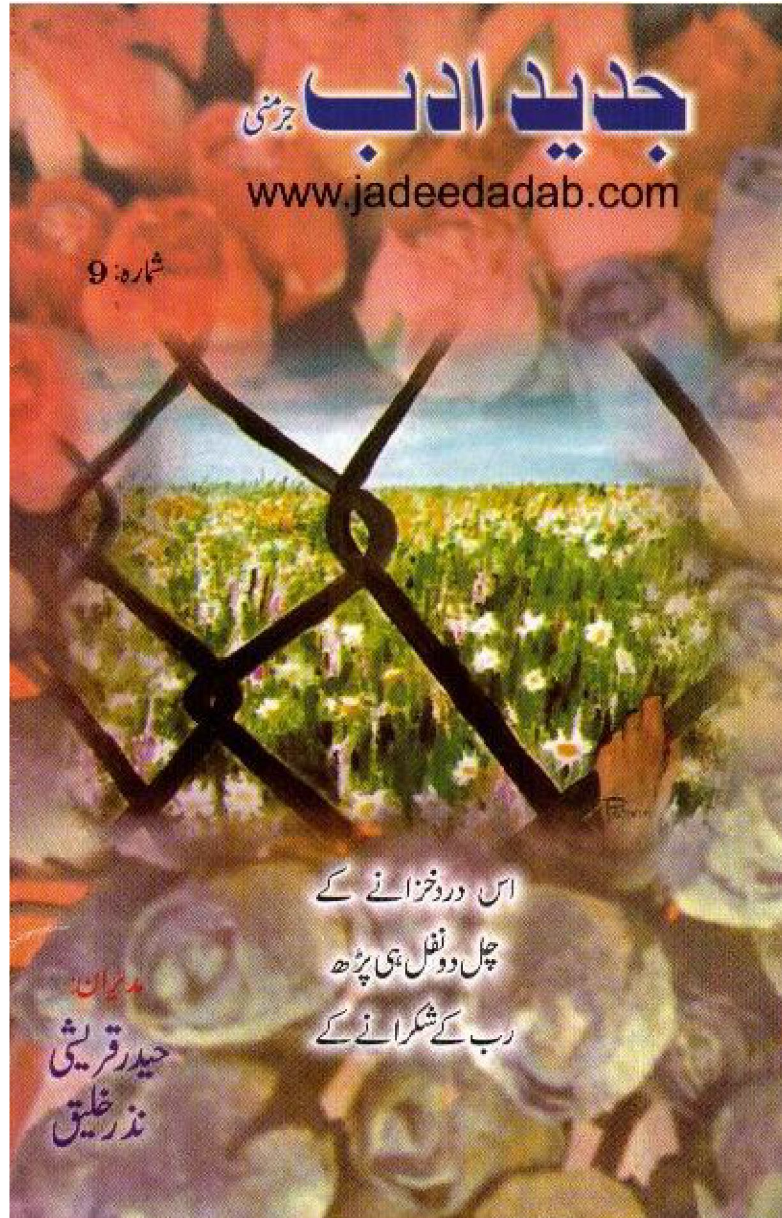
اردو ماہیا..........اردو ماہیے کے مباحث

....

حالاتِ حاضرہ (انٹرنیٹ کالموں کے مجموعے)

منظر اور پس منظر　　خبر نامہ

ادھر اُدھر سے　　چھوٹی سی دنیا (صرف ای بک)



اردوستان: انٹرنیٹ کی دنیا کا ایک اہم نام۔اردو کی سب سے پرانی ویب سائٹ جو اردو سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔اردوستان نیٹ ورک کی بنیادی اور اہم ترین ویب سائٹ۔

کاشف الھدیٰ کی نفع و نقصان سے بے نیاز رہ کر اردو کی خدمت کی لگن

www.urdustan.com

حیدرقریشی کا کالم **منظر اور پس منظر** اور کالم **خبر نامہ** بھی ان لنکس پر موجود ہیں۔

http://www.urdustan.com/manzar/

http://urdustan.com/khabarnama/

کتاب گھر: مفت اردو کتب (E-Books) فراہم کرنے والی سب سے بڑی ویب سائٹ، جس میں مختلف موضوعات پر ۱۰۰ سے زائد کتب مطالعہ کے لئے آن لائن دیکھی جاسکتی ہیں یا ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہیں۔ **www.kitaabghar.com**

کاشف الھدیٰ، حسن علی اوران کے دوسرے ساتھیوں کی اردو کے فروغ کے لئے ایک اور کاوش

اردو دوست ڈاٹ کام : خورشیداقبال کی خوبصورت ویب سائٹ

www.urdudost.com

سہ ماہی ادبی رسالہ **کائنات**،ادبی خبر نامہ **اردو ورلڈ**،ادیبوں کی تصاویر پر مشتمل **ادبی البم**, ای بکس کا سلسلہ **اردو دوست لائبریری** اور دلچسپی کے متعدد دوسرے سلسلوں سے مزین ویب سائٹ۔

حیدرقریشی کے کالموں کا نیا سلسلہ **اِدھر اُدھر سے** بھی اسی سائٹ پر چھپتا ہے۔

حیدؔر اک اور ہی دنیا ہے یہ انٹرنیٹ کی
کیا سے کیا ہو گیا ہوں سات برس کے اندر

www.haiderqureshi.com

حیدرقریشی کی تخلیقات پر مشتمل ویب سائٹ جس میں غزلیں، نظمیں، ماہیے، (پانچ شعری مجموعے)، دوافسانوی مجموعوں کے افسانے، ایک مجموعہ کے خاکے، کتاب کھٹی میٹھی یادیں، سفرنامہ سوئے حجاز، انشائیوں کا مجموعہ، حیدرقریشی سے لئے گئے انٹرویوز اور مزید بہت کچھ آن لائن ہے۔مجموعی طور پر بارہ سے زیادہ کتب ایک ہی ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔

----

http://haiderqureshi.spaces.live.com/

حیدرقریشی کی شعری ونثری تخلیقات کے انگریزی تراجم کی ویب سائٹ۔جہاں انگریزی تراجم کے ساتھ بعض تخلیقات کے جرمن، ترکی اور عربی تراجم بھی موجود ہیں۔ترجمہ نگاروں کی تصاویر سے مزین ایک سادہ مگر دلچسپ ویب سائٹ۔ایک انگریزی ویب سائٹ کی طرف سے لیا گیا انٹرویو اور ایک اور سائٹ کی طرف سے حیدرقریشی کو Auther of the Month (september 06) کے طور پر چھاپنے کے بعد اس سائٹ کی گیسٹ بک پر آنے والے تاثرات کو اس سائٹ پر حوالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

حیدرقریشی کی شاعری کے تراجم کے لئے اس لنک کو کلک کریں:

http://haiderqureshi.blogspot.com/

حیدرقریشی کے افسانوں کے انگریزی تراجم کے لئے اس لنک کو کلک کریں:

http://haiderqureshisstories.blogspot.com/

سروَر ادبی اکادمی جرمنی کے زیرِ اہتمام

بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ

جدید ادب

www.jadeedadab.com

شمارہ:9 (جولائی تادسمبر 2007ء)

رابطہ کرنے کے لئے اور تخلیقات بھیجنے کے لئے ایڈریسز

1-Haider Qureshi Rossertstr.6 , Okriftel, 65795-Hattersheim, Germany.

2-Prof. Nazar Khaleeq Mohallah Raheemabad, Khanpur-64100,(Pakistan)

جن احباب کے پاس ای میل کی سہولت ہے وہ ان پیج فائل میں اپنا میٹر ان ای میل ایڈریسز پر بھجوائیں۔شکریہ

hqg786@arcor.de اور khaleeqkhanpur@yahoo.com

ملنے کا پتہ

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,VAKIL STREET,KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6,(INDIA)

PH:23215162, 23214465, FAX: 011-23211540

E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

فہرست

ٹائٹل کی پینٹنگ: پروین شیر (کینڈا)

اردو ایک بڑی زبان ہے جس کی تشکیل و تعمیر میں مختلف مذاہب اور ممالک کے لوگ شامل رہے ہیں اور جس طرح آج کے دور میں کسی انگریز کی یہ ڈینگ مضحکہ خیز ہے کہ انگریزی صرف انگریزوں کی ملکیت ہے، بالکل اسی مانند اردو کو بھی ان سبھی خطوں اور فرقوں سے وابستہ نہ کرنا جنہوں نے اسے سدا اپنائے رکھا ہے، اس ہمہ جہت زبان کو بعض مخصوص مقامات کا اسیر کر کے اس کی فطری ہمہ جہتی کا قلع قمع کرنا ہے۔زبانیں صرف ان کی ہوتی ہیں جو انہیں یہاں اور اِس وقت جانتے ہوں اور وسیع تر انسانی روابط کے سبک اور صحیح اظہار پر قادر ہوں۔ان کی نہیں جنہیں کچھ کہہ پانے کی بجائے رٹے رٹائے محاورے ادا کرنا ہوں۔جس زبان سے میری تخلیقی شناخت طے پاتی ہے وہ خواہ میری مادری زبان ہو خواہ اختیاری، وہی میری زبان ہے۔(**جوگندر پال** کے مضمون **نوشتہ** سے اقتباس)

Jadeed Adab ist kostenlos,man muss nur die Versndkosten Übernehmen.

گفتگو! اردو کی بستیوں میں ادب کی صورتحال پر میں نے چار سال پہلے جو رائے لکھی تھی وہ اس اداریہ میں دہرانا پڑ رہی ہے۔یہ رائے یہاں کے صرف جینوئن لکھنے والوں کے حوالے سے ہے۔

''اگر خالصتاً ادبی سطح پر بات کی جائے تو مغربی ممالک میں تخلیقی سطح پر کوئی ایسا بڑا بریک تھرو دیکھنے میں نہیں آیا جس سے کہا جا سکے کہ اردو کے ادبی سرمایہ میں کوئی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔۔۔۔۔وہ شاعر اور ادیب جو مغربی ممالک میں طویل قیام کی پہچان رکھتے ہیں اور دلجمعی کے ساتھ ادبی خدمت میں مشغول ہیں، ان سب کی ادبی پہچان ادب کے مرکزی دھارے کے حوالے سے ہی ہوتی ہے۔مغربی ممالک کی تخصیص کے ساتھ ان کی انفرادیت ادبی طور پر سامنے نہیں آتی۔مثلاً شاعری میں ابھی تک روایتی اور ترقی پسند انداز کا ملا جلا رنگ رائج ہے۔البتہ کبھی کبھی یادِ وطن کے حوالے سے بعض اچھے اشعار ضرور سامنے آ جاتے ہیں۔یہاں کے افسانہ نگاروں کا ایک اہم موضوع ہجرت یا ترکِ وطن ہے۔اس موضوع پر بہت کہانیاں لکھی گئی ہیں۔لیکن ہجرت کے موضوع پر ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان اور ہندوستان میں جس پائے کی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں، مغرب کے ہمارے اردو افسانہ نگار اس سطح کو مس بھی نہیں کر سکے۔شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ۱۹۴۷ء کی ہجرت نے دلوں میں گہرے گھاؤ پیدا کئے تھے۔۔۔۔سب دکھی تھے۔جبکہ مغرب میں آ بسنے والے وطن سے زیادہ آرام کی دنیا میں آتے ہیں۔یہاں کا کھلا ماحول انہیں شاید ان کیفیات سے آشنا ہونے ہی نہیں دیتا جو تخلیقی کرب کا لازمہ ہے۔مغربی چکا چوند میں جنس نگاری کی طرف رغبت فطری بات ہے۔لیکن اس میں بھی خرابی یہ ہوئی کہ منٹو، عصمت چغتائی اور ممتاز مفتی اس حوالے سے جتنا کچھ اردو کو دے گئے ہیں، اس کے بعد مغرب کے اردو افسانہ نگار جنسی لذت تو کشید کر لیتے ہیں لیکن فن کی اس سطح تک نہیں پہنچ پاتے جو ایک معیار کے طور پر پہلے سے اردو میں موجود ہے۔افسانے کی دنیا میں جہاں ہمیں اپنے ثقافتی تصادم کا سامنا کرنا پڑا ہے اور جہاں مختلف ثقافتی المیے سامنے آتے ہیں وہاں چند اچھی کہانیوں نے تبدیلی کا احساس دلایا ہے۔۔۔۔۔۔تاہم ثقافتی تصادم کی عام کہانیاں بھی اخباری رنگ میں زیادہ بیان کی گئی ہیں یا پھر خواتین کے زیب النساء طرز میں لکھی گئی ہیں۔مغرب میں شاعروں اور ادیبوں نے مغربی سائنسی ترقیات اور جدید تر صورتحال کو تا حال گہری اور تخلیق کار کی نظر سے نہیں دیکھا۔یہی وجہ ہے کہ ان موضوعات سے ان کے افسانے خالی ہیں۔اس کے باوجود وہ سارے اوریجنل تخلیق کار داد اور تحسین کے مستحق ہیں جو پردیس میں بیٹھ کر اپنے دیس کی زبان کو نہ صرف یاد رکھے ہوئے ہیں بلکہ اس کی محبت میں اپنی بساط کے مطابق تخلیقی کام بھی کئے جا رہے ہیں۔ان سب کا جذبہ قابلِ قدر ہے۔''

(''**تیسرے ہزاریے کے آغاز پر اردو کا منظر**، مطبوعہ ماہنامہ **اخبارِ اردو** اسلام آباد۔شمارہ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

حیدر قریشی

فرمانِ خداوندی

اِنّاالذین اٰ منوا والذین ھادواوالنصٰرٰے والصٰبئین من امن بالله والیوم الا ٰخر و عمل صالحاََ فلھم اجرھم عند ربھم،ولاخوف علیھم ولا ھم یحزنون (سورۃ البقرہ:۶۲)

منظوم ترجمہ : **نذر خلیق** (خانپور)

یقیناً لوگ جو ایمان لائے ہیں
مسلماں ہوں،
یہودی ہوں کہ نصرانی وصابی ہوں
کوئی بھی ہوں
خدا پر اور یومِ آخرت پر
جو کوئی ایمان رکھتا ہے
خدا کے پاس
اس کا اجر اُن کے واسطے موجود ہے
وہ اجر کہ جس کے نتیجہ میں
نہ ان کو خوف ہوگا
اور نہ وہ غمگین ہی ہوں گے

دعا

حضرت داؤد علیہ السلام

خدا ہم پر رحم کرے اور ہم کو برکت بخشے
اور اپنے چہرہ کو ہم پر جلوہ گر فرمائے۔ (سلاہ)
تا کہ تیری راہ زمین پر ظاہر ہو جائے
اور تیری نجات سب قوموں پر۔
اے خدا! لوگ تیری تعریف کریں۔
سب لوگ تیری تعریف کریں۔
اُمّتیں خوش ہوں اور خوشی سے للکاریں
کیونکہ تو راستی سے لوگوں کی عدالت کرے گا۔(سلاہ)
اے خدا! لوگ تیری تعریف کریں۔
سب لوگ تیری تعریف کریں
زمین نے اپنی پیداوار دے دی
خدا یعنی ہمارا خدا ہم کو برکت دے گا
خدا ہم کو برکت دے گا
اور زمین کی انتہا تک سب لوگ اس کا ڈر مانیں گے۔

کتاب زبور کا مزمور نمبر ۶۷
(میر مغنّی کے لئے تاردار سازوں
کے ساتھ مزمور یعنی گیت)

فی الدّنیا

حضرت علیؑ

انما الدنیا فناء لیس للدنیا ثبوت
دنیا فنا ہونے والی ہے۔دنیا کے لئے کوئی پائیداری نہیں ہے۔

انما الدنیا کبیت نسجتہ العنکبوت
دنیا ایسے گھر کی مانند ہے جسے مکڑی نے تنا ہوا ہے۔

ولقد یکفیک منھا ایھا الطالب قوت
اے دنیا کے طالب! تیرے لئے اس دنیا سے صرف خرچہ کے لئے مال ومتاع کافی ہے۔

ولعمری عن قلیل کل من فیھا یموت
مجھے میری قلیل عمر کی قسم عنقریب دنیا تھوڑے عرصہ میں مرجائے گی۔

حمدِ باری تعالیٰ

صبا اکبر آبادی

نظروں پہ وہ ظاہر نہیں
ہر ذرے میں ہے جا گزیں
اُس کا فلک اُس کی زمیں
اللہ ربُّ العالمیں

یہ بحر و بر یہ خشک و تر
دشت و جبل شمس و قمر
یہ ثابت و سیار تا حدِ نظر
ہیں اُس کی وحدت کے امیں
اللہ ربُّ العالمیں

مٹی کی یہ رنگینیاں
یہ ریگزار و گلستاں
قدرت کے ہیں اُس کی نشاں
اُس کا کوئی ثانی نہیں
اللہ ربُّ العالمیں

حمدِ باری تعالیٰ

صادق باجوہ (امریکہ)

تری حمد کیسے بیاں کروں، ہے زباں میں تاب وتواں کہاں
ہے ہراِک صفت تری بیکراں میرے پاس زورِ بیاں کہاں

تری یاد میں جو سرور ہے وہ جہاں میں اور کہاں ملے
ترے در پہ خاک میں جو ملے انہیں رِفعتوں کے جہاں ملے

کہیں چاہتوں کے پہاڑ ہیں کہیں خواہشوں کے غبار ہیں
ہو قناعتوں سے نہ واسطہ تو یہ حسرتوں کے مزار ہیں

عجب اس فقیر کی ہے غناء جو جھکائے سر کو کھڑا رہا
کبھی مل گیا تو اُٹھا لیا نہ ملا تو در پہ پڑا رہا

میں بھی در کا ایک فقیر ہوں تری شفقتوں کا اسیر ہوں
جو بنا تھا ذرۂ خاک سے میں اسی بشر کا سفیر ہوں

نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

صبا اکبر آبادی

ایک اک بات زمانے پر اثر کرتی ہے
حق کی آواز ہو، اللہ کا لہجہ تم ہو

تم نے انسان کو انسان کی عظمت بخشی
بندگی کے لئے انعام خدا کا تم ہو

کوئی ثانی ہے تمہارا، نہ خدا کا ہے شریک
جیسے یکتا ہے خدا، ویسے ہی یکتا تم ہو

میں کسی اور سے کیا عرضِ تمنا کرتا
میرے مالک، مرے مولا، مرے آقا تم ہو

جس نے مہکا دیا گلشن وہ تمہارا ہے خیال
جس نے چمکا دیا عالم وہ اجالا تم ہو

نعت گوئی میں فرشتوں نے سنا تھا مرا نام
حشر میں دیکھ کے مجھ کو کہا ''اچھا تم ہو''

جو کہا تم نے زباں سے وہی تسلیم کیا
اصل میں مذہب و ایمان صبا کا تم ہو

نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

سعید رحمانی (کٹک)

نام ان کا لے کے میں شام و سحر روشن کروں
یاد کے دیپک جلاؤں، دل کا گھر روشن کروں

گنبدِ خضرا سے آتی ہے جو چھن کر روشنی
میں اسی سے اپنی محرابِ نظر روشن کروں

ہونٹ پر اپنے جلا کر میں درودوں کے چراغ
ہر گھڑی اپنی دعاؤں میں اثر روشن کروں

مشعلِ رشد و ہدایت کے شگفتہ نور سے
اپنی سوچوں کے اندھیرے بام و در روشن کروں

نقش پا ان کے اجالا دے رہے ہیں آج بھی
ان پہ چل کر اپنی ہر راہِ سفر روشن کروں

نعت کی قندیل لفظوں میں سجا کر اے سعیدؔ
میں غزل کے شہر کا بابِ ہنر روشن کروں

سلام

خاور اعجاز (ملتان)

لیتا نہیں مَیں نام بھی اُس ناسپاس کا
جس کو فرات کہتے ہو صحرا ہے پیاس کا
اِک سر ہے سربلند جہاں پر سرِ سناں
پرچم ہے سرنگوں وہاں خوف و ہراس کا
شامِ ملال و حزن کی مجبوریوں میں بھی
اُسؓ نے دیا جلایا نہیں التماس کا
اُسؓ کا غنیم کھینچ رہا تھا لہو لکیر
وہؓ پھول رکھ رہا تھا جہاں پر کپاس کا
آنے لگی ہے شامِ غریباں قریب تر
منظر اداس ہونے لگا آس پاس کا
دشمن نہیں ہے ہوش میں، صرف اِس دلیل پر
کیوں چھوڑ دے حسینؓ بھی دامن حواس کا

مسز صوفیہ یوسف

انچارج چیئرپرسن

شعبہ اردو جامعہ شاہ عبداللطیف خیرپور سندھ

نسائی ادب اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

سولھویں صدی سے انیسویں صدی کے نصف اول تک برصغیر پاک و ہند کی سماجی اور ادبی تاریخ کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں خواتین، ناخواندگی، پردے کا نظام اور فرسودہ معاشرتی رسوم کی بدولت اجتماعی طور پر زندگی کے تمام شعبوں میں کوئی خاص بھرپور کردار نہیں ادا کرسکیں۔

کسی بھی معاشرے کی بہتری اور ترقی کے لیے عورتوں کی تعلیم ہمیشہ ایک اہم بنیادی اور حساس معاملہ رہا ہے۔ معاشرتی ترقی کے لیے یہ ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی کے عورتوں کو معاشرے کا فعال اور متحرک حصہ بنایا جائے تاکہ معاشی اور معاشرتی ترقی کے تمام عوامل اپنی قوت کے ساتھ تعمیر و تہذیب میں شامل کیے جاسکیں۔ آج جو ممالک ترقی یافتہ اور مہذب سمجھے جاتے ہیں ان کے عروج کی اہم وجہ تعلیم نسواں ہے۔ اس اہم ضرورت کو انیسویں صدی تک برصغیر پاک و ہند میں نظرانداز کیا گیا، فرسودہ رسومات کے عروج کی بدولت اس معاشرے میں لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا رہا جس کی وجہ سے خواتین جہاں دیگر شعبہ زندگی میں پیچھے تھیں وہاں اردو زبان کی ترقی میں بھی اجتماعی طور پر کوئی خاص کردار ادا نہیں کرسکیں۔

۱۱/اپریل ۱۸۵۰ سے برطانوی حکومت نے عورتوں کے تعلیمی اداروں کی سرپرستی شروع کی (۱) لیکن ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کی ناکامی نے نفسیاتی طور پر یہاں کے مسلمانوں پر بہت بُرا اثر ڈالا اور وہ برطانوی حکومت کی طرف سے کی جانے والی معاشرتی اصلاحات سے بالکل الگ تھلگ ہوگئے، جس کا انھیں من حیث القوم شدد نقصان اُٹھانا پڑا۔

تعلیم کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے مسلمانوں کے باشعور اور مستقبل پر گہری نظر رکھنے والے، اہل درد حلقوں نے کوششوں کا آغاز کیا۔ لاہور ۱۸۸۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس) (۲) کے اجلاس میں عورتوں کی تعلیم کے لیے قرارداد پیش کی گئی لیکن مذہبی حلقوں کی مخالفت کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔ یہ قرارداد نامنظور ضرور ہوئی لیکن مخالفت کے منظر عام پر آنے سے اندرون خانہ ایک زبردست عملی

منصوبہ بندی شروع ہوئی جس کے نتائج کی واضح جھلک ہمیں ۱۹۰۳ء میں کانفرنس کے اجلاس کے دستاویزات میں ملتی ہے۔ یہ اجلاس اس لیے بھی تاریخی طور پر اہم ہے کے اس میں عورتوں نے پہلی بار حصہ لیا اور مدراس کی خاتون 'چاند بیگم' نے مضمون بھی پڑھا۔ اس مضمون میں انھوں نے 'ریفارمر گروپ' کی حمایت کی جو مذہبی حلقوں کی مخالفت کے باوجود تعلیم نسواں کے لیے کوشاں تھا۔ شیخ عبداللہ اور اُن کی اہلیہ کی سربراہی میں کانفرنس کا شعبہ خواتین قائم کیا گیا جس نے اپنی پوری توجہ تعلیم نسواں پر مرکوز رکھی اور ان کی سربراہی میں یہ قافلہ اپنی منزل کی حصول کے خاطر باقاعدہ پیش قدمی میں مصروف عمل ہوا۔

۱۹۰۵ء میں کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں مولانا حالی نے اپنی مشہور نظم 'چپ کی داد' پڑھی جو کے عورتوں پر لگائی جانے والی بے جا پابندیوں کے خلاف احتجاج تھا (۳)۔ مولانا کی یہ نظم ایک واضح اعلان اور نام نہاد مذہبی ٹھیکیداروں کے لیے پیغام بھی تھا کہ صحیح اور سچا مسلمان عالم و دانشور عورتوں کی تعلیم کے خلاف کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔ ۱۹۱۴ء کا سال خواتین کے لیے مبارک سال ثابت ہوا اسی سال کانفرنس کی کوششوں سے آل انڈیا مسلم خواتین کانفرنس کا قیام عمل میں آیا جسے برصغیر پاک و ہند میں عورتوں کی پہلی تنظیم ہونے کا اعزاز حاصل ہے (۴)۔ آہستہ آہستہ یہ تحریک جو کے کانفرنس کے پلیٹ فارم سے شروع ہوئی تھی اس کا اثر پورے ملک میں محسوس کیا جانے لگا۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے رضا کارانہ طور کیے جانے والے کاموں نے مسلمان عورتوں کے اندر بیداری پیدا کی۔ ایک اندازے کے مطابق ۱۹۱۱ء میں پڑھی لکھی عورتوں کی تعداد فی ہزار صرف دو تھی اور ۱۹۲۱ میں یہ تعداد دوگنی ہوگئی اور ایک اندازے کے مطابق ۱۹۴۲ میں ۱۳۷۸۰۰ مسلم خواندہ تھیں جن میں سے ۳۹۴۰ نے جدید تعلیم حاصل کی تھی (۵)۔

اُردو نے ایک ثقافتی زبان ہونے کے ناطے عورتوں کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے ایک فورم مہیا کیا۔ خواتین کے لیے متعدد رسالوں کا اجرا ہوا، بہت جلد یہ رسائل مسلم گھرانوں میں پہنچنے لگے ان کی وجہ سے معمولی تعلیم یافتہ پردہ نشین خواتین میں بھی تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار باصلاحیت تخلیق کار خواتین سامنے آئیں۔ ان کے مضامین، افسانے اور شاعری ان رسائل میں شائع ہونے لگے اور اسی طرح ان رسائل کی وجہ سے خواتین کی ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔

ادب انسان کی روحانی قوت اور انفرادی ذہانت کا تخلیقی اظہار ہے، جس سے وہ زندگی کے سرچشموں کو توانائی بخشتا ہے لیکن کسی قوم کی تہذیبی اور ادبی تاریخ اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس قوم کی لسانی، ادبی اور معاشرتی سرگرمیوں میں خواتین کی شمولیت اور کارکردگی کو شامل نہ کیا جائے۔ متحدہ ہندوستان کی خواتین نے ادب کے ہر شعبہ میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے جو ہمارے ادب کا سرمایہ ہیں، ابتدائی قابل ذکر کوششوں میں ۱۸۹۶ میں عورتوں کا ہفتہ روزہ 'تہذیب نسواں' ہے جو لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا (۶)۔ اس کے پہلے شمارے سے ہی عورتوں کے بڑے حلقے نے اس میں لکھنا شروع کردیا تھا۔ ان کی یہ تحریریں صرف خانہ پوری نہیں تھیں بلکہ اس وقت کے اہم معاشرتی مسائل پر عورتوں کی واضح خیالات و نظریات ہیں جو ہمارے سامنے آجاتے

ہیں انہوں نے جن معاشرتی مسائل کو اپنا موضوع بنایا اُن میں توہمات، جہیز، فضول خرچی اور عورتوں کی تعلیمی و معاشی حالت وغیرہ اہم ہیں۔ یہ تخلیقات اپنی فنی اور فکری خوبیوں کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کے شعور سے عبارت ہیں۔ کہنے کو تو یہ آغاز تھا لیکن خواتین لکھاریوں کی تخلیقات میں پختگی اور روحِ عصر بدرجہ اتم موجود تھی، انہوں نے صرف اپنی تخلیقات کی معرفت اپنے مشاہدات تجربات اور احساسات کا کھل کر اظہار کیا بلکہ ان کی تحریروں کی معرفت جو اردو زبان و ادب تقویت ملی وہ اردو کی ادبی تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ ہے۔

ذیل میں چند اہم شاعرات اور نثر نگار خواتین کا مختصر تعارف پیش ہے جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی سرپرستی اور ہمت افزائی کی بدولت اردو زبان و ادب کی خدمت میں پیش پیش تھیں۔ یوں تو یہ ایک طویل فہرست ہے لیکن مقالے کی طوالت کو مدنظر رکھتے ہوئے چند نمایاں نام اور ان کے کام جھلک پیش کی جاتی ہے۔

نواب شاہ جہاں بیگم (۱۸۳۸۔۱۹۰۰) تخلص شیریں، شعر و شاعری کا ذوق فطری تھا فارسی اور اُردو میں شعر کہتی تھیں۔ اُردو غزلوں کا دیوان 'دیوانِ شیریں' کے نام سے ۱۸۸۸ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ آپ کا کلام سلیس اور رواں ہے ایک جھلک ملاحظہ ہو:

دردِ فراق ہی میں سدا مبتلا رہے
دنیا میں اس طرح بھی رہے تو کیا رہے
لطف کیا پاؤ گے تنہا دِل شیدا لے کر
دیکھیے سیر بھی کچھ یاس و تمنا لے کر (۷)

رضیہ خاتون جمیلہ (۱۸۶۹۔۱۹۲۱) کی قادرالکلامی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے سات دیوان مرتب کیے ان کا کلام سادگی اور شائستگی کا نمونہ ہے:

فدا جس پر ساری خدائی ہوئی ہے
وہ تصویر کس کی بنائی ہوئی ہے (۸)

زاہد خاتون نزہت (۱۸۹۴۔۱۹۲۲) اُردو شاعری کا اہم نام ہیں۔ یہ پہلی شاعرہ ہیں جنہیں ان کی توانا فکر اور طرز کلام کی وجہ سے نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا اگرچہ انھوں نے اپنی شناخت کو پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کی مگر ان کی نظموں نے قارئین کو اپنی طرف متوجہ رکھا۔ ان کے دو شعری مجموعے 'آیئنہ حرم' اور 'فردوسِ تخیل' منظر عام پر آئے ان کی ایک نظم جو مسلم یونی ورسٹی کے لئے چندے کی اپیل کے سلسلے میں رسالہ 'عصمت' کے اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوئی تھی بہت مقبول ہوئی:

اے فخرِ قوم بہنو عصمت شعار بہنو
مردوں کی ہو ازل سے تم غم گسار بہنو (۹)

رابعہ پنہاں کی غزلیں ان کے ہم عصر مرد شعراء کے طرز اظہار سے مختلف ہیں۔ تاہم ان کی کیفیات اور تجربات ایک عورت کے جذبات کے آیئنہ دار ہیں:

میری تو ہر ادا ہے وقف عبودیت
وہ ہر ادا میں حُسن کلیسا لئے ہوئے (۱۰)

بلقیس جمال، رابعہ پنہاں کی بہن تھیں۔ ان کی شاعری میں نسائی اظہار اور نسائی شعور نمایاں ہے۔ انھوں نے ۱۳ سال کی عمر سے شاعری کا آغاز کیا:

اسے پاتی بھلا عقلِ رسا کیا
ہماری فہم و ادراک و ذکا کیا
گریباں چاک اور پلکوں پہ آنسو
سحر ہوتے ہی پھولوں کو ہوا کیا (۱۱)

اس دور کی خواتین کے کلام میں زبان و بیان کی صفائی و چستی نمایاں ہے۔ نازک جذبوں کا اظہار موجود ہے اس کے علاوہ خواتین نے تصوف، مذہب، زندگی کی بے ثباتی، حالات کی بے اطمینانی اور سماجی و معاشرتی مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا۔

جہاں تک نثر کا تعلق ہے تو دور اول کی نثر نگار خواتین ڈپٹی نذیر احمد سے متاثر نظر آتی ہیں۔ رشید النساء (پہلی خاتون ناول نگار) جنھوں نے ۱۸۸۱ میں ناول 'اصلاح النساء' لکھا (۱۲)۔ اس ناول میں اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔ صغرا ہمایوں مرزا کی کئی تصانیف ہیں وہ ایک مخصوص طبقے کی عکاسی کرتی ہیں ان کا بنیادی مقصد خواتین کی آزادی اور معاشرے کی اصلاح ہے۔ سیدۃ النساء کے مضامین اور افسانے کئی سالوں تک تہذیب نسواں میں شائع ہوتے رہے۔ عباسی بیگم کا تعلق ایک روشن خیال گھرانے سے تھا۔ انھوں نے افسانوں اور ناول کے علاوہ فلسفیانہ مضامین بھی تحریر کیے۔ امت الوحی نے بھی اس دور کی خواتین کی طرح افسانہ نگاری کا آغاز خواتین کے رسائل سے کیا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'شاہد وفا' کے نام سے شائع ہوا۔ موضوعات کے تنوع کے باوجود اصلاحی رجحان حاوی ہے۔ آصف جہاں کا پہلا افسانہ 'شش و پنج' ۱۹۱۵ میں شائع ہوا۔ جس میں عورت کی مظلومیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانوں کے علاوہ وہ مضامین بھی لکھتی رہیں۔ نذر سجاد حیدر کے مضامین دس سال کی عمر سے رسائل میں شائع ہونے لگے۔ ان کی کوشش تھی کے مشرقی اور مغربی دونوں تہذیبوں کی اچھی اقدار کو اپنایا جائے۔ ان کے افسانوں میں مسلم گھرانوں میں سماجی زندگی کی فرسودہ روایات کو ترک کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ خاتون اکرم کا پہلا افسانوی مجموعہ 'گلستان خانوں' کے نام سے شائع ہوا۔ انھوں نے سماجی رسم رواج کی برائیوں اور نئی تہذیب کے پھیلتے سایوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ حمیدہ سلطان کے افسانوں میں کردار نگاری کو بہت اہمیت حاصل ہے ان کا ایک طویل افسانہ 'مشرق و مغرب' رسالہ نسواں میں مسلسل چھپتا رہا۔ طاہرہ دیوی شیز رای کا تعلق بنگال سے تھا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سحر بنگال' کے عنوان سے ۱۹۳۵ میں شائع ہوا۔ ان کے افسانے نسوانی زندگی کے عکاس ہیں۔ سحاب قزلباش کا افسانوی مجموعہ 'بدلیاں' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ مسز عبدالقادر کے افسانوں میں پُر اسراریت کی فضا پائی جاتی ہے اور کرداروں میں ارواح کو بہت اہمیت حاصل ہے (۱۳)۔

دوسرے دور کی لکھاری خواتین کے انداز اور معیار وقت، حالات اور تعلیمی عروج کی بنا پر بدلے ہوئے ضرور ملتے ہیں لیکن یہ اسی تسلسل کا حصہ ہیں۔ان کی تخلیقات میں حقیقت پسندی کا بھرپور رجحان ملتا ہے ان خواتین لکھاریوں نے اپنے تجربے، ماحول اور گہرے مشاہدات ان کہانیوں میں رقم کیے اور فنی اعتبار سے بھی اس دور کی تخلیقات کو بلند مقام حاصل ہے۔ڈاکٹر رشید جہاں نے اقتصادی مسائل کو سب سے زیادہ اہمیت دی اور خواتین کی ذہنی پسماندگی ،شکست خوردگی اور بے بسی کو اپنے افسانوں میں اُجاگر کیا۔انھوں نے باغی دل و دماغ رکھنے والی عورت کا تصور پیش کیا(۱۴)۔صالحہ عابد حسین نے معاشرے کے مسائل پر افسانے لکھے ان کے افسانوی مجموعے 'نقشِ اول'، 'سازِ ہستی' کے عنوان سے اور ایک ناول 'عذرا' کے نام سے شائع ہوا۔ شکیلہ اختر بھی ترقی پسند نظریات کی حامی تھیں وہ کسان، مزارع اور زمیندار کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔صدیقہ بیگم سیوہاروی اشترا کی تحریک سے منسلک تھیں۔ان کے افسانوں میں تنگ و تاریک گلیوں ،محلوں اور قحط زدہ ویران علاقوں کی عکاسی کے ساتھ اعلیٰ طبقے کے ایوانوں کی سجاوٹ بھی ملتی ہے تسنیم سلیم چھتاری کے افسانوں کے موضوعات مسلم معاشرے کے متوسط اور اعلیٰ طبقے کی زندگی کے سماجی اور نفسیاتی مسائل ہیں۔رضیہ خاتون ظہیر نے مضامین لکھنے کی ابتدا رسائل سے کی اور پھر افسانہ نگاری کی طرف آ گئیں ان کے افسانوں میں سیاسی مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے(۱۵)۔ عصمت چغتائی اُردو افسانہ نگاری کا ایک اہم نام ہیں۔ان کے افسانے اپنے عہد کے عکاس ہیں انھوں نے اپنے افسانوں میں متنوع موضوعات کو فنی مہارت سے پیش کیا ہے۔عصمت چغتائی کے اسلوب ،فن اور تکنیک میں کیثر الجہتی پائی جاتی ہے(۱۶)۔ممتاز شیرین نہ صرف افسانہ نگار ہیں بلکہ ایک نقاد بھی اور تنقید ہی ان کی وجہ شہرت بھی ہے(۱۷)۔ہاجرہ مسرور کے افسانوں اور ناولوں میں نسوانی کردار زیادہ ہیں جن کو وہ سماجی ،جنسی اور معاشی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔خدیجہ مستور کے افسانوں میں تقسیم سے قبل فنی اعتبار سے دو واضح دور نظر آتے ہیں پہلا دور رومانی تصورات تک محدود ہے، دوسرے دور میں ترقی پسند تحریک کا رنگ حاوی ہے(۱۸)۔

ڈرامہ نگاری میں امیر جان ادا کا ڈرامہ ۱۹۰۸ میں آگرہ سے شائع ہوا۔ان کے علاوہ ڈاکٹر رشید جہاں، عصمت چغتائی، صالحہ عابد اور قدسیہ زیدی نے بھی ڈرامے لکھے(۱۹)۔اسی طرح بیسویں صدی کے ربع میں خواتین کے سفرنامے بھی منظرِ عام پر آئے۔۱۹۱۰ میں بیگم نواب سربلند جنگ کا سفرنامہ 'دنیا عورت کی نظر میں' شائع ہوا۔'سفرنامہ عراق' بیگم حسرت موہانی کی تصنیف ہے۔فاطمہ بیگم کا 'سفرِ حجاز'، محمودہ عثمان حیدر کا 'مشاہداتِ بلادِ اسلامیہ'، نواب سلطان جہان بیگم کا 'سیاست سلطانی' اور رفعیہ سلطان کا 'سیر یورپ' اہم ہیں(۲۰)۔ نثر اور نظم کی تقریباً سب ہی اصناف پر خواتین نے طبع آزمائی کی۔

عورتوں کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی جن کوششوں کا آغاز 'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' نے کیا تھا اور ان کوششوں کی بدولت عورتوں میں جو بیداری پیدا ہوئی اس نے اصلاحات کا حامی ایک گروہ پیدا کر دیا تھا جس نے برصغیر پاک و ہند کی مسلم خواتین میں ایک طبقے کے طور پر ایسا شعور بیدار کیا جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔قومی بیداری کی اس لہر نے اصلاحِ معاشرہ کے ساتھ ساتھ خواتین کی سماجی حیثیت میں بھی تبدیلی پیدا

کی ،جس کی وجہ سے مسلم خواتین نے تعلیمی و ادبی ترقی اور سماجی و سیاسی حقوق کی بحالی کے لیے جو تحریکیں چلائیں انھوں نے پورے معاشرے کو متاثر کیا اور اصلاحات کا راستہ کھول دیا۔

حوالہ جات:

۱۔ حنا جیلانی 'سماجی اور سیاسی تحریکیں اور خواتین' مشمولہ عورت زبانِ خلق سے زبان حال تک سنگِ میل پبلی کیشنز ،لاہور ۲۰۰۰ ص۔۲۷۱

۲۔ آغا حسین ہمدانی 'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صدارتی خطبات ۱۸۸۶۔۱۹۰۶ (حصہ اول) قومی ادرہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد ۱۹۸۶ ص۔۱۶۔۱۷

۳۔ شیخ عبداللہ 'خاتون' شمارہ ۲۔۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ علی گڑھ ص۔۶۸

۴۔ شیخ عبداللہ 'سالانہ رپوٹ آل انڈیا مسلم خواتین کانفرنس' مارچ ۱۹۱۴ ص۔۲۰۔۲۲

۵۔ محمد امین زبیری مولوی 'مسلم خواتین کی تعلیم' ادارہ تصنیف و تالیف (اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ) آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۵۶ ص۔۶۶

۶۔ عبدالسلام خورشید ڈاکٹر 'صحافت پاکستان و ہند میں' مجلسِ ترقی ادب ۲ کلب روڈ لاہور ۱۹۶۳ ص۔۱۹۰

۷۔ سلطانہ بخش ڈاکٹر 'پاکستانی اہل قلم خواتین' اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۰۳ ص۔۲۲

۸۔ ایضاً ص۔۲۳

۹۔ فاطمہ حسن 'گزشتہ صدی سے عہدِ حاضر تک اردو ادب میں نسائی شعور ایک مطالعہ' مشمولہ فیمنزم اور ہم وعدہ کتاب گھر شاہ فیصل کالونی کراچی ۲۰۰۵ ص۔۸۵

۱۰۔ ایضاً ص۔۸۷ ۱۱۔ ایضاً ص۔۸۸ ۱۲۔ ایضاً ص۔۱۰۱

۱۳۔ سلطانہ بخش ڈاکٹر 'پاکستانی اہل قلم خواتین' اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۰۳ ص۔۴۸۔۵۰

۱۴۔ شاہد نقوی 'ڈاکٹر رشید جہاں' 'مشمولہ فیمنزم اور ہم وعدہ کتاب گھر شاہ فیصل کالونی کراچی ۲۰۰۵ ص۔۱۰۸

۱۵۔ فاطمہ حسن 'گزشتہ صدی سے عہدِ حاضر تک اردو ادب میں نسائی شعور ایک مطالعہ' مشمولہ فیمنزم اور ہم وعدہ کتاب گھر شاہ فیصل کالونی کراچی ۲۰۰۵ ص۔۱۰۲

۱۶۔تنویر انجم 'عصمت چغتائی کا نسائی شعور' مشمولہ فیمنزم اور ہم وعدہ کتاب گھر شاہ فیصل کالونی کراچی ۲۰۰۵ ص ۱۱۷

۱۷۔آصف فرخی ڈاکٹر 'حکایتِ شیرین' مشمولہ فیمنزم اور ہم وعدہ کتاب گھر شاہ فیصل کالونی کراچی ۲۰۰۵ ص۔۱۳۵

۱۸۔ فاطمہ حسن 'گزشتہ صدی سے عہدِ حاضر تک اردو ادب میں نسائی شعور ایک مطالعہ' مشمولہ فیمنزم اور ہم وعدہ کتاب گھر شاہ فیصل کالونی کراچی ۲۰۰۵ ص۔۱۰۲

۱۹۔ سلطانہ بخش ڈاکٹر 'پاکستانی اہل قلم خواتین' اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۰۳ ص۔۷۰

۲۰۔ ایضاً ص۔۷۳

ناصر عباس نیّر (لاہور)

اقبال اور جدیدیت

ماڈرن ازم اقبال کی معاصر ادبی تحریک تھی۔ اس کا زمانہ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۳۰ء قرار دیا جاتا ہے۔ مگر اس کے براہ راست اثرات اقبال کی شاعری پر نظر نہیں آتے۔ کیا اقبال اس تحریک سے آگاہ نہیں تھے یا ان کی انتخابی نظر اس تحریک کو اپنے شعری مقاصد سے ہم آہنگ محسوس کرتی تھی؟ غالباً دوسری بات درست ہے اقبال مغربیت ادبیات سے پورے طور پر آگاہ تھے۔ انھوں نے ''بانگِ درا'' میں درجن بھر امریکی اور برطانوی شعرا جیسے لانگ فیلو، ایمرسن، ولیم کوپر، ٹینی سن، براؤننگ، سیموئیل راجرز اور دوسروں کی نظموں سے اخذ و ترجمہ کیا ہے۔ ورڈز ورتھ کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور ۱۹۱۰ء میں اپنی انگریزی بیاض میں لکھا تھا کہ ورڈز ورتھ نے انھیں الحاد سے بچایا۔ اسی طرح ملٹن کا بھی ذوق وشوق سے مطالعہ کیا۔ اپنے ایک مکتوب محررہ مارچ ۱۹۱۱ء میں یہ بات درج کی کہ ''ملٹن کی تقلید میں کچھ لکھنے کا ارادہ جدت سے ہے اور اب وہ وقت قریب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان دنوں وقت کا کوئی لحظہ خالی نہیں جاتا جس میں اس کی فکر نہ ہو۔'' شیکسپیئر کو انھوں نے منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے۔ گوئٹے سے بھی اقبال پر مغربی جدیدیت کے اثرات تھے؟ جواب نفی میں ہوگا۔ اس لیے کہ ان تمام شعرا کو ماڈرن کہہ سکتے ہیں کہ ان سب کا تعلق (زیادہ کا تعلق انیسویں صدی سے ہے) ماڈرنیٹی (ہمہ گیر جدیدیت) کے عہد سے ہے...... مگر ماڈرن اسٹ نہیں کہہ سکتے۔ ماڈرن اور ماڈرن اسٹ میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ٹینی سن اور ایلیٹ میں یا تھیکرے اور جیمز جوائس میں ہے۔ دراصل اقبال نے مغربی ادبیات سے اخذ و استفادے کا عمل اپنے ابتدائی دور میں شروع کیا اور ۱۹۱۰ء تک ان کا شعری مائنڈ سیٹ، متشکل ہو چکا تھا۔ اپنے ابتدائی دور میں اقبال کا مغربی ادبیات سے تعلق تقلیدی ہے، انھوں نے کئی مغربی نظموں کو پورے کا پورا اور کہیں مغربی نظموں کے کچھ مصرعوں کو ترجمہ کیا ہے جیسے ''کوپر'' کے اس مصرعے And, while the wings of fancy still are free
کو نظم ''مرزا غالب'' کا یہ مصرع بنا دیا ہے:

ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

مگر ۱۹۱۰ء کے بعد ان کی نظر انتخابی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے شعری مائنڈ سیٹ کی راہنمائی میں معاصر مغربی ادبیات اور تحریکوں سے راست شاعرانہ ربط ضبط نہیں رکھتے۔ یوں بھی جن دنوں ماڈرن ازم کی تحریک زور شور سے جاری تھی، اقبال مغربی تہذیب پر تنقید کا آغاز کر چکے تھے اور ماڈرن ازم مغربی تہذیب ہی کا مظہر ہے۔ چنانچہ جن

دنوں مغرب میں ''ویسٹ لینڈ'' اور ''یولی سس'' چھپتے ہیں انھی دنوں اقبال اردو میں نظم ''طلوعِ اسلام'' (۱۹۲۲ء) اور فارسی میں پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء) تخلیق کرتے ہیں۔ ان کا فرق ظاہر ہے۔ اقبال، ایلیٹ اور جوائس کے نہ صرف موضوعات، ہیئتیں اور اسالیب مختلف تھے بلکہ جمالیاتی مقاصد بھی مختلف تھے۔

یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ ایک ہی عصر میں ادبی سطح پر انسانی سروکار مختلف ہو سکتے ہیں؟ یہ سوال اس وقت زیادہ اہم، متعلق اور بامعنی ہو جاتا ہے جب ہم ادب کے آفاقی ہونے کو ایک کلیے کے طور پر لیتے ہیں، اصل یہ ہے کہ ہر ادبی تحریر، ادبی تحریک، ادبی نظریہ اور جمالیاتی نظام اور شعریات کسی نہ کسی تناظر اور صورت حال کی پابند ہوتی ہے۔ اس لیے کوئی تجربہ، تحریک، نظریہ یا شعریات آفاقی نہیں، وہ اپنی متعلقہ صورت حال اور تناظر میں ''آفاقی'' ہے۔ جہاں جہاں اور جب جب وہ صورت حال موجود ہوتی ہے اس کے تحت لکھا جانے والا ادب متعلق اور اسی مفہوم میں آفاقی ہوتا ہے۔ بنا بریں بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے مغربی ادب پارے اور اقبال کی شاعری اپنی اپنی صورتِ حال اور تناظر کے پابند ہیں۔ ادب جب صورتِ حال اور تناظر سے الگ ہوتا ہے تو وہ ایلی نیشن (Alienation) کا شکار ہوتا ہے۔

ہر چند اقبال نے ماڈرن ازم سے راست ربط ضبط نہیں رکھا مگر ماڈرن ازم کے بعض تصورات اور اقبال کی شاعری کے بعض موضوعات میں تقابل و تماثل دلچسپی سے خالی نہیں۔ ماڈرن ازم کی تجربہ پسندی، روایت شکنی، تاریخی و جمالیاتی عدم تسلسل اقبال کے یہاں اپنے مغربی سیاق کے ساتھ موجود نہیں۔ انھوں نے نئی ہیئتوں کی تلاش کے بجائے روایتی ہیئتوں کو ہی اپنے لیے موزوں سمجھا ہے۔ اس طرح روایت سے اپنا تعلق قائم رکھا ہے۔ جسے جدیدیت توڑنے میں افتخار اور لذت محسوس کرتی ہے۔ تاہم اسلوبی سطح پر اقبال نے تجربہ پسندی اور روایت شکنی کا مظاہرہ ایک خاص مفہوم میں بہر حال کیا ہے۔ اقبال نے اردو شاعری میں قطعی منفرد ڈکشن ہی متعارف نہیں کروایا بلکہ اسے بے مثال تخلیقی شان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کچھ اس طور کہ یہ نا قابلِ تقلید ہے۔ اتنی شدید اور فقید المثال انفرادیت شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے یہاں موجود ہو جس کا مظاہرہ اقبال نے کیا ہے۔ ماڈرن ازم میں بھی انفرادیت پر زور ملتا ہے۔ کیا اقبال کی انفرادیت کا وہی مفہوم ہے جو مغربی جدیدیت میں ہے؟ بالکل نہیں اقبال کی انفرادیت اس کی اپنی انفرادیت ہے۔ تاہم یہ مشرقی شعریات میں قابل فہم ہے۔

مشرقی شعریات میں انفرادیت کے مظاہرے کو جدت کا نام دیا گیا ہے۔ جدت کے فن میں حسن ادا، اپج، معنی آفرینی، مضمون آفرینی، نکتہ سنجی، نازک خیالی ایسی اصطلاحات کا بھی ذکر ہوا ہے۔ جدت ان سب کو محیط ہے۔ سب جدت کی فروغ ہیں، اس طور جدت کا تعلق معنی اور اسلوب ہر دو سے ہے۔ جدت بہ قول ڈاکٹر عنوان چشتی:

''مانوس اشیا کے مخفی امکانات کی دریافت کا عمل ہے...... جدت روایت کے بطن سے نمودار ہوتی ہے، مگر روایت پرستی سے انحراف آتی ہے۔'' گویا جدت انحراف ہے مگر جدیدیت کا انحراف نہیں، جدت کا انحراف بھی روایت کے حدود کے اندر ہوتا ہے۔ چنانچہ جس تخلیق کار کا روایت کا تصور وسیع گہرا، اور سرایت گیر ہوتا ہے اس کا انحراف اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ اقبال کی انفرادیت دراصل جدت ہے۔ جدت کا مظاہرہ ہر چند اور بھی کئی اردو شعرا نے کیا ہے مگر

روایت کا جتنا وسیع اور گہرا تصور اقبال کا تھا اتنا کسی دوسرے اردو شاعر کا مشکل سے ہوگا۔ اقبال کی انفرادیت نا قابلِ تقلید تو ہے مگر اپنی مشرقی روایت میں قابلِ فہم بہر حال ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال نے مشرقی ادبیات کی روایت کو کھوجا ہی نہیں تھا اسے مرتب بھی کیا۔ اقبال نے فارسی، عربی، اردو، سنسکرت، ادبیات کو ایک روایت ٹھہرایا اور اسے اپنی شاعری کی روح رواں بنایا۔ ان کے یہاں فارسی شعرا ملا عرشی، ابو طالب کلیم، فیضی، صائب، مرزا بیدل، عرفی، خاقانی، انوری، سنائی، حافظ، سعدی اور سب سے بڑھ کر فکر رومی کے اثرات بالواسطہ اور بطور تضمین ملتے ہیں۔ عربی ادبیات سے انھوں نے ہر چند کسی مخصوص شاعر کے اثرات نہیں لیے مگر عربی شعریات کے اصول سادہ بیانی اور صحرائیت پسندی ضرور قبول کیے۔ مولانا غلام رسول مہر نے جب طلوعِ اسلام پر تنقید کی تو اقبال نے جواب دیا کہ ''میں عربی شاعری کی روش پر بالکل صاف صاف اور سیدھی سیدھی باتیں کہہ رہا ہوں۔'' اسی طرح انھوں نے متعدد قرآنی آیات کو راست یا ان کے ترجمے کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ اقبال کا تصورِ روایت اگرچہ ایلیٹ کے تصورِ روایت سے مختلف ہے مگر دونوں میں یہ مماثلت موجود ہے کہ ایلیٹ نے تمام مغربی ادب ہومر سے بائرن تک کو ایک روایت قرار دیا۔ اقبال نے روایت کی تنقیدی تھیوری پیش نہیں کی، مگر ادبی روایت کو مسلسل جاری روایت کی صورت اپنی شاعری میں مرتب، دریافت اور پیش کیا ہے۔ اقبال کی روایت مشرقی اسلامی روایت ہے۔ عبدالمغنی کا یہ کہنا درست ہے کہ ''اقبال کی شاعری درحقیقت مشرقی ادبیات کی تمام شاعرانہ روایات کا نقطۂ عروج ہے۔''

اقبال کا تصورِ روایت، مابعد جدید تنقیدی اصطلاح میں بین المتونی (Intertextual) ہے۔ فارسی، عربی، اردو اور سنسکرت ادبیات مختلف متون ہیں جنھیں اقبال نے باہم ممزوج کیا ہے۔ اقبال نے مختلف مشرقی روایات کو ایک نئے متن میں منقلب کر دیا ہے۔ یعنی یہ روایات اقبال کے شعری متن کے میکانکی اجزا نہیں نامیاتی عناصر ہیں۔ اقبال کا شعری متن ایک زندہ متن ہے اور ایک زندہ وجود کی طرح ہی نہ صرف حسی تحریک کا حامل ہے بلکہ مخصوص زاویۂ نظر اور آئیڈیالوجی بھی رکھتا ہے۔ ماڈرن ازم کے ''نظامِ فکر'' میں فرد کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ یہ اہمیت تین چار سطحوں پر فرد کو تفویض ہوئی ہے۔ فرد بطور منفرد و تنہا وجود، فرد کا زندگی کو مستند اور براہ راست طریقے سے تجربہ کرنا اور اس تجربے کے نتیجے میں اپنی تقدیر یعنی بے چارگی، تنہائی اور لغویت سے آگاہ ہونا، فرد کا سماج، فطرت اور کائنات سے داخلی انقطاع کی صورت حال سے دوچار ہونا۔ جدید ادب کا فرد ایلی نیشن کا شکار ہے۔

ایلی نیشن کا تصور مارکسیت میں بھی ملتا ہے مگر جدیدیت اور مارکسیت کی ایلی نیشن ایک جیسی نہیں ہیں۔ مارکسی ایلی نیشن یہ ہے کہ فرد اپنی محنت کے وسائل اور ثمرات سے بوجوہ اجنبی ہو جاتا ہے۔ جبکہ جدید فرد کی ایلی نیشن ایک خاص فلسفیانہ تصور کی پیدا کردہ ہے...... دل چسپ بات یہ ہے کہ اقبال کے یہاں بھی فرد موجود ہے۔ یہاں اشارہ اقبال کے مردِ مومن کی طرف نہیں۔ مردِ مومن ایک آدرش ہے جس میں وہ تمام بہترین خصوصیات یکجا ہوگئی ہیں جنھیں اسلامی تاریخ میں پیش کیا گیا ہے۔ مردِ مومن ایک ''غیر شخصی'' تصور ہے۔ یہ بشری تقاضوں سے بلند اور اعلیٰ انسانی مقاصد کا علم بردار ہے۔ اقبال کی شاعری میں بالخصوص بالِ جبریل کی غزلوں میں ایک اور فرد ظاہر ہوا

ہے۔ یہ ایک شخصی وجود ہے۔ اس کا اپنا نقطۂ نظر اور اپنے سوالات ہیں۔ ہر چند اس کا لہجہ پر تمکین اور کہیں جلالی ہے۔ مگر یہ ایک حقیقی فرد ہے۔ اور اسی لیے تنہا بھی ہے۔ یہ چند اشعار اسی فرد کا اظہارِ ذات ہیں:

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدہ صفات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اس کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

تو ہے محیطِ بے کراں میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر
باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد!

مذکورہ اشعار میں ایک ایسا فرد آشکار ہے جو تنہا مگر ایک اور ہستی کے رُوبرو بھی ہے اور رُوبرو ہونے سے ہی فرد اپنے وجود کی منفرد معنویت دریافت اور تلاش کرتا ہے حقیقتاً اس فرد کو اپنی بے معنویت کا سامنا نہیں بلکہ اپنی معنویت کے از سرِ نو تعین کے سوال کا سامنا ہے۔ چنانچہ یہ اس بے چارگی اور لغویت کا شکار نہیں جو جدیدیت کے فرد کو اس کی تقدیر کی صورت درپیش ہے۔ حالانکہ اقبال کا فرد بھی زندگی کا مستند اور حقیقی تجربہ کر رہا ہے جسے جدیدیت کا فرد اپنے لیے لازم ٹھہراتا ہے۔ اقبال کے بعض ناقدین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اقبال کی شاعری میں جدید فرد کہیں موجود نہیں۔ اقبال نے فرد کا پُرعظمت تصور پیش کیا مگر جدید انسان جس ٹوٹ پھوٹ کا شکار، جس بے چارگی میں مبتلا اور جس تنہائی کے کرب سے دوچار ہے، اقبال نے اسے اپنی شاعری میں کہیں پیش نہیں کیا۔ ان ناقدین کے نزدیک اقبال نے حقیقی فرد کو نہیں فرد کے مثالی اور Glorified تصور کو پیش کیا ہے۔ ان نقادوں نے غالباً مردِ مومن کے تصور کو سامنے رکھا ہے اور اس فرد کی آواز نہیں سنی، جس کی زبانی چند اشعار اوپر درج کیے گئے ہیں۔ اصل یہ ہے

کہ اقبال کا فرد اپنے وجود کے باطنی سرچشمے سے منقطع نہیں ہوا، جب کہ جدید ادب کا فرد اپنے وجود کی معنویت کا یقین نئے سرے سے چاہتا ہے مگر معنویت کے گم ہو چکنے یا ''بے معنی'' ہونے کے بحران کا اسے سامنا نہیں ہے۔ نئے سرے سے معنویت کی طلب پر ماڈرنیٹی کی عقلیت پسندی کی پیدا کردہ تشکیک کا ہلکا سا سایہ موجود ہے مگر یہ طلب باطنی اور مابعدالطبیعیاتی سرچشمے پر سوالیہ نشان نہیں لگاتی۔ جدیدیت (ماڈرن ازم) میں یہ سوالیہ نشان جلی طور پر موجود ہے۔ لہٰذا جدیدیت اور اقبال کے فرد میں جو بنیادی فرق پیدا ہوا ہے وہ دونوں کے جداگانہ ''ورلڈ ویو'' کی وجہ سے ہے۔ جدیدیت کے فرد کا ''ورلڈ ویو'' روایت اور مابعدالطبیعیات کی نفی پر استوار ہے۔ مگر اقبال کے فرد کا 'ورلڈ ویو'' ان دونوں کے اثبات پر مبنی ہے۔ ایک کی محرومی دوسرے کی قوت ہے۔

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جدید فرد نے بیسویں صدی کے عظیم سانحات (عالمی جنگیں، اقتصادی بدحالی وغیرہ) کو جھیلا، اس لیے وہ بے بسی اور بے معنویت کے احساس میں مبتلا ہوا۔ کیا اقبال کے یہاں ان سانحات کی گونج موجود ہے؟ یہ الگ تفصیلی مطالعے کا متقاضی ہے۔ تاہم ایک بات واضح ہے کہ کسی سانحے کو جھیلنے میں فرد کا 'ورلڈ ویو'' (World View) اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایک مذہبی آدمی کسی المیے کا سامنا جس طور کرتا ہے، مذہب بیزار فرد اسی المیے کو کسی اور طریقے سے محسوس کرتا ہے۔

ماڈرن ازم کا تعلق اگر اقبال کی شاعری سے ہے تو ماڈرنیٹی اور ماڈرنائزیشن (تجدیدکاری) کا تعلق اقبال کی فکر سے ہے۔ واضح رہے کہ اقبال کی فکر بیک وقت ان کی نثر اور شاعری میں ظاہر ہوئی ہے۔ سلیم احمد نے اقبال کی شاعری کا امتیاز ہی فکر کو قرار دیا ہے اور اس فکر کو اقبال کی انفرادی فکر بھی قرار دیا ہے۔ سلیم احمد نے جذبے، تصور اور جبلت سے تو فکر کو ممیّز کیا ہے مگر فکر کی قسموں اور سطحوں میں فرق نہیں کیا اور نہ یہ بتایا کہ کہاں ان کی شاعری خالص فکر کو اور کہاں شاعرانہ فکر کو پیش کرتی ہے۔ مثلاً اقبال کے یہاں متعدد اشعار ایسے موجود ہیں جو خالص فکر کو پیش کرتے ہیں فقط دو شعر دیکھیے:

عشق اب پیرویِ عقل خداداد کرے
آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے
کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کرے
یا کہن روح کو تقلید سے آزاد کرے

ان اشعار کو اقبال کے فکری موقف کا ترجمان سمجھا جا سکتا ہے۔ اور یہی خالص فکر کی نشانی ہے۔ جب کہ اس قسم کے اشعار ان کی شاعرانہ فکر کے علم بردار ہیں:

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب! پھر وہی مشکل نہ بن جائے

مذکورہ بالا اشعار جو اقبال کے فکری موقف کے ترجمان کے طور پر پیش کیے گئے ہیں، ماڈرنیٹی سے متعلق اقبال کے تصور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ماڈرنیٹی کا اہم داعیہ عقلیت ہے اور اقبال نے بھی عشق کو عقل کی برتری تسلیم کرنے کی

تجویز دی ہے۔ اس شعر کو اقبال کے عشق و عقل کے تصورات کے تناظر میں بھی اگرچہ دیکھا جا سکتا ہے مگر اقبال نے ان اشعار کو ''ادبیات'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے اور ''ضربِ کلیم'' میں انھیں درج کیا ہے جو عہد جدید کے خلاف اقبال کے اعلانِ جنگ یعنی اقبال کے فکری موقف کی علم بردار ہے۔ عقل کی اہمیت کا دوسرا مطلب عقلی وسائل کی مدد سے مذہبی و معاشرتی تجدید ہے۔ اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ اقبال تجدید یا ماڈرنائزیشن یا تجدیدکاری کا تصور کیا تھا؟ اس تصور کا سرچشمہ Origin کیا تھا اور اس کے مضمرات و امکانات کیا تھے؟

یہاں اقبال کے تجدیدکاری کے تصور کی جملہ پیچیدگیوں میں جانا ممکن نہیں، اس تصور کے مرکزی نکتے کو بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ خود اقبال کی زبانی سنیے: خطبات (مذہبی فکر کی تشکیل نو) میں لکھا ہے:

"The only course open to us is to approach Modern knowledge with a respectful but independent attitude and to appreciate the teachings f Islam in the light of that knowledge even though we may be led to differ from those who have gone before us."

یعنی جدید مسلمانوں کے لیے واحد راستہ یہ ہے کہ وہ جدید علم سیکھیں اور اس کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی تحسین کریں۔ تحسین کا لفظ اقبال نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ انھیں یقین ہے کہ اسلام ماڈرن علوم کی تحقیقات کی نفی نہیں، تائید و توثیق کرتا ہے گویا اسلام جامد نہیں متحرک نظامِ حیات ہے۔ چنانچہ اقبال نے ماڈرنیٹی کا مفہوم و مدعا یہ لیا کہ نہ صرف جدید عقلی و سائنسی علوم کو پڑھا جائے بلکہ مذہبی صداقتوں سے ان کی تطبیق بھی کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں اقبال کی ماڈرنیٹی عقل و عقیدے، سائنس و مذہب کی تطبیق پر مبنی ہے۔ ماڈرنیٹی کے اسی ایجنڈے کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال نے واضح اور ثابت کیا کہ توسیعِ کائنات اور ارتقائے حیات کے تصورات اس قرآنی آیت میں (اشارتاً) موجود ہیں:

''تم کہہ دو کہ تم زمین میں چلو پھرو، پھر غور سے دیکھو کہ اللہ نے خلق کو شروع کیوں کر کیا۔ پھر وہی اللہ ان کی آخری اٹھان بھی اٹھالے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے۔'' (۲:۲۹)

اسی طرح اقبال کے خیال میں آغازِ حیات کے نئے نظریات ابن مسکویہ اور رومی کے یہاں موجود ہیں مثلاً رومی کے یہ اشعار:

آمدہ اول با قلیم جماد
در نباتی از جمادی او فتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد
وز جماتی یا دناورد از بزد
نایدش حال نباتی ، ہیچ یاد
باز از حیواں سوے انسانیش

می کشد گاں خالقے کہ دانیش

مزید برآں اقبال نے ایٹمی نظریے کا سراغ اشاعرہ کے یہاں لگایا ہے۔ اشاعرہ نے ہی، اقبال کے خیال میں، سب سے پہلے وقت کے مسئلے پر غور کیا اور کہا کہ وقت مفرد ''اب'' کا تسلسل ہے۔ اقبال کا قصۂ قدیم و جدید کو دلیل کم نظری قرار دینا اشاعرہ کے اسی تصور وقت سے ماخوذ ہے۔ اقبال نے فخر الدین رازی، ملا جلال الدین دوانی، عراقی اور ملا باقر کے جدید نظریات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اقبال کی ان کوششوں کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ ماڈرنیٹی اور اسلام میں کوئی مغائرت نہیں۔ ماڈرنیٹی اپنی جن علمی و سائنسی تحقیقات پر تفاخر کرتی ہے وہ اسلام اور اسلامی تاریخ کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ استقرائی طرز فکر جدید مغربی تہذیب کی بنیاد ہے اور اقبال اس فکر کو اسلام کا اختصاص قرار دیتے ہیں اور اسی لیے وہ مغربی تہذیب کو ایک مخصوص تناظر میں اسلامی تہذیب کی توسیع بھی کہتے ہیں۔ اقبال کے اس دعویٰ کی علمی و تاریخی بنیاد کا سوال ایک طرف، اس دعویٰ نے یہ تاثر ضرور مٹا دیا کہ جدیدیت کا دوسرا نام ''مغربیانا'' (ویسٹرنائزیشن) ہے۔ اقبال کی یہ عطا کچھ کم نہیں کہ انھوں نے جدیدیت کو مغربیت سے آزاد کیا جو سرسیّد سے نہیں ہو سکا تھا۔

اقبال کے تصورِ جدیدیت کا سرچشمہ ایک طرف سرسیّد کا اصولِ تطبیق ہے (سرسیّد نے کہا تھا کہ ہمارے پاس اب ایک ہی راستہ ہے کہ یا تو حکمتِ جدیدہ کا بطلان کر دیا جائے یا اس سے ہم آہنگ ہوا جائے۔ سرسیّد نے ہم آہنگ ہونے کو ترجیح دی) اور دوسری طرف اقبال کے عہد کا سماجی اور علمیاتی تناظر ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد کا یہ کہنا وزن رکھتا ہے کہ اقبال کی فکر کو ان کے عہد کے تناظر میں دیکھا جائے کہ اقبال نے ماڈرنیٹی کے ضمن میں جو موقف اختیار کیا وہ اسی تناظر میں انھیں سوجھا اور اسی تناظر میں وہ موزوں اور vaild بھی ہے۔ حقیقتاً ماڈرنیٹی اور ماڈرنائزیشن تمام غیر مغربی اقوام اور بالخصوص اسلامی ممالک کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کا مستقل اور ہر سطح پر قابل قبول حل اب تک پیش نہیں ہو سکا۔ اور مختلف ممالک میں جو حل تجویز کیے گئے ہیں وہ ان ممالک کے سماجی تاریخی تناظر کے زائیدہ ہیں۔ نیز ایک ہی ملک میں مختلف اوقات میں مختلف حل سامنے آئے ہیں۔ مثلاً ترکی اور مصر میں ابتدا میں ماڈرنائزیشن سے مراد مغرب کی عسکری ٹیکنیک کا حصول تھا۔ اور ہندوستان میں ابتداً ماڈرنائزیشن کا مطلب جدید مغربی انگریزی تعلیم سے بہرہ مند ہونا تھا۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ محکوم ممالک میں ماڈرنائزیشن بڑی حد تک ویسٹرنائزیشن کے مترادف سمجھی گئی ہے۔ اس لیے کہ مغرب نے غیر مغربی اقوام کو اپنی تہذیب کے جس پہلو سے زیادہ متاثر یا مغلوب کیا وہی پہلو محکوموں کا آدرش بنا۔ غالباً اسی لیے اقبال نے کہا تھا:

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غلام اقوام نے ماڈرنیٹی کا بالعموم سطحی تصور قائم کیا ہے۔ انھوں نے ماڈرنیٹی کو اس کے ہمہ گیر تناظر میں نہیں دیکھا، اس پراسس کو سمجھنے کی سعی نہیں کی، جس نے ماڈرنیٹی کو ممکن بنایا۔ ٹیکنالوجی یا علوم تو ماڈرنیٹی کے آئس برگ کا وہ معمولی سا حصہ ہیں جو سمندری پانی سے باہر ہوتا ہے۔ ماڈرنیٹی کے پورے پراسس کو نہ

سمجھنے کی وجہ سے ہی بیشتر مسلم ممالک میں ماڈرنیٹی ممکن نہیں ہوئی۔ اقبال کو اس امر کا شدت سے احساس تھا انھوں نے سیّد سلمان ندوی کے نام خط میں لکھا کہ ''مسلمان ذہنی انقلاب کے اسی مرحلے میں داخل ہونے والے ہیں جس سے یورپ لوتھر کے زمانے میں گزرا تھا'' (مگر کیا واقع ؟) اقبال اس نوع کا ذہنی انقلاب لانے کی غرض سے ہی اسلامی فقہ کی تدوین نو کرنا چاہتے تھے، صوفی تبسم اور غلام السیدین کے نام مکاتیب میں اقبال نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے۔ **اب ایک نظر اقبال کے ''تصور جدیدت'' کے حدود اور امکانات پر!** اقبال عقلیت اور جمہوریت کے مخصوص تصور کے قائل تھے۔ آمریت شہنشاہیت اور ملائیت کے خلاف تھے اس ضمن میں ان کے یہاں درجنوں فارسی اور اردو اشعار موجود ہیں۔ اسی طرح ذہنی جمود کے نکتہ چیں اور متحرک نظام فکر میں یقین رکھتے تھے مگر مظہر الدین صدیقی کے بہ قول اقبال نے ماڈرنائزیشن کے مسئلے کا تجریدی اور فلسفیانہ حل تو بخوبی دریافت کیا، مگر:

> "He does not seem to have realised the importance of the socio-economic structure in moulding mess's minds, lives and personality.

ہر چند اقبال کی شاعری میں معاشی سماجی عوامل کا ذکر لکھا ہے تاہم ایک تھیوری کے طور پر اقبال نے اسے پیش بہر حال نہیں کیا۔ اس لیے کہ اقبال کا مطمح نظر مذہب و سائنس کی تطبیق تھا۔ اصولی طور پر جب وہ چیزوں کو اکٹھا کیا جاتا ہے تو ایک لازماً برتر اور دوسرے کو ثانوی اور اس پر منحصر قرار دیا جاتا ہے۔ اقبال نے مذہب، سائنس یا عقل و وجدان کے ضمن میں جو درجہ بندی کی، اس میں اوّلیت مذہب اور وجدان کو دی اور عقل اور سائنس کو مذہب کی تعبیر نو کا وسیلہ بنایا۔ دوسرے لفظوں میں عقل اور سائنس کو ان کی آزاد حیثیت میں قبول کرنے کی بجائے انھیں مذہبی صداقتوں کے تابع رکھا۔ انھیں مقصد نہیں وسیلہ قرار دیا۔ جس کا صاف مطلب ہے کہ انھوں نے آزادانہ سائنسی تحقیقات کے حق میں آواز بلند کرنے کے برعکس ''ہو چکی سائنسی تحقیقات'' سے (ایک خاص مقصد کے تحت) استفادے پر زور دیا۔ ہر چند بعض مقامات پر اقبال نے عقل کی برتری کا دعویٰ کیا ہے مگر بالعموم عشق کے مخصوص و محدود تصور کے مقابلے میں ایسا کیا ہے۔ سائنس کی برتری کو تسلیم کرنا شاید اقبال کے لیے ممکن نہ تھا کہ سائنس نے جس ماڈرنیٹی سے جنم لیا ہے، وہ اپنی اصل میں ''بشر مرکزیت'' ہے۔ اقبال عالم گردوں کو بشریت کی زد میں ٹھہرانے کے باوجود بشر کو مرکز فلسفے کو قبول نہیں کر سکتے تھے کہ اسے قبول کرنے کا مطلب ماڈرنیٹی کو پورے کا پورا قبول کرنا تھا۔ صاف لفظوں میں یہ کہ علم کا سرچشمہ وحی کے بجائے انسانی عقل تسلیم کرنا تھا۔ اقبال ماڈرنیٹی کو تنقیدی اور انتخابی طور سے قبول کرنے کے حق میں تھے۔ اقبال ماڈرنیٹی کے نکتہ چیں بھی تھے اور مداح بھی۔ اقبال دراصل اپنی اسلامی ثقافتی نہاد کو قائم و برقرار رکھتے ہوئے مغربی جدیدیت سے اخذ و استفادے کے قائل نظر آتے ہیں۔ ایک خاص مفہوم میں یہ ایک جدید اور ترقی پسندانہ نقطہ نظر تھا۔

ڈاکٹر شہناز نبی (کلکتہ)

مغربی بنگال میں اردو صحافت

بنگال میں اردو صحافت کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ زمانہ انگریزوں کا تھا اور اردو رابطے کی زبان ہونے کی وجہ سے دلوں کو جوڑنے اور ذہنوں کو سمجھنے کا کام کر رہی تھی۔ انگریزوں نے ۱۸۰۰ء میں کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی۔ ان کا مقصد اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ وہ فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ ہندوستان میں نو وارد انگریز افسران کو اردو اور دوسری دیسی زبانوں کی تعلیم دے کر اس قابل بنانا چاہتے تھے کہ وہ اپنے زیر دستوں کے ساتھ معمولی بات چیت کر لے سکیں۔ 'مغل اور اردو' کے مصنف نصیر حسین خیالؔ کے وہ جملے جو انگریزوں کی مصلحت کوشی کے بارے میں لکھے گئے تھے، آج بھی زبان زد عام ہیں۔ لکھتے ہیں:

گلکرسٹ، لوکٹ، اور ٹیلر (ممبرانِ سوسائٹی) کی اردو کے ساتھ وابستگی پر ہم اظہارِ خوشی کر سکتے ہیں مگر اس کے ماننے پر تیار نہیں کہ ان کی وہ سوسائٹی جو فورٹ ولیم کالج کے شاندار نام سے پکاری گئی، ہندوستانیوں کے لئے مفید اور اردو کے حق میں ایک کارِ نمایاں تھی۔ اس انجمن کا پہلا کام، عربی و فارسی اور سنسکرت و بھاشا سے صرف ان کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا جن کی طرف اس وقت ہندیوں کو رغبت تھی۔ ایسے ترجموں کے کھیل تماشوں میں لگا کر ان قدیم ایشیائی زبانوں سے ہم کو چھڑانا اور ان کی ضرورت کو کم کرنا تھا۔ پھر یہ کوشش کمپنی کے اہل کاروں کی ایک خدمت تھی کہ وہ ان ترجموں کو پڑھ کر اس ملکی زبان (اردو) سے اتنے آشنا ہو جائیں کہ اپنے ہندوستانی نوکروں یا زیر دستوں سے معمولی بات چیت کر لے سکیں اور بھوکوں نہ مریں۔ یہ سوسائٹی واقعی اگر اردو کو بڑھانا چاہتی تو ہارون و مامون کی طرح اس زبان میں علوم وفنون کے ذخیرے بھی لے آتی اور اردو کو مال دار کر دیتی۔

(بحوالہ مغل اور اردو۔ نصیر حسین خیال)

اس میں شک نہیں کہ اردو کی ترویج واشاعت میں انگریزوں کا اخلاص کم اور ان کی مصلحت انگیزی زیادہ کام کر رہی تھی تاہم اس بات سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ انہی ترجموں کی وجہ سے اردو نثر میں نمایاں اور حیرت انگیز اضافے ہوئے اور جدید اردو نثر کی راہیں ہموار ہوئیں۔

انیسویں صدی میں ہی میدانِ صحافت میں بھی اردو کا بول بالا ہوا اور بنگال سے ہی پہلی بار ہری ہر

دت نے اردو زبان کا پہلا اخبار 'جامِ جہاں نما' ۲۷/مارچ ۱۸۲۲ء کو نکالا۔ اس کے بعد راجہ رام موہن رائے نے فارسی کا پہلا اخبار 'مراۃ الاخبار' ۲/اپریل ۱۸۲۲ء کو جاری کیا۔ اس طرح بنگال میں صحافت کی وہ روایت جو ہکیؔ کی گزٹ سے شروع ہوئی تھی بنگلہ، اردو، فارسی ہندی، گجراتی، مرہٹی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے ذریعہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔

محققین بتاتے ہیں کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے جیمس آگسٹس ہکیؔ کے بلوں کی ادائیگی روک دی تو ہکیؔ نے ناراض ہو کر ایک اخبار جاری کیا تا کہ وہ کمپنی کے عہدے داروں کے خلاف اپنے غصے کا اظہار اور اپنے احتجاج کی آواز بلند کر سکے۔ اسے صحافت سے دلچسپی تھی اور نہ ہی اس کا کوئی تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے اخبار کے پہلے صفحے پر اس کی وضاحت کر دی تھی کہ 'یہ ہفتہ وار تجارتی وسیاسی اخبار ہے جس کے صفحات ہر پارٹی کے لئے کھلے ہیں لیکن اخبار کا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے'۔ (بحوالہ تاریخ صحافتِ اردو جلد اول، از امداد صابریؔ، دہلی ۱۹۵۲ء)

ہکیؔ نے اپنا اخبار ۲۹/جنوری ۱۷۸۰ء کو کلکتہ سے انگریزی زبان میں جاری کیا تھا۔ یہ ہفت روزہ اخبار 'ہکیز گزٹ' کے علاوہ 'کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر' کے نام سے بھی جانا تھا۔ اسطرح ہندوستان میں صحافت کی ابتدا انگریزی زبان سے ہوئی۔ (بحوالہ پیش لفظ، اردو صحافت، مرتبہ انور علی دہلوی، لاہور ۱۹۹۱ء)۔

ہکیؔ کے گزٹ میں کمپنی کے ملازمین کے ذاتی معاملات اور نجی زندگی کا بیان تک ملتا ہے۔ اس بنیاد پر اسے زرد صحافت کی مثال بھی مانتے ہیں۔ تاہم چٹپٹی اور سنسنی پھیلانے والی خبروں کے علاوہ اس میں سنجیدہ خبریں، اشتہارات اور شاعری کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔ شاعری کا گوشہ الگ ہوا کرتا تھا جس میں شاعروں کا نادر کلام اور کمپنی کے کارناموں کو سراہنے کے لئے تہنیتی نظمیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ہکیؔ نے کمپنی کی بدانتظامی کا بھی پردہ فاش کیا اور گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کی تنقید کرنے سے باز نہ آیا۔ اس نے اہم اور سر برآوردہ لوگوں کو بھی نہیں بخشا اور پادری کیرینڈؔر پر الزام لگایا کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں گرجا کی زمین فروخت کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ وہ کبھی کبھی بدعنوانیوں پر سے پردہ اٹھانے کے لئے ڈرامے کا سہارا لیتا تھا اور ایسے کرداروں کی تشکیل کرتا تھا کہ نام نہ ہونے کے باوجود لوگ انہیں پہچان جاتے تھے جو اس طرح کی غلط کاریوں میں مبتلا تھے۔ غرض صحافت کا باقاعدہ تجربہ نہ ہونے کے باوجود ہکیؔ نے ایک پختہ مدیر کی طرح اخبار کی ادارت کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ اس زمانے میں اس کے اخبار کی اشاعت دوسو کے لگ بھگ تھی۔

(بحوالہ اردو کے اخبار نویس، جلد اول، از۔ امداد صابریؔ، صابری اکیڈمی، دہلی ۱۹۷۳ء)

ڈاکٹر طاہر مسعودؔ لکھتے ہیں کہ

'ہکیز گزٹ' کے اجراء کے ساتھ ہی ہندوستان میں صحافت کی نشو نما تیزی سے ہونے لگی۔ اس اخبار کی تقلید میں دس ماہ بعد نومبر ۱۷۸۰ء میں انڈیا گزٹ جاری ہوا اور پھر یکے بعد دیگرے اخبارات منظرِ عام پر آنے لگے۔ (اردو صحافت انیسویں صدی میں، صفحہ۔ ۵۸)

انڈیا گزٹ پیٹر ریڈؔ اور بی۔ میسنکؔ کی ادارت میں جاری ہوا تھا۔ محمد عتیق صدیقیؔ 'گلکرسٹ اور اس کا عہد'

میں لکھتے ہیں کہ اس اخبار کے نکالنے کا مقصد ہکّی کو نقصان پہنچانا تھا۔ بعض محقق کہتے ہیں کہ انڈیا گزٹ کی اشاعت کے پیچھے ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہاتھ تھا۔ کچھ لوگ اسے ان کی سازش بتاتے ہیں جو ہکّی گزٹ میں اپنی کردار کشی سے برافروختہ تھے۔ معاملہ کچھ بھی ہو، اس میں شک نہیں کہ ہکی گزٹ کے مقابلے پر کوئی آ گیا تھا اور چند سالوں کے اندر کمپنی سے اپنی وفاداری جتاتے ہوئے اس کی خاص مراعات کا حقدار بن بیٹھا تھا یعنی انڈیا گزٹ کا محصول معاف ہو گیا اور اسے سرکاری اشتہارات سے سرفراز کیا گیا۔

(جامِ جہاں نما۔ بحوالہ اردو صحافت کی ابتدا، گربچن چندن، مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ ۱۹۹۲ء)۔

جب تک ہکی گزٹ سے انڈیا گزٹ کا مقابلہ رہا تب تک اس کی دھار برقرار تھی لیکن جب جب ہکی کا گزٹ بند ہو گیا تو انڈیا گزٹ نے اپنا الگ راستہ اختیار کیا۔ اس نے ہکّی کی طرح کمپنی پر حملے کرنے اور شرفا کی پگڑیاں اچھالنے کے بجائے کمپنی کی اطاعت گذاری شروع کر دی اور کمپنی کو احساس ہوا کہ اس طرح کے دو چار اخبار اور نکل آئیں تو کمپنی کی ساکھ نہ صرف بحال ہو جائے گی بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ سیاسی و تجارتی فائدے حاصل ہونے لگیں گے۔ اس خیال سے کمپنی نے اپنی سرپرستی میں ۴؍مارچ ۱۷۸۴ء کو 'کلکتہ گزٹ' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس کے مدیر مقرر ہوئے فرانسس گلیڈون۔ اس اخبار میں خبروں کے علاوہ شعر و شاعری اور مراسلے بھی چھپتے تھے نیز سپریم کورٹ کی کاروائیاں اور فیصلے، سماجی سرگرمیوں کی تفصیل، برطانوی اخبارات کے اقتباسات وغیرہ بھی شامل کئے جاتے تھے۔ محصول ڈاک معاف تھا۔ سرکاری محکموں کو اخبارات کے لئے اشتہارات فراہم کرنے کی خصوصی ہدایت دی گئی تھی۔

ان ساری تفصیلات کو دھیان میں رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ اردو صحافت پر بات کرتے ہوئے ہم ان روایات کو فراموش نہیں کر سکتے جو انگریزی اخبارات کی قائم کردہ تھیں۔ مثلاً آج بھی اشتہارات کے بغیر اخبار کی اشاعت تقریباً ناممکن ہے۔ سرکاری اطلاعات اخبار کی خاص زینت ہیں۔ مراسلے سے عوام کے رجحان، اخبار سے ان کی دلچسپی، اور مختلف امور سے ان کی واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سیاسی، سماجی، ادبی، اور ثقافتی سرگرمیوں کی تفصیل اس مخصوص خطے کے ماحول سے ہمیں آگاہ کرتی ہے۔ سنسر شپ بھی انگریزی دورِ حکومت کی دین ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مخالف صرف ہندوستانی یا دیسی مدیر ہی نہیں تھے۔ ان میں وہ انگریز بھی شامل تھے جنہیں کمپنی کی پالیسیوں پر اعتراض تھا۔ اور اپنے اعتراض کو ظاہر کرنے نیز کمپنی تک اپنی بات پہنچانے کا بہترین ذریعہ ان کے نزدیک اخبار ہی تھا۔ لیکن کمپنی ہندوستان میں پاؤں جمانا چاہتی تھی۔ اسے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ریشہ دوانیوں پر قابو پانا اور سرکش قوتوں کو زیر کرنا تھا۔ ایسے میں اخبارات نے زہر اگلنا شروع کیا تو کمپنی کو مزید خطرہ محسوس ہوا۔ کمپنی نے سنسر شپ عائد کر کے بمبئی اور مدراس میں سنسر شپ لگا دیا اور جن انگریز مدیروں سے مخاصمت تھی انہیں ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ڈاکٹر طاہر مسعود مقالاتِ گارساں دتاسی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

دی ورلڈ کے ایڈیٹر ولیم ڈواں، انڈین ہیرالڈ کے ایڈیٹر ایس ہیم فرے، اور بنگال ہرکارہ کے ایڈیٹر ڈاکٹر میکلین کو

کمپنی کی فوج اور سرکاری محکموں کے خلاف توہین آمیز مواد شائع کرنے پر جبراً یوروپ روانہ کر دیا گیا۔

ہکیز گزٹ کی اشاعت کے مقاصد اور بعد میں آنے والے مدیروں کے رویے کو سامنے رکھیں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں اخبار نویسی کی ابتدا احتجاج کی لے کو تیز تر کرنے کے لئے ہوئی۔ مدیروں کا رویہ کبھی حق گوئی کی طرف مائل رہا اور کبھی مالی منفعت کی غرض سے مصلحت کوشی کا رہا۔ اخبار کے ذریعہ ذاتی بغض و عناد بھی نکالا گیا اور اسے شہرت پانے کا طریقہ بھی سمجھا گیا۔ اخبار کے ذریعہ رائے عامہ ہموار کرنے کی کوششیں ہوئیں تو اس سے سیاسی و تجارتی مقاصد بھی پورے ہوتے نظر آئے۔ جہاں تک اردو کے پہلے اخبار جامِ جہاں نما کی بات ہے تو ایک عرصے تک اس کی اولیت کا مسئلہ ہی نزاع کا باعث بنا رہا۔ اخبار دستیاب نہ ہونے کی صورت میں اس بات کا تصفیہ کرنا بھی مشکل تھا کہ اس اخبار کی پالیسی کیا تھی یا اس کا معیار کیا تھا یا اس میں کس طرح کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ جامِ جہاں نما کی اولیت اس وقت ثابت ہوئی جب اسکے اجرا کی رپورٹ ڈاکٹر جان برائس کے اخبار 'جان بل' کے حوالے سے جیمس سلک بکنگھم کے اخبار کلکتہ جرنل اور پھر کلکتہ منتھلی میں منتقل ہوئی۔ جامِ جہاں نما کے مالک ہری ہر دت اور مدیر سدا سکھ لال تھے۔ چونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب فارسی زبان کا ستارہ عروج پر تھا اور امراء و شرفاء کی زبان فارسی ہی ہوا کرتی تھی، اس لئے اہلِ ثروت کی محفلوں میں جامِ جہاں نما کی جیسی پذیرائی ہونی چاہئے تھی ویسی نہیں ہوئی۔ پانچ شماروں کے بعد ۸؍مئی ۱۸۲۲ء کے شمارے میں اس کی زبان میں تبدیلی لانے کی اطلاع دی گئی۔ پہلے فارسی کا صرف ایک کالم شروع کیا گیا اور اس کے بعد اس کی پوری زبان بدل دی گئی اور پورا اخبار فارسی میں نکلنے لگا۔ ایک سال بعد اخبار کے مالک نے غالباً اپنی اردو دوستی کے پیشِ نظر اس اعلان کے ساتھ کہ فارسی اخبار کے ساتھ صرف چار آنے میں اردو کا ایک ورق دستیاب ہوگا، اردو زبان میں ایک ضمیمہ شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس اردو ضمیمے کو فارسی اخبار کے ساتھ خریدنے کی پابندی نہیں تھی بلکہ اگر کوئی چاہے تو اسے الگ سے بھی خرید سکتا تھا۔ اردو اخبار، فارسی جامِ جہاں نما کا ترجمہ نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ اس کے مشمولات الگ ہوا کرتے تھے۔

جان بل کے مطابق جامِ جہاں نما کے پہلے شمارے میں کابل اور کماؤ کی خبریں، مسٹر بیرنگٹن کی تقرری کی اطلاع، کسٹم ہاؤس کی خبریں اور سپریم کورٹ کی کاروائی کی خبریں وغیرہ شامل تھیں۔ (بحوالہ تاریخ، صحافتِ اردو۔ امداد صابری)۔ اس اخبار کے لئے، جو ایک ہفتہ وار تھا، زیادہ تر خبریں کلکتہ جرنل نامی انگریزی اخبار سے لی جاتی تھیں۔ اخبار کو انگریزی سرکار کا مالی تعاون حاصل تھا۔ اس کے باوجود اخبار کے مالک کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ اخبار کے بند ہونے کی نوبت آ رہی ہے۔ شاید اس کی وجہ پڑھے لکھے طبقے کی بے حسی رہی ہو۔

جامِ جہاں نما سے ہندوستان میں اردو صحافت کے باضابطہ آغاز کے بعد صرف بنگال ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اخبارات جاری ہوئے اور انگریزی کے علاوہ دیسی زبانیں بھی اس راہ پر گامزن ہو گئیں۔ اردو میں جامِ جہاں نما جیسے ہفت روزہ کے بعد اردو کا پہلا روزنامہ 'اردو گائڈ' شائع ہونے لگا۔ بعد ازاں اسی شہر کلکتہ سے اردو کا پہلا مکمل نثری ماہنامہ 'نورِ بصیرت' منظرِ عام پر آیا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے بنگال کی صحافت کے دو دور مقرر کئے ہیں۔ پہلا انقلابی اور دوسرا بحرانی۔ ان کے

نزدیک انقلابی دور کی ابتدا ۱۹۱۲ء سے ہوتی ہے جب کہ مولانا ابوالکلام آزاؔد نے الہلال جاری کیا۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۸ء کو وہ بحرانی دور مانتے ہیں جب ایک طرف دوسری جنگِ عظیم، کلکتے پر جاپانی بم باری، قحط، بنگال، کلکتے کے ہندو مسلم فسادات، تقسیمِ ملک اور دوسرے واقعات نے زندگی کے ہر شعبے کو بڑی شدت سے متاثر کر رکھا تھا۔ جنگ کی وجہ سے کاغذ کا ملنا محال تھا اور بم باری کے خوف سے بنگالی حضرات کلکتہ چھوڑ کر دیہات کا رخ کر رہے تھے۔ بہار اور یو۔پی کے اردو داں حضرات بھی کلکتہ چھوڑ کر اپنے اپنے گھر لوٹ رہے تھے۔ کلکتے میں کاتبوں کی قلت ہو گئی تھی۔ تقسیمِ وطن کے بعد اردو والوں کی ایک بڑی آبادی مشرقی پاکستان چلی گئی اور صورتِ حال بد سے بدتر ہوگئی۔ جہاں تک بنگال کی صحافت میں انقلابی لہجے کی تلاش کا سوال ہے، ہمیں یہ کہنے میں باک نہ ہونا چاہئے کہ اسکی ابتدا خود اخبار نویسی کی ابتدا سے جڑی ہے اور ہکی گزٹ سے اس کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ہکی اور دوسرے انگریز مدیروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی پر کڑی تنقیدی نگاہ رکھی تھی اور وہ حکومت کی بدعنوانیوں کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایسے مدیروں سے اس حد تک خطرہ محسوس کیا کہ انہیں شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ پہلے بھی اس ضمن میں لکھا جا چکا ہے کہ ایسے بیباک مدیروں کو جبراً یوروپ روانہ کر دیا جاتا تھا۔ خود ہکی کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا۔ پہلے اس کے اخبار پر ہندوستان سے باہر جانے پر پابندی لگائی گئی۔ پھر چیف جسٹس اور گورنر جنرل کی ہدایت پر ہکی کی گرفتاری کے لئے اس کے پریس پر چار سو پولیس کے مسلح فوج کے ساتھ چھاپہ مارا گیا۔ بعد ازاں اسے گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ ضمانت کی رقم ادا نہ کرنے کی صورت میں قید کی سزا سنائی گئی۔ اس کے بعد چھاپہ خانہ بحقِ سرکار ضبط کر لیا گیا۔ بالآخر شدت کی مفلسی جھیلتے ہوئے ۱۸۰۲ء میں کلکتے میں ہی اس نے آخری سانسیں لیں۔ انگریزی مدیروں کی سرکشی کو ہم کچھ حد تک ذاتی عناد کا نام دے سکتے ہیں لیکن اس میں دو رائے نہیں کہ حکومت ایسے اخبارات کی تنقیدی نگاہ سے خوف کھاتی تھی اور مدیروں کو خاموش کرنے کے لئے یا تو انہیں شہر بدر کر دیتی تھی یا در بدر۔ انہیں اتنا توڑ دیا جاتا تھا کہ وہ بغاوت اور سرکشی کا خیال ہی چھوڑ دیتے تھے۔ شاید ان سے عبرت حاصل کرتے ہوئے ہی بعد کے اخبارات نے دورخی پالیسی اپنانے میں عافیت سمجھی اور توازن بنائے رکھنا ضروری تصور کیا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ محدود پیمانے پر ہی سہی، بنگال میں احتجاج کی لے صحافت کے ابتدائی دنوں سے ہی سنائی دینے لگی تھی۔ اس کے بعد جب اردو صحافت کا دور دورہ ہوا تو ان میں بھی باغیانہ سر سنائی دینے لگے تھے۔ جامِ جہاں نما کا فارسی حصہ سرکاری و تجارتی ضرورتوں کے تحت فارسی میں چھپتا تھا اور اس میں سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل کچھ کم ہوا کرتی تھی تاہم اس کا اردو میں چھپنے والا حصہ الگ ہی تیور رکھتا تھا۔

اردو گائڈ اور دارالسلطنت نے بھی اپنا سر اونچا رکھا۔ ’احرار‘ اور ’استقلال‘ نے انگریزی سرکار کی زیادتیاں سہنے کے باوجود اپنا باغیانہ رویہ برقرار رکھا۔ الہلال اور انوار الاخبار نے بھی سر نہ جھکایا۔ ان اخبارات کو حکومت کی طرف سے بار بار وارننگ ملتی تھی لیکن ان کے لہجے کی کاٹ میں کمی نہیں آتی تھی۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے احرار کا ایک اقتباس ’بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ‘ میں نقل کیا ہے۔ اسے مختصراً یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اس اقتباس سے ’احرار‘ کے مدیر محمد اسد اللہ اسؔد کے جوشیلے لہجے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

’ایک طرف گورنرِ بنگال ہیں جو جدید سامانِ جنگ سے مسلح ہیں۔ توپ، بندوق، سنگین، ہوائی جہاز، گولے بارود، مضبوط قلعہ، جرار فوج، خوش نما محل، غرض سبھی کچھ ہے۔ وہ پبلک سے کہتے ہیں آؤ تم بھی صفیں باندھ کر ہماری طرف کھڑے ہو جاؤ اور ہماری مدد کرو۔ کس چیز میں۔؟ آزاد قوموں کو غلام بنانے میں۔ اماکنِ مقدمہ کی بے حرمتی میں۔ بزرگوں کی جلا وطنی میں۔ خلیفۂ اسلام کی محصوری میں، معصوموں کی یتیمی میں، باعصمت دیویوں کی عصمت دری میں، بے گناہ ہندوستانیوں کی خونریزی میں، خدامِ ملک و ملت کی گرفتاری میں، تحریکِ خلافت و سوراج کی پامالی میں، خلافت و کانگریس کی ڈاکہ زنی میں، تا کہ دنیا امن میں رہیاور جدید تمدن و تہذیب سے دنیا متمتع ہو سکے؟ (اداریہ۔ ۲۶/جنوری ۱۹۲۱ء)

اسؔد کا غم و غصے میں ڈوبا یہ لہجہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ اردو صحافت لوگوں کے دلوں میں آزادی اور قومیت کے کیسے جوت جگا رہی تھی۔ بنگال کی صحافت میں انقلابی رجحان کا یہ ایک مختصر سا نمونہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاؔد، اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادؔی جیسی جلیل القدر شخصیتوں نے صحافت کے فرائض نبھانے کے ساتھ ساتھ قومی رہنما کا کردار ادا کیا اور نئے نظام اور نئے سماج کا تصور بخشا۔

آج بھی بنگال کی سرزمین پر اردو کے اخبارات پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ کبھی مالی تنگیوں اور کبھی ذاتی مجبوریوں کی بنا پر اکثر اخبارات بند بھی ہو گئے۔ صحافت کی قدیم روایت نے ہمیں بتایا ہے کہ اخبارات کے لئے اشتہارات ضروری ہیں۔ آج جو بھی اخبار اشتہارات حاصل کرنے میں مستعدی و چستی کا مظاہرہ کرتا ہے وہ دراصل اپنی بقا کی جنگ پوری شدت سے لڑ رہا ہے۔ روایتوں سے ہم نے یہ بھی سیکھا ہے کہ ہر اخبار کی اپنی پالیسی ہوتی ہے۔ آج بنگال میں اردو کا ہر اخبار اپنی ایک الگ پالیسی کا حامل ہے۔

دورِ حاضر میں کلکتہ سے شائع ہونے والے اہم اخبارات مثلاً آزاد ہند، اخبارِ مشرق، آبشار، روزنامہ ہند، اپنی پالیسیوں سے تو پہچانے جاتے ہیں ہی، ان کی پہچان بنانے میں ان کے اداریے بھی نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ اداریے میں زور پیدا کرنے کے لئے مدیر کا صاحبِ علم و اہلِ زبان ہونا شرط ہے۔ ساسؔر کا کہنا ہے کہ انسان اور اس دنیا کے مابین جس کا وہ تجربہ کرتا ہے، علامات کا نظام قائم ہے اور یہ علامات اس دنیا کی دین ہیں۔ یہ علات اس وقت معنی پاتے ہیں جب انہیں کوڈ میں بدلا جاتا ہے، اور خاص کوڈ زبان ہے۔ یہ دنیا سے رشتہ قائم کرنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔

روجر فاؤلؔر کا کہنا ہے کہ خبر کے معنی ہیں زبان کے وسیلے سے دنیا کی نمائندگی۔ کیونکہ زبان ایک علاماتی نظام ہے۔ یہ سماجی اور معاشی قدروں کے ڈھانچے کو ہر طرح کے اظہار میں برقرار رکھتا ہے اور اس لئے خبر، ہر اظہار کی طرح، جو کچھ بھی کہتی ہے اس کے نقشے ترتیب دے لیتی ہے۔ غرض، خبر ترتیب و تعمیر کے معنوں میں اظہار ہے یعنی وہ جو کچھ بھی بتاتی ہے وہ حقیقت کا بے معنی، بے مقصدی یا غیر معیاری اظہار نہیں ہوتا۔ فاؤلؔر کہتا ہے کہ

I assume as a working principle that each particular form of linguistic expression in a text -

wording, syntactic option, etc.- has its reason. There are always different ways of saying the same thing, and they are not random, accidental alternatives.Differences in expression carry ideological distinctions(and thus differences in expression).

Introduction, Language in News, Page-4 By, Roger Fowler. University of East Anglia.
Pub.By.Routledge.1991.

فاؤلر(Fowler) کے الفاظ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اس کے نزدیک ڈسکورس کی بہت اہمیت ہے اور اسے اس کا یقین ہے کہ خبروں میں زبان خاص کردار نبھاتی ہے۔ہم چاہے لاکھ کہیں کہ اردو اخبار زیادہ تر ترجموں کے سہارے چلتے ہیں اور مناسب معاوضہ نہ ملنے کی صورت میں باصلاحیت لوگ اخبار نویسی سے دور بھاگتے ہیں تاہم یہ بھی اپنی جگہ سچ ہے کہ اس طرح کی مجبوریاں دکھا کر صحافت کی ذمہ داریوں سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔ فاؤلر کہتا ہے کہ اسکا مقصد اخباروں پر متعصب ہونے کا الزام لگانا نہیں ہے لیکن اس کی رائے میں ایک عام لسانیاتی تھیوری ضرور ہونی چاہیئے جس کے مطابق تقریباً سارے معنی سماجی طور پر طے شدہ ہوں اور یہ مان لیا جائے کہ ہر اظہار ایک سماجی پروڈکٹ اور سماجی عمل ہے۔اس کا خیال ہے کہ اظہار کو اس وقت بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے جب اس کا سختی سے لسانیاتی جائزہ لیا جائے۔ فاؤلر کہتا ہے کہ

News has not been singled out as a unique instance of deliberate or negligent partiality; it is analyzed as a particularly important example of the power of all languages in the social construction of reality. **Language in News, page-4**

ہمارے اطراف آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے، ہم جس کرب اور انتشار سے گذر رہے ہیں، قدروں کی پامالی کا جس طرح شکار ہو رہے ہیں، اس کا اخبار کے صفحوں پر آنا بہت ضروری ہے۔ پوری دنیا گلوبل ویلیج میں تبدیل ہوتی جارہی ہے، صارفیت نے دم گھوٹنے کا عمل شروع کر دیا ہے۔ جنگ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تباہیاں انسانیت پر سے اعتماد اٹھا لینے کا اشارہ کر رہی ہیں۔ سستی اور گھٹیا اشیاء کا اشتہارات کے ذریعہ بازار پر چھا جانا، عام آدمی کی قوتِ خرید کا خاتمہ ہو جانا، دیسی بازاروں پر بدیسی چیزوں کا قبضہ جما لینا، بنیاد پرستوں کا مذہب کے نام پر معصوموں کے خون سے ہولی کھیلنا، دہشت گردوں کا آزادی کے نام پر علیحدگی پسندی کے جنون کو بڑھاوا دینا۔۔۔ یہ سارے ایسے معاملات ہیں جنہیں آج کے اخبارات کو واضح طور پر سمجھانا ہے۔ زبان دوسرے کوڈ کی طرح ایک cognitive رول نبھاتی ہے۔ وہ ہمارے تجربوں کو ایک منظّم ذہنی نمائندگی عطا کرتی ہے۔ آج اخبارات سے ہم کو وہی کام لینا ہے۔

☆☆☆☆

نہ تیر کی ہے، نہ تلوار کی لڑائی ہے
ہمارے عہد میں اخبار کی لڑائی ہے **(اکبر حمیدی)**

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق اُر (استنبول، ترکی)

ترکی میں اردو کیوں سیکھتے ہیں؟

ترکی میں اردو کیوں سیکھتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب اب تک نہ میں دے سکا نہ ہی اردو دان لوگ۔ مجھے یہ تو علم ہے کہ میں بذات خود کیوں اردو سیکھنے لگا لیکن اس کا سبب اردو بولنے والوں کو نہیں سمجھا سکا اور بالخصوص وہ اردو دان لوگ جو اپنی زبان کو ایک سیکنڈ کلاس (!) کی زبان ماننے کی عادت رکھتے ہیں اب تک اس راز کو نہ سمجھنے کے لیے بڑی استقامت سے کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مطابق اس گلوبل ویلیج جس کی واحد زبان صرف اور صرف انگریزی ہے، میں کوئی اور زبان بالخصوص اردو جیسی ایک زبان سیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اِن کے خیال میں انگریزی جانو تو دنیا میں تمام دروازے آپ کے سامنے کھل جائیں گے تو کیوں اردو سیکھنے کی تکلیف اُٹھائی جائے۔ لیکن خود اہل زبان کی اردو کے خلاف ثابت قدمی کے ساتھ سعی و محنت کے باوجود دنیا کے مختلف ملکوں میں کم از کم یونیورسٹی کی سطح پر اردو کی تعلیم جاری ہے اور ترکی دنیا کے ان مختلف ملکوں میں سے ایک ہے۔

ترکی میں اردو کیوں سیکھتے ہیں؟ اس سوال کو مختلف پہلوؤں سے جانچا جا سکتا ہے لیکن یہاں ہمارا مقصد اس موضوع پر تفصیلی مضمون لکھنا نہیں ہے۔ دراصل اس لئے یہ کوشش کی جائے گی کہ استنبول یونیورسٹی، ادبیات فیکلٹی، شعبہ زبان و ادبیات اردو کے طالبعلموں سے لئے گئے مندرجہ ذیل بیانات سے اس سوال کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے۔ لیکن اس سے قبل مختصراً اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا تاکہ قارئین کرام کے لیے موضوع کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

مجموعی طور پر اگر ان پر بحث کرنی ہے تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ترکی میں اردو سیکھنے کی ایک اہم وجہ برصغیر کے لوگوں کے ساتھ ترکوں کے دلی روابط ہیں۔ صدیوں سے برقرار دوستی اور برادری کے احساسات دن بہ دن کم ہونے کے باوجود اب تک ہمارے دلوں میں بسے ہوئے ہیں اور بعض طالبعلم بس اسی بناء پر ہی اردو سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری وجہ ترکی میں یونیورسٹی میں داخلے کے امتحانات کا نظام ہے۔ اس نظام کے مطابق طالبعلم ہائی اسکول کے جس شعبے سے فارغ التحصیل ہوں اسی شعبے کے مطابق ان کو یونیورسٹی میں داخلہ ملتا ہے۔ اور امتحانوں سے اخذ کئے گئے نمبروں کے مطابق وہ مختلف شعبوں میں جاتے ہیں اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ اردو میں داخلے

کے لیے ضروری نمبروں کی نسبت دوسری زبانوں سے کم ہے۔ دراصل یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ داخلے کے امتحان میں اردو کے لیے ضروری نمبر کم ہیں ورنہ ہمارے طالبعلموں کی تعداد آج سے بھی بہت کم ہوتی۔ یہ دو مثبت پہلو ہیں جو ترکی میں اردو کی تعلیم میں محرک ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے منفی پہلو بھی ہیں جو ترکی میں اردو تعلیم کے سامنے رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں۔

طالبعلم اپنے مستقبل کے لیے یونیورسٹیوں میں آتے ہیں۔ اور اردو زبان سیکھ کر ان کا جو مستقبل بننا ہے وہ ذرا مشکوک ہے۔ کیونکہ برصغیر کے انگریزی کے دل دادہ لوگ انگریزی دانی میں اتنے مست ہو گئے ہیں کہ ان کو آگے پیچھے کا کچھ خیال ہی نہیں رہا ہے۔ اگر کسی زبان کے بولنے والے اپنے ملک میں اپنی قومی زبان کو چھوڑ کر تجارت سے لے کر سیاست تک اپنے تمام کام کسی غیر زبان میں کرنے لگیں گے تو دوسروں کے ہاں ان کی زبان کے احترام کی گنجائش رہتی ہے کہ نہیں؟ اور ایک ایسی زبان کو اجنبی سیکھنا چاہیں گے کہ نہیں؟ پھر بھی اس کے باوجود کچھ طالبعلم اپنا شوق لے کر آتے ہیں اور اردو سیکھنے لگتے ہیں تو ان کے سامنے اردو دانوں کی سخت مخالفت کھڑی ہو جاتی ہے۔ یقین کیجئے میرے طالبعلموں کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہوا ہے کہ وہ کسی سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے پاکستان کے بامعتبر ادارے کے آفسر کے پاس گئے تو ان سے یہ کہا گیا ''آپ لوگوں کے پاس عقل کی کمی ہے کہ اردو سیکھتے ہیں اردو سیکھ کر کیا کریں گے، انگریزی سیکھیں کسی اور زبان کی ضرورت نہیں!'' یہ کہنے والے صاحب کو یہاں تک کا پتا نہیں کہ اردو سیکھنے کے لیے جو طالبعلم ہمارے پاس آتے ہیں وہ داخلے کے امتحان میں انگریزی، جرمن یا فرانسیسی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کے سوالات حل کر کے ہمارے شعبوں میں آتے ہیں۔ یعنی ان کو کسی یورپین زبان کی اچھی خاصی دسترس ہوتی ہے۔

یہ ایک منفی پہلو ہے۔ دوسرا منفی پہلو یہ ہے کہ دوستی اور قلبی ارتباط کے باوجود ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اردو ترکی کا لفظ ہونے کے باوجود کسی مشخص ملک سے عنوانی تعلق قائم نہ رکھنے کی وجہ سے ذہنوں میں کوئی پہلو اجاگر نہیں کرتی ہے۔ سو ترکوں کے ذہن میں بھی پہلی دفعہ سننے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اردو کونسے ملک کی زبان ہے؟ پھر جس زبان سے لوگ ناشناس ہیں اسی زبان کو سیکھنے کی طرف کم رغبت ہوتی ہے۔ اور ترکی میں اردو زبان و ادب سے تعارف نہ کروائے جانے کی وجہ سے بھی اردو سے دلچسپی لینے والوں کی تعداد گھٹتی ہے۔

باقی آپ سوچئے کہ ترکی میں کیوں اردو سیکھتے ہیں؟ یہاں میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ترکی میں اردو سیکھنے کے تمام تر وجوہات پر حاوی ایک تفصیلی مضمون لکھوں۔ میری باتیں بس اس موضوع کی کچھ جھلکیاں ہیں جس کی تفصیل ہمارے طالبعلموں کے بیانات میں بخوبی نظر آئیں گی۔

گللوشاہ یلماز (Gullusah Yilmaz)

یونیورسٹی کے امتحانات سے پہلے انٹرنیٹ کے ذریعے ایک مختصر تحقیق کی۔ میں ہائی اسکول سے غیر ملکی

زبان اور ادبیات کے شعبے سے فارغ التحصیل ہونے کی وجہ سے میری پہلی ترجیح اجنبی زبان کا شعبہ تھی۔ اس کے بعد دو یونیورسٹیوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ اُن میں سے ایک استنبول یونیورسٹی ادبیات فیکلٹی شعبہ اردو زبان و ادبیات اور دوسری انقرہ یونیورسٹی شعبہ اردو زبان و ادبیات۔ اِن دونوں یونیورسٹیوں میں سے ایک میں داخلہ لینے کے لیے سوچنے کی وجہ کچھ نئی چیزیں سیکھنے کی خواہش تھی اور انگریزی زبان تو اب سب کو آتی ہے اور جگہ جگہ انگلش کے لیے کورس موجود ہیں۔ اور اردو کوئی نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ ننانوے (۹۹) فی صد لوگ اردو زبان کس ملک میں بولی جاتی ہے اسے بھی نہیں جانتے۔ لیکن اسے میں جانتی ہوں یہ میرے لیے اہم ہے۔ اور آگے چل کر میں اردو میں ایم اے کرنا چاہتی ہوں۔ پاکستان جا کر وہاں کے لوگوں کو اردو بولتے ہوئے سننا چاہتی ہوں اور کسی سرکاری ادارے میں اردو کی فروغ کے لیے کام کرنا چاہتی ہوں۔

دویگو بہار (Duygu Bahar)

سب سے پہلے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں شعبے سے منسلک ہونے سے پہلے اِس کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ یہاں تک کے اردو زبان کی الف بے تک نہیں جانتی تھی۔ لیکن اردو زبان سے متعلق پہلے سے میرے ذہن میں کوئی منفی رائے نہیں تھی۔ جب بھی اردو زبان و ادب سے متعلق کوئی نئی چیز سیکھتی تو میری دلچسپی اس کے ساتھ اور بھی بڑھتی گئی۔ اِس کے ساتھ ساتھ ایک مشرقی زبان ہونے کی بناء پر مشرقی ثقافت اور مشرقی انسانوں کی طرزِ معاشرت بھی میری دلچسپی کا باعث بنی۔ کیونکہ ایک زبان سیکھنے کے لیے جس قدر اس زبان کے قواعد و قوانین جاننے اور لکھنے کی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اس کو مکمل طور پر جاننے کے لیے اسی قدر اس زبان کو بولنے والے لوگ، علاقہ، ثقافت، ادبیات، سیاست اور تاریخ کے بارے میں بھی جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں ترکی میں مشرقی زبانوں اور ادبیات کی تعلیم سے مطمین نہیں ہوں۔ مثلاً اردو ادبیات کی طالب علم ہونے کے ناطے پاکستان کے اعلیٰ سطح کے تعلیمی اداروں کے ساتھ معلوماتی اور علمی ارتباط معدوم کالعدم ہے۔ اپنے طور پر اپنے شعبے میں پاکستانی مہمانوں کو وقتاً فوقتاً دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرے لئے ان کے ادبی خیالات سے واقف ہونا اور ان کو اردو بولتے ہوئے سننا دلچسپی کا باعث ہوگا۔

خاقان یلدز آل قان (Hakan Yildazalkan)

شعبہ اردو زبان اور ادبیات کے انتخاب کرنے کی پہلی اور بڑی وجہ اسکول کے شعبۂ لسانیات سے فارغ التحصیل ہونا اور دوسری وجہ انگریزی کے علاوہ ایک اور زبان سیکھنے کی خواہش تھی میں چاہتا تھا کہ جو زبان میں سیکھوں گا وہ کوئی ایسی زبان ہونی چاہئے جس کا تعلق مشرق سے ہو۔ کیونکہ انگریزی مغربی زبان ہے اور مغربی زبان جاننے کے ساتھ ساتھ مشرق سے رابطے کے لیے مشرقی زبان بھی جاننے کی ضرورت ہے۔ اس لئے میں نے مشرقی زبانوں میں سے اردو کو چُنا۔

موگے آندچ (Muge Andac)

میں بہت سالوں سے انگریزی پڑھتے پڑھتے بہت تنگ آگئی تھی۔ اس لئے کوئی مختلف زبان ہونی چاہئے سوچتے ہوئے اردو زبان وادبیات کے شعبے کا انتخاب کیا۔ فی الحال میرے لیے تھوڑی سی مشکل ہی سہی لیکن پھر بھی ایک نئی زبان سیکھنے کا شوق میرے لئے خوشی کا باعث ہے۔ جب میں نے پہلی دفعہ اردو الف بے کو دیکھا تو ناامیدی کا شکار ہوگئی، لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ میں نے یہ محسوس کیا کہ جتنی زیادہ میں اس سے قریب ہوتی ہوں اتنے ہی زیادہ وہ میرے لیے اپنے دروازے کھول دیتی ہے۔ اِس زبان کو انتخاب کرتے ہوئے داخلے کے امتحان کی فہرست میں اتفاقاً اس کا نام لکھا تھا لیکن اب یہ بات اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ کیونکہ میں یہ زبان سیکھنے پر خوش ہوں۔

ایمل اوزچیلک (Emel Ozcelik)

سچی بات تو یہ ہے کہ میں اِس شعبے میں داخل ہونے تک اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس وقت تک میرے ذہن میں کسی ایسے شعبے کو چننے کا خیال تک نہ تھا۔ اِس شعبے میں داخل ہونے کی بڑی وجہ یونیورسٹی کے داخلے کے امتحان میں جو نمبر میں نے لئے وہ اور میری قسمت ہے۔ لیکن اگر آپ مجھ سے یہ سوال کریں کہ اس شعبے سے منسلک ہونے پر خوش ہو تو میرا جواب ''جی ہاں'' ہوگا۔ میں خوش ہوں اور اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔ اور اب یہ سوچتی ہوں کہ اچھا ہوا جو اس شعبے میں داخلہ ملا۔ ایک نئی زبان سیکھنا سچ مچ بہت دلچسپ ہے اور اوپر سے اگر آپ کو شوق بھی ہو اور یہ کام خوشی خوشی کر رہے ہوں تو اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے۔ مختصراً شروع میں جس زبان کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتی تھی اور اس کو سیکھ پاؤں گی کہ نہیں کا ڈر مجھے لاحق تھا اب میرے لیے خوشی کا باعث ہے۔

برگل دورموش (Birgul Durmus)

اردو زبان کو انتخاب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بہت پہلے سے عربی الف بے میرے لئے دلچسپی کا باعث تھی۔ مڈل اسکول میں طالبعلمی کے دوران اسی دلچسپی کے سبب عربی زبان کو زیادہ اچھے طریقے سے سیکھنے کے لیے عربی زبان میں تعلیم دینے والے ایک مڈل اسکول میں چلی گئی تھی۔ اس کے بعد ہائی اسکول میں بھی شعبۂ لسانیات کا انتخاب کیا۔ یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہوئے ایک مختلف زبان سیکھنے کے ساتھ ساتھ میرے امتحان کے نمبر بھی اِسی شعبے کے لیے کافی تھے۔ اور آج اسی وجہ سے اس شعبے میں ہوں۔ عربی الف بے اور رسم الخط کو پہلے سے جاننا میرے لئے اردو سیکھنے میں آسانی کا باعث بنے۔ ہمارے شعبے میں اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی زبانیں بھی سکھائی جاتی ہیں اور ان دونوں زبانوں کو سیکھنا میرے خیال میں بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔

سیوال کار (Seval Kar)

اس شعبے کو چننے کی سب سے بڑی وجہ ہندوستان کا میرے لیے جاذب نظر ہونا ہے۔ بہت سی زبانیں اور ادبیات کے شعبہ جات موجود تھے پڑھنے کے لیے لیکن ہندوستان میرے لیے مختلف ہے۔ اور تاریخی لحاظ سے بھی ایسے ہی ہے۔ کونسے ملک ہیں جنھوں نے ہندوستان پر قبضہ کے لیے نہ سوچا ہو۔ وہ ایک جاذب نظر ملک ہے۔ طرز زندگی اور ثقافت کے لحاظ سے میرے لئے یہ دلچسپی کا باعث تھا اور انہیں وجوہات نے مجھے اس شعبے کے انتخاب کے لیے اور زیادہ اُکسایا۔ اور میری سب سے بڑی خواہش اِس شعبے میں سکھائی جانے والی زبان کو اہل زبان کے منہ سے سننا، ہندوستان اور پاکستان کو مکمل طور پر پھر کر دیکھنا۔ انشاءاللہ آئندہ چل کر ان ملکوں کو مختلف پہلوؤں کو اور زیادہ جان سکوں گی۔

دویگو فرطینا (Duygu Firtina)

اِس شعبے میں داخلے سے قبل مجھے اِس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ترجیحات کی فہرست میں سب سے آخری نمبر پر اردو زبان تھی۔ وہ بھی میں نے اس لیے لکھ دی تھی کہ اگر کسی اور شعبے میں داخلہ نہیں ملے گا تو اردو ہی پڑھ لوں گی۔ یہ سوچ میرے لیے باعث اطمینان تھی۔ زندگی میں بعض چیزوں کے بارے میں ان کو جانے بغیر ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کی اور حتیٰ اُن کو نیچا دیکھنے کی بری عادت کی وجہ سے ''یہ شعبہ اور یہ عجیب سی زبان کہاں سے میرے حصے میں آگئی؟'' سوچ کی سبب بنی۔ لیکن اب میرے لیے اس سلسلے میں کوئی بھی دکھ یا پشیمانی نہیں ہے۔ حتیٰ جب میں یہ کہتی ہوں کہ میں اردو زبان پڑھ رہی ہوں تو میرے سامنے کھڑے بہت پڑھے لکھے انسان بھی حیرت سے مجھے دیکھ کر یہ پوچھتے ہیں کہ ''وہ کیا ہے؟ کہاں بولی جاتی ہے؟'' اور اسی طرح کے اور بہت سارے سوالات تجسس کے ساتھ پوچھتے ہیں تو اِن کے سامنے اپنے آپ کو بہت عالم فاضل انسان کی طرح محسوس کرتی ہوں۔ مختصراً اِس شعبے میں داخل ہونے پر خوش ہوں۔

کیا سناتا ہے مجھے ترک وعرب کی داستاں — مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز وساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ! — جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہوگیا مانندِ آبِ ارزاں مسلم کا لہو — مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
گفت رومی ''ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند'' — می ندانی ''اول آں بنیاد را ویراں کنند''

علامہ اقبال

عبدالرب اُستاد (گلبرگہ، انڈیا)

پریم چند اور خطبۂ صدارت

منشی پریم چند کے متعلق اُردو اور ہندی، ہر دو زبانوں میں اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہر زاویہ سے ان کے ادب کو پرکھنے کی کوشش کی گئی۔ افہام و تفہیم کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہ وہ واحد فن کار ہے، جس نے اُردو اور ہندی سے محبت کی اور اپنے خیالات کو پیش کرنے کے لیے انہی دو زبانوں کا سہارا لیا، جو خالص ہندوستانی اور عوامی زبانیں ہیں۔ ہر دو زبانوں کے بولنے، لکھنے اور پڑھنے والوں نے جہاں آپ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسانی کی، وہیں بعض نے اعتراضات بھی کیے اور مخالفت میں بہت کچھ توانائیاں صرف کیں۔ مجھے نہ تو مخالفت میں کچھ کہنا ہے اور نہ ہی بے جا تعریف میں لکھنا۔ کیونکہ اعتراض یا مخالفت کے لیے، تعریف کرنے سے کہیں زیادہ، جاننا ضروری ہوتا ہے، اور تعریف کے لیے ادب کا شعور و درک رکھنا ضروری ہے۔ جب کہ ان دونوں سے میں اپنے آپ کو عاری سمجھتا ہوں۔ اس لیے اُردو کا ایک حقیر طالب علم ہونے کے ناطے سطحی ہی سہی، جائزہ لینے کی یہ مقدور بھر کوشش ہے۔

محققین کی آراء کے مطابق منشی پریم چند کی ولادت ۱۸۸۰ء ہے اور وفات ۱۹۳۶ء۔ اس طرح آپ کی عمر ۵۶ سال قرار پاتی ہے۔ محققین کے مطابق منشی جی کی پہلی تخلیق ۱۹۰۸ء میں بتائی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۲۸ سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا۔ اگر عمر کے ۵۶ سال میں سے ۲۸ سال منہا کر دیں تو باقی ۲۸ سال رہیں گے۔ یعنی دھنپت رائے عرف نواب رائے کی عمر ۲۸ سال اور منشی پریم چند کی عمر ۲۸ سال ہو جاتی ہے۔

محققین نے آپ کی جملہ ۲۸ سال کی ادبی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کر دیا۔

۱۔ پہلا دور............ ابتدائی کوشش ۱۹۰۹ء

۲۔ دوسرا دور......... تاریخی اور اصلاحی افسانے ۱۹۱۰۹ء تا ۱۹۲۰ء

۳۔ تیسرا دور............ اصلاحی اور سیاسی افسانے ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۲ء

۴۔ چوتھا دور .... سیاسی اور فکری افسانے ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۶ء

ان ۲۸ سالوں میں پریم چند نے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ مضامین اور چند ایک ڈرامے بھی لکھے۔ مرورِ ایام کے ساتھ آپ کے مضامین اور ڈرامے نہ تو عوام کے ذہن کا حصہ بن پائے اور نہ ہی موضوع بحث رہے، سوائے محققین کے۔ مگر افسانے اور ناولوں نے عوام اور خواص کے ذہنوں پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے اور آج

بھی قاری ان افسانوں اور ناولوں کو پڑھ کر محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

منشی جی کی وفات سے لے کر آج تک ادب میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مختلف رجحانات نے جنم لیا، روے آئے، تحریکیں اُٹھیں، تجربے ہوئے مگر پریم چند کے ادب سے ہر ایک نے پریم کیا اور آج بھی کر رہا ہے۔ اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے کیوں نہ ہو پریم چند نے اس چمن ادب کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور اس کی آبیاری کی۔ جس کی وجہ سے نہ صرف ان کا ادب زندہ ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پریم چند کا نام بھی زندہ ہے اور اسے دوام حاصل ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ پریم چند کی کملہ قلمی کائنات کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور آخری دور کو نقادانِ ادب اور محققین پریم چند نے سیاسی اور فکری دور سے تعبیر کیا ہے۔

انسانی ذہن چونکہ رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہے۔ اس کے تجربات میں پختگی آتی ہے۔ قلم میں جولانی دکھائی پڑتی ہے اور ایک طرح کی سنجیدگی ٹپکتی ہے۔ بعینہٖ پریم چند بھی انھی مراحل سے گزرتے رہے۔

پریم چند کا مطالعہ وسیع تھا، اہلِ علم کی صحبتیں انھیں نصیب تھیں، ادب کے لیے ماحول اور ماحول کے لیے ان کا ادب، سازگار تھے۔ انھوں نے اپنے گرد و پیش کے ماحول سے نہ صرف مواد اخذ کیا بلکہ ماحول کو انھوں نے بہت کچھ دیا بھی، چنانچہ انھوں نے اپنے عہد کو دیکھا، پرکھا اور سمجھا، پھر اپنے قلم کو ہتھیار کی مانند استعمال کیا۔ یہ قلم دو دھاری تلوار کی طرح نظر آتا ہے۔ یہ جہاں سامراج کے خلاف بارود کا کام کر رہا تھا، وہیں وطن اور ابنائے وطن کے لیے محبت، اُخوت، بھائی چارگی کے پھول برساتا نظر آتا ہے۔ یہ جہاں پر اخلاقی گراوٹوں، معاشی استحصال کرنے والوں، معاشرتی برائیوں اور سماجی ناہمواریوں پر وار کرتا ہے، وہیں کمزور، لاچار اور غربت کے ماروں کی حمایت، کسانوں اور مزدوروں کی وکالت کرتا نظر آتا ہے۔ اس مین کوئی دو رائے نہیں کہ ان کا قلم ایک اچھا اور سچا فنکار ہونے کے ناطے سچ اُگل رہا تھا، کہتے ہیں کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہو لگتا ہے۔ جس کی وجہ سے کبھی ہندو اور برہمنوں کے دل ملول ہو رہے تھے، تو کبھی مسلمان برہم ہو رہے تھے۔ مگر اس کی انھوں نے پرواہ نہیں کی۔ کیونکہ جو کچھ ان کی آنکھ دیکھ رہی تھی اور ذہن سوچ رہا تھا اور دل محسوس کر رہا تھا اس کا اظہار ان کے قلم سے ہو رہا تھا۔ یہ سب ان کے مضامین سے عیاں ہے۔ ہاں ناولوں اور افسانوں کی حقیقت یہ رہی کہ نقادانِ ادب کے بقول حقیقت پسندی کا درس پریم چند نے سب سے پہلے دیا۔ وگرنہ تو پریم چند سے پہلے افسانوں ادب کی دنیا تو بس دل والوں کی دنیا تھی، جسے حقیقت سے روشناس کرانے والے پریم چند تھے۔

جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۶ء، جسے آخری دور سے تعبیر کیا گیا ہے، پریم چند کی فکر کا دور رہا۔ جس میں نہ صرف ان کی ساری زندگی کا تجربہ بلکہ علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، سماجی اور فکری تجربہ، پوری آب و تاب کے ساتھ اس دور کی تحریروں میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ جن میں گیرائی و گہرائی، جامعیت و آفاقیت، صداقت و معنویت اس قدر پیوست ہوگئی ہیں کہ وہ شاہکار کا درجہ اختیار کر گئیں۔ خواہ وہ افسانہ کفن ہو کہ پوس کی رات یا ناول گئودان وغیرہ۔ ان تمام سے قطع نظر منشی پریم چند کی وہ تحریر جس میں ان کی پوری زندگی کا ماحصل، ادب کا نچوڑ در آیا ہے، وہ ہے ترقی پسند مصنفین کے اجلاس کا خطبۂ صدارت۔

یہ خطبہ صرف تقریر ہی نہیں بلکہ لائحہ عمل ہے ادب کا ،ایک Land Mark ہے اُردو اور ہندی لٹریچر کا ،جس نے سوتوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیا، مردوں میں جان ڈال دی ، نئے لکھنے والوں کو ایک نئی راہ اور سمت دکھا دی۔ان میں آشا کی جوت جگائی ، کمزوروں کو توانا کر دیا، وقت کی دھارا کو بدل کر رکھ دیا اور ادب کو ایک نیا ذہن اور نیا اُفق عطا کیا۔ یہ وقت کا تقاضا تھا جسے پریم چند نے سمجھ لیا تھا، آپ کی فکر رسا نے آنے والے وقت کو بھانپ لیا تھا، اور اس کے مطابق رائے دی۔ یہ وہی کام تھا جو برسوں پہلے نظم کے حوالے سے حالؔی اور آزادؔ نے کیا تھا۔اس طرح حالؔی نے شاعری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے عصری ادب کو پرکھنے کی کوشش کی تھی جو بعد میں تنقید کی نیو ثابت ہوئی۔

حالؔی نے شاعری کی وساطت سے بات کی تھی ،جب کہ پریم چند نے نثر کے حوالے سے بات کی۔جس طرح حالی کا مقدمہ ان کی شاعری پر تھا۔اسی طرح یہ صدارتی خطبہ، پریم چند کے فکشن کا مقدمہ معلوم ہوتا ہے۔حالؔی نے جہاں اصلیت ، جوش اور صداقت و نیز تخئیل ،کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ پر بحث کی ، وہیں پریم چند نے زبان ،آرٹ، حسن اور جملہ ادب پر سوالات قائم کیے اور پیش رو ادب کے ساتھ اپنے عہد کے ادب کا مقابلہ کرتے ہوئے مستقبل کے ادب کے بارے میں بتایا۔اس طرح یہ بھی واضح کر دیا کہ ادب کو اور ادیب کو کیا ہونا چاہیے۔اس طرح حالؔی کا مقدمہ اور پریم چند کا خطبہ دونوں مل کر ادب کی تنقید کو مکمل کرتے ہیں۔

یہ خطبۂ صدارت گویا پریم چند کے پورے ادب کا مقدمہ معلوم ہوتا ہے۔مقدمہ عموماً کتاب کے ابتداء میں ہوتا ہے جب کہ وہ آخر پر لکھا گیا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں ساری کتاب کا نچوڑ ہوتا ہے۔ساری کتاب کا نچوڑ ظاہر ہے کتاب کی تکمیل کے بعد ہی نکالا جاتا ہے۔ یہ خطبہ بھی عمر کے آخری حصہ میں بلکہ وفات سے چند ماہ قبل لکھا اور پیش کیا گیا تھا۔گویا انھوں نے اپنے عہد اور اپنے ادب کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد، انتہائی عرق ریزی اور محنت سے لکھا تھا۔تو یقیناً یہ کہا جاسکت اہے کہ جس طرح مقدمہ شعروشاعری اردو تنقید کی پہلی کتاب ہے اسی طرح یہ خطبۂ صدارت بھی اردو فکشن یا اُردو نثر کی پہلی تنقید یا کم از کم تنقیدی کاوش قرار دی جاسکتی ہے اور قرار دی جانی چاہیے۔اس سے قبل یا آج تک بھی غالباً اس کو صرف ایک نظریاتی یا فکری تقریر ہی گردانا گیا۔وگرنہ یہ صرف تقریر ہی نہیں نثر یا فکشن کی کسوٹی ہے۔جس پر فکشن یا ادب کو پرکھا جاسکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کیا واقعی اسے کسوٹی قرار دے سکتے ہیں۔تو میرا جواب ہے کہ ہاں اسے یقیناً کسوٹی قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ ادب کے لیے اور بطور خاص نثر اور تخلیقی نثر کے لیے زبان کا استعمال ضروری ہے۔ چنانچہ پریم چند خود کہتے ہیں کہ زبان بول چال کی بھی ہوتی ہے اور تحریر کی بھی ،اور جو تحریر ہے وہی ادب، معاً ادب اور تحریر کے متعلق وضاحت بھی کرتے ہیں، اقتباس ملاحظہ ہو

”......... ادیب وہی کام تحریر سے کرتا ہے۔ہاں اس کے سننے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔اور اگر اس کے بیان میں حقیقت اور سچائی ہے تو صدیوں اور قرنوں تک اس کی تحریریں دلوں پر اثر کرتی رہتی ہیں۔میرا یہ منشا نہیں کہ جو کچھ سپرد قلم ہو جائے وہ سب کا سب ادب ہے۔ادب اُس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو ،جس کی زبان پختہ ،شستہ اور لطیف ہو اور جس میں دل و دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو اور ادب میں یہ صفت کامل

طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حقیقتیں اور تجربے بیان کے گئے ہوں“

اس اقتباس میں جہاں انھوں نے زبان کی پختگی، شستگی اور لطافت کا اظہار کیا، وہیں حقیقت اور سچائی یا صداقت کو ادب کے لیے ضروری قرار دیا ہے، اور زندگی کے تجربوں کو بیان کرنا، ناگزیر بتایا۔ یہ بات مسلم ہے کہ جس تحریر میں صداقت اور حقیقت ہو، جس میں زندگی کے تجربات، فن کارانہ انداز سے درآئے ہوں، اس تحریر کا اثر صدیوں اور قرنوں تک انسانی دلوں پر رہتا ہے۔اب خود منشی پریم چند کی تحریروں کو لیجیے کہ ایک صدی ہونے کے باوجود آج بھی ان میں وہی تازگی برقرار ہے جو ابتداء میں تھی۔اس طرح ادب کے متعلق اس خطبہ میں فرماتے ہیں کہ

”ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں ،لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف ”تنقید حیات“ ہے چاہے وہ مثالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی۔اسے ہماری حیات کا تبصرہ کہنا چاہیے“ پھر کہتے ہیں کہ ”ادب اپنے زمانے کا عکس ہوتا ہے“[1]

س طرح وہ اپنے پیش رو عہد کا جائزہ لیتے ہوئے شعر و ادب پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ جہاں یا تو مافوق الفطرت عناصر کی بہتات تھی ، یا تو داستانیں تھیں ،جن میں طلسماتی حکایتوں یا بھوت پریت کے حسن و عشق کے قصے ، جو سوائے دل بہلاؤ اور تفنن طبع کے کچھ نہیں تھا۔عشق اور حسن کی بات تو ہو رہی تھی مگر عشق کا معیار نفس پروری تھا اور حسن کا معیار دیدہ زیبی۔ یہ جنسی جذبات کے اظہار کا آلہ بنے ہوئے تھے ۔مگر انسانی زندگی صرف جنس نہیں۔ جہاں حالؔی نے اصلیت ،سادگی اور جوش کی بات کہی تھی وہیں پر پریم چند نے صداقت ، تجربہ اور حقیقت کے ساتھ ساتھ سعیٔ مسلسل ،اجتہاد فکر اور مشاہدے کو ادب کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔عصری تقاضوں کے مد نظر ادب کے منصب پر یوں گویا ہیں:

”جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح نہ بیدار ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لیے بے کار ہے۔اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا“

پریم چند کا نظریہ یہی تھا کہ ادب کا مقصد یا منصب یہ ہو کہ وہ اپنے قاری میں مثبت فکر پیدا کرے، صحیح مذاق پیدا کرے اور وہ روحانی اور ذہنی تسکین کا موجب بن جائے جس سے قری میں قوت و حرکت پیدا ہو، کچھ کر گذرنے کی صلاحیت اس میں آجائے ،اور اس کے ساتھ ہی حسن کا جذبہ بھی جاگے۔ادب میں وہ کیفیت ہو کہ فن کار اور قاری میں، حق و باطل میں تمیز کرنے کی قوت پیدا ہو، اچھائی اور برائی میں فرق کر سکے، اور جب وہ صداقت کو پالے یا سمجھ لے تو اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائے۔ بلکہ مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال اسی صداقت سے آسکتا ہے۔ چنانچہ انھیں یہ یقین تھا کہ ادب میں یہ قوت ہوتی ہے جو کمزوروں کو توانا اور تونگر بنا سکتی ہے۔اقوام عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ انقلابات ہمیشہ ادیبوں کی تحریروں سے آئے اور لائے گئے ہیں، اور دنیا کی بساط الٹ دی گئی ہے اور کئی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔خواہ وہ انقلاب فرانس ہو کہ انقلاب روس، یا اسی طرح کے اور

انقلابات۔ حسن کے متعلق پریم چند کا نظریہ ہے کہ وہ نام ہے توازن اور آہنگ کا، کہتے ہیں

''ہماری ترکیب ہی عناصر کے توازن سے ہوتی ہے اور ہماری روح ہمیشہ اسی توازن اور ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے۔ ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے۔ تخریب نہیں وہ ہم میں وفا اور خلوص اور ہمدردی اور انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشو ونما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں وہیں استحکام ہے، زندگی ہے، جہاں ان کا فقدان ہے وہیں افتراق، خود پروری ہے اور نفرت اور دشمنی ہے اور موت ہے''

یہاں پریم چند نے ادب اور ادیب کے باہمی رشتہ کو واضح کرتے ہوئے حسن کے متعلق اظہار خیال کیا کہ یہ ایک ادیب یا آرٹسٹ میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے، کیونکہ انسان کی تخلیق بھی اسی ہم آہنگی اور توازن سے ہوئی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھی اجزاء کا پریشاں ہونا

ادیب یا آرٹسٹ جو خود ایک انسان ہوتا ہے، اسے چاہیے کہ وفا، خلوص، ہمدردی، محبت، انصاف اور مساوات سے کام لیتے ہوئے، انسانوں کے اندر جھانکے، ان کے مسائل سے واقفیت حاصل کرلے اور مثبت فکر سے اپنی تحریروں کو مزین کرے، کیوں کہ یہی زندگی کی علامت ہے اور انھوں نے اسے زندگی سے تعبیر کیا ہے، جب کہ افتراق، خود پروری، نفرت اور دشمنی کو موت سے تعبیر کیا ہے کیونکہ یہ تخریبی عناصر ہوتے ہیں اور ادب یا حسن تخریب کی نہیں بلکہ تخلیق کی ضامن ہوتے ہیں۔

پریم چند نے ایک فن کار کی نظر سے اپنے معاشرے کو، معاشرے میں ہونے والے مسائل کو اور تبدیلیوں کو، بہ نظر غائر دیکھا اور محسوس کیا، پھر اپنے ادب اور تحریروں کے ذریعہ اس انداز میں پیش کیا کہ وہ خود کے محسوسات نہیں رہے بلکہ قاری کے محسوسات بن گئے۔ اور قاری نے اس کو دل و جان سے لگالیا۔ اس سے محظوظ ہوا، اس دردکو، اس کرب کو اس نے بھی محسوس کیا۔

بہر حال منشی پریم چند کے نظریات اور افکار ان کے پورے ادب میں جھلکتے ہیں، اور ان کے ادب کا نچوڑ گویا صدارتی خطبہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ مجتمع ہو کر اتنا ہی رہ جاتا ہے کہ زندگی کو ادب اور ادب کو زندگی بتانا چاہیے۔ ادب اور زندگی الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی سکہ کے دو رخ بن جانے چاہئیں۔

اس خطبہ کے آخری کلمات گویا اعلان کررہے ہیں کہ ہاں یہ صرف خطبہ نہیں بلکہ کسوٹی ہے، جس سے ہم اپنے فکشن کو، نثر کو یا ادب کو پرکھ سکتے ہیں، کہتے ہیں:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں، کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہے''

عمران شاہد بھنڈر (برمنگھم)

گوپی چند نارنگ مترجم ہیں، مصنف نہیں

(**نوٹ:** عمران شاہد بھنڈر برمنگھم یونیورسٹی سے Postmodern literary theory کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اس مضمون کا جواب گوپی چند نارنگ صاحب کو خود دینا چاہئے۔ ان کے جواب کا انتظار رہے گا۔ یہ مضمون ماہنامہ نیرنگِ خیال کے سالنامہ ۲۰۰۶ء میں چھپ چکا ہے تاہم اب عمران شاہد نے اس میں مزید اضافے کئے ہیں اور یہ مضمون پہلے سے دوگنا ہو گیا ہے۔ سو یہ اپ ڈیٹڈ مضمون جدید ادب میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ح۔ق)

گوپی چند نارنگ کا نام اردو ادب کی خدمات کے حوالے سے خاصا اہم سمجھا جاتا ہے۔ ان کی خدمات کے عوض ان کو حکومتِ ہند نے پدم شری اور حکومتِ پاکستان نے نیشنل ایوارڈ سے نوازا۔ حالیہ چند برسوں کے دوران ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب انھوں نے پوسٹ ماڈرن ازم، جو مغربی سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا، کا تعارف اہلِ اردو سے کروایا۔ اہلِ اردو کی اکثریت نے پوسٹ ماڈرن ازم کو مغرب زدہ کہہ کر مسترد کرنے کی کوشش کی، تاہم گوپی چند نارنگ نے اپنی علمی جستجو کو جاری رکھا اور مخالفتوں کی پرواہ نا کرتے ہوئے پوسٹ ماڈرن ازم کی مابعد جدیدیت کے نام سے اپنی کتاب ساختیات، پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات میں تشریح کی، جو ۱۹۹۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ ساختیات دراصل ایک لسانیاتی تحریک تھی جسے سوئس ماہرِ لسانیات سیوسیئر کے لسانیاتی ماڈل سے اخذ کیا گیا۔ یہ لسانیاتی نظریہ چونکہ سائنسی ہونے کا دعویدار تھا اس لیے اس ماڈل میں معنی کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے بعد ازاں ترامیم کی گئیں، بہرحال آج لسانیات مغربی درسگاہوں میں بحیثیت سائنس ہی پڑھائی جاتی ہے۔ لیوائی سٹراس نے یہ دعویٰ کیا کہ سماجی سائنسوں میں صرف لسانیات ہی ایک ایسا شعبہ ہے جسے حقیقی سائنس کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ رولاں بارتھ نے اسی لسانیاتی ماڈل کی بنیاد پر فرانسیسی ثقافت کے امتیازی خدوخال وضع کیے۔ لسانیاتی کے باطنی رشتوں پر ثقافتی عوامل کی بنیاد دوسری جنگِ عظیم کے بعد رکھی گئی، جس کی وجہ سیاسی اور معاشی حالات تھے۔ نظریہ سازوں نے یہ سوچا کہ امن و سکون سے اگر مختلف معاشروں کے ظاہری خدوخال کی بنیاد ہی تہہ نشین نسبت اور افتراق پر رکھ دی جائے تو شاید مستقبل میں جنگوں کی ضرورت محسوس نہیں کی جائے گی۔

سیوسئیر کا ''سگنیفائڈ'' حتمیت کی علامت تھا، رولاں بارتھ کی کتاب "مائیتھالوجی" بھی ''سگنیفائڈ'' کی حتمیت کی داعی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ معنی متعین شدہ ہیں۔ لسانیاتی بنیادوں پر اگر معنی حتمی ہے تو لسانیاتی ثقافتوں کی وضع کردہ شناختوں کو بھی حتمی تسلیم کرنا ضروری ہوگیا۔ اس خطرناک پہلو کا ادراک رولاں بارتھ کو بھی ہوگیا تھا۔ فرانس میں ۱۹۶۰ء میں ساختیاتی ماڈل کے انہدام کی وجہ بھی یہی تھی۔ رولاں بارتھ کے علاوہ لاکاں اور دریدا وغیرہ کو بھی اس نظریے میں مضمر تباہ کن عوامل کا احساس مکمل طور پر ہونے گیا تھا، جس کی وجہ سے انھوں نے انفرادی، ثقافتی اور ادبی سطح پر شناخت کے تصور کو ہی داؤ پر لگا دیا، تاہم اس سے پہلے ہی معاشی تقاضوں کی وجہ سے مغربی سامراج نے منڈیوں کی تلاش میں غریب ممالک پر یلغار کردی تھی۔ مغربی سیاسی حکمران پسِ ساختیات کے برعکس ساختیاتی فکر سے چمٹے رہے۔ انھوں نے اسے حتمی سمجھ کر ظلم و جبر کا جواز تلاش کرلیا۔ سماجی وثقافتی سطح پر لسانیاتی ماڈل نے محض جبر کو پروان چڑھایا، جبکہ ادبی سطح پر یہ اب بھی کارآمد ہے۔

پوسٹ ماڈرن ازم کی ثقافتی یا معاشرتی جہت سے اختلاف ممکن ہے، لیکن لسانیاتی ماڈل کو محض اس بناء پر اہلِ مشرق کالعدم قرار نہیں دے سکتے کہ یہ مغرب زدہ ہے۔ اگر اہلِ اُردو اس سائنسی نظریے کی بنیاد میں مغربی سماجی، سیاسی یا ثقافتی عنصر کا عمل دخل دیکھ کر اسے مسترد کرتے ہیں تو یقیناً انھیں نیوٹن کے کششِ ثقل کے نظریے کو بھی رد کرنا چاہیے۔ اس مثال سے یہ نتیجہ اخذ کرنا عبث ہوگا کہ ان دونوں سائنسی نظریات کو ایک ہی کلیے کے تحت پرکھا جائے، مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ سائنسی نظریات کی قبولیت یا استرداد کا عمل ہر طرح کے تعصب سے بالا معروضی قوانین کے تابع ہونا چاہیے۔ سائنسی نظریات دنیا کی کسی بھی لیبارٹری میں ایک ہی جیسے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ سیوسئر کی انقلاب آفریں دریافت یہی تھی کہ اس نے پہلے سے موجود زبان کے اصول وقواعد کو دریافت کیا، جو معنی کو ممکن بناتے تھے۔ اُردو بھی اپنی ایک ساخت رکھتی ہے۔ اس میں معنی کے امکانات کو واضح کرنے والے اصول وقواعد کو سیوسئر کے لسانیاتی نظریے کی رو سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں پر ثقافتی، سیاسی، معاشرتی یا پھر معاشی تضادات اور امکانات کی وجہ سے اُمید و یاسیت کا تعلق ہے تو اس کے لیے مخصوص تناظر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے اس مرحلے پر مباحث وتجزیات کے لیے راستے کھل جانے چاہیں نا کہ فتوے جاری کر کے اُمید و امکانات کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے جائیں۔ اہلِ اُردو کو تو ویسے بھی اس حکم کا پابند رہنا چاہیے کہ علم کی کھوج کے لیے خواہ چین بھی جانا پڑے تو ضرور جائیں۔

عرب فلاسفر اس حکم کی افادیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ کنڈی نے پلوٹینس کی کتاب Enneads کا ترجمہ ارسطو کی دینیات کے نام سے عربی میں شائع کیا۔ محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے سنسکرت زبان سے علمِ ریاضی اور علمِ ہئیت کا ترجمہ ۸۳۰ء میں عربی میں شائع کیا۔ ابنِ رشد نے ارسطو کی منطق اور مابعدالطبیعات کی تشریح کی (برٹرینڈ رسل، مغربی فلسفے کی تاریخ، ص،۴۲۲۔۴۱۳)۔ منطق، ریاضی، سائنس اور فلسفیانہ تحقیقات کو انھوں نے (آج کے قنوطی فکر کے حامی جعلی تخلیق کاروں کے برعکس) ''خیالات کی جگالی'' کبھی نہیں سمجھا تھا، بلکہ ان علوم کے حصول کو انھوں نے ذہن وتخیل کی وسعت اور انسانی عظمت کی معراج کا ذریعہ گردانا تھا۔ علوم کی درآمد کے اس

دور کو آج ہم لوگ فخر سے بیان کرتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ کو بھی بحیثیت ایک شارح کافی مشکلات پیش آئیں، جو ان کی طبیعت پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوئیں کہ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ'' بعض کرم فرما ہر کام میں کیڑے ڈالتے ہیں۔ یہ بھی مبارک کام ہے، لیکن کچھ لوگ سرے سے ہی ہاتھ اُٹھا دیتے ہیں کہ ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ یوں وہ اختلاف کرنے کے حق سے بھی خود کو محروم کر دیتے ہیں، کیونکہ اختلاف کرنے کے لیے بھی بات کا سمجھنا شرط ہے۔۔۔۔ ایسے لوگ اصلاً ہمدردی کے مستحق ہیں کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ اس سے نقصان ڈسکورس کا نہیں خود انھیں کا ہے'' (ص،۱۳۔۱۲)۔

تاریخِ انسانی کا کوئی بھی دور ہو نئی فکر کی مخالفت ہر عہد میں کسی نا کسی صورت میں ہوتی رہی ہے۔ کانٹ کا یہ کہنا درست ہے کہ'' بیشتر لوگ ہر تجدید کو اپنی مصلحتوں سے متصادم سمجھتے ہیں۔'' تاہم ارتقاء کا سفر اس طرح کے مزاحمتی خیالات کے باوجود جاری و ساری رہتا ہے۔ اس حقیقت کو کسی کتاب میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ معاشرتی وثقافتی حالتوں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

پوسٹ ماڈرن ازم عہدِ حاضر کی غالب تحریک ہے، جسے بعض مغربی نظریہ سازہائی ماڈرن ازم کا بحران بھی قرار دیتے ہیں، یہی زاویہ فکر میرے مقالے کا موضوع ہے جس کی تکمیل کے لیے میں یونیورسٹی آف سینٹرل انگلینڈ، برمنگھم سے منسلک ہوں۔ پوسٹ ماڈرن ازم میں برپا ہونے والے ادبی وتنقیدی نظریات کی تحقیق کے سلسلے میں مجھے اُردو میں متعارف کرائے گئے نظریات تک رسائی کا موقع ملا۔ کافی جستجو کے بعد میں گوپی چند نارنگ کے حوالے سے متذکرہ بالا حقائق تک پہنچا۔ اُردو میں ساختیاتی فکر کس طرح داخل ہوئی ہے؟ مجھے اُمید تھی کہ یہ ایک نیا زاویہ ہوگا۔ اُمید تھی کہ ہندوستانی اور پاکستانی معاشرے کی ضروریات اور ترجیحات کو سامنے رکھ کر کسی حد تک دفاعی حربہ اختیار کیا ہوگا۔، کیونکہ علوم کے حوالے سے مغرب پر سبقت کا خیال محض اب داستان پارینہ بن کر رہ گیا ہے۔ دفاع تو دور، گوپی چند کی وضاحتیں بھی مشکوک نکلیں۔ جوں جوں اُن کی کتاب کا مطالعہ کرتا رہا مایوسی بڑھتی رہی، کیونکہ کتاب میں کسی بھی سطح پر اور یجنیلیٹی کا فقدان تھا۔ مغربی نظریہ سازوں کے انتہائی پیچیدہ و دقیق افکار کی تفہیم کے بغیر حرف بہ حرف نارنگ صاحب نے بغیر کوئی حوالہ دیئے انھیں اپنے نام سے منسوب کر دیا ہے۔

مغربی درسگاہوں میں یہ روایت جڑیں پکڑ چکی ہے کہ اگر ہم کسی بھی نظریہ ساز کے اقتباس کو لفظ بہ لفظ قلم بند کریں تو کتاب کا ایڈیشن، پبلیشر کا نام اور صفحہ نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہوتا ہے۔ بصورتِ دیگر Plagiarism کے مرتکب کے خلاف ڈسپلینری ایکشن لیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں درسگاہ سے بے دخلی بھی ممکن ہوسکتی ہے۔ گوپی چند نارنگ کی کتاب میں سب سے بنیادی نقص یہ ہے کہ انھوں نے پوسٹ ماڈرن ازم کے حقیقی نظریہ سازوں، سیوسئر، لیوائی سٹراس، لاکاں، فوکو، دریدا اور بارتھ وغیرہ کے افکار تک براہِ راست رسائی حاصل نہیں کی بلکہ ان کے شارحین، رابرٹ سکولز، جوناتھن کلر، کیتھرین بیلسی، پیٹر بیری اور کرسٹوفر نورس کے تجزیات وافکار کو بغیر حوالہ دیئے لفظ بہ لفظ اپنے نام سے بیان کیا ہے۔ گوکہ انھوں نے چند جگہوں پر حوالے کے ساتھ اُردو اور انگریزی اقتباسات کو جوں کا توں نقل کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں دوسروں کے خیالات کی اہمیت کا احساس تھا۔

دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ''افکار وخیالات تو فلسفیوں اور نظریہ سازوں کے ہیں، تفہیم وترسیل البتہ میری ہے'' (ص ۱۴)۔ یہاں یہ واضح رہے کہ گوپی چند نارنگ نے مصادر میں کتب کی تفصیل دے رکھی ہے اور جہاں انھوں نے ضروری سمجھا صفحات کی تفصیل بھی رقم کی۔ جو تفصیل انھوں نے دے رکھی ہے اس مضمون میں انھیں فکری دیانت کی بناء پر نظر انداز کیا گیا ہے۔ اگر چند ایک اقتباسات لفظ بہ لفظ، مصادر میں بغیر صفحہ نمبر کی تفصیل کے تحریر کیے ہوتے تو شک کے فائدے کی بناء پر انھیں یقیناً نظر انداز کر دیا جاتا، لیکن اتنی اہم اغلاط کی پردہ پوشی کرنا اُردو ادب میں قائم شدہ روایت کو مزید طول دینے کے مترادف ہے، جو یقیناً قابلِ تحسین عمل نہیں ہے۔ اس مضمون میں میں نے گوپی چند نارنگ کے نقل کے رجحان کو عیاں کرنے کے علاوہ پوسٹ ماڈرن ازم کے حوالے سے ان کے فکری تضادات اور قباحتوں پر بھی مختصر بحث کی ہے۔ آیئے چند ایک اقتباسات پر غور کرتے ہیں۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں،

''اس سوسیئری تناظر سے ظاہر ہے کہ ادب کا وہ نظریہ جسے حقیقت نگاری کہتے ہیں، قابلِ مدافعت نہیں ہے۔ یہ دعویٰ کہ ادبی فارم حقیقت کا عکس پیش کرتی ہے، صرف تکرار بالمعنی، (Tautological) ہے۔ اگر حقیقت سے ہماری مراد وہ حقیقت ہے جس کا ہم تجربہ کرتے ہیں، یعنی جو تفریقی طور پر زبان کے ذریعے قائم ہوتی ہے تو یہ دعویٰ کہ 'حقیقت نگاری حقیقت کا عکس پیش کرتی ہے، دراصل یہ ہوا کہ، حقیقت نگاری اس دنیا کا عکس پیش کرتی ہے جو زبان کے ذریعے قائم ہوتی ہے' (Constructed in Language) ظاہر ہے یہ 'تکرار بالمعنی' (Tautology) کے سوا کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ (ص ۷۸)

کیتھرین بیلسی لکھتی ہے،

From this post-Saussurean perspective it is clear that the theory of literature as expressive realism is no longer tenable. The claim that a literary form reflects the world is simply tautological. If by 'the word' we understand the world we experience, the world differentiated by language, then the claim that realism reflects the world means that realism reflects the world constructed in language. This is a tautology................

(Belsey, Catherine. Critical Practice, London, Routledge, 2003, P,43)

گوپی چند نارنگ نے جو اقتباس درج کیا ہے اس میں سے بیلسی کے لفظ پوسٹ کو حذف کیا ہے جس سے بیلسی کا قائم کردہ معنی بھی متاثر ہوا ہے۔ تاہم اس کے صفحہ نمبر کا حوالہ کہیں نہیں ہے۔ دوسرا انھوں نے مندرجہ بالا اقتباس میں " تکرار بالمعنی" کو واوین میں لکھ کر یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ خاص اصطلاح کسی دوسرے نظریہ ساز سے ماخوذ ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ سارے کا سارا اقتباس جسے یہاں مختصراً پیش کیا گیا ہے بیلسی کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ مندرجہ بالا تجزیہ کیتھرین بیلسی کا ہے گوپی چند نارنگ کا نہیں ہے۔ مغرب میں بیلسی کی یہ کتاب ایک تعارفی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے، جو برطانیہ میں بی اے کے طلبہ کے لیے تنقیدی نظریات کا مختصر تعارف پیش کرتی ہے۔ یہاں قارئین کے لیے اس امر کا ادراک بھی ضروری ہے کہ گوپی چند نارنگ نے محض ایک ہی اقتباس کو نقل نہیں کیا بلکہ بیلسی کی اسی کتاب سے کئی اقتباسات لفظ بہ لفظ اپنے نام سے ترجمہ کیے ہیں۔ آیئے

ایک اور اقتباس پر توجہ مرکوز کریں،

''سیوسئر کی دلیل لفظوں کی ان کڑیوں پر مبنی ہے جو ایک تصور کے لیے مختلف زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ 'اگر لفظ ماقبل موجود تصورات کے لیے قائم' ہوتے تو ایک زبان سے دوسری زبان میں ان کے معنی متبادل پائے جاتے، لیکن ایسا نہیں ہے، (کورس ص، ۱۱۶) حقیقت یہ ہے کہ مختلف زبانیں دنیا کی چیزوں کو مختلف طور پر دیکھتی اور ظاہر کرتی ہیں۔ سیوسئر نے کئی مثالیں دی ہیں۔ فرانسیسی میں ایک لفظ ہے Mouton اس کے برعکس انگریزی اس کے متبادل Mutton اور Sheep میں فرق کرتی ہے' (گوپی چند نارنگ، ص، ۶۸)۔

اب بیلسی کی طرف رجوع کرتے ہیں،

Saussure's argument depends on the different division of the chain of meaning in different languages. ' If words stood for pre-existing concepts' they would all have exact equivalents in meaning from one language to the next; but this is not true' (Saussure, 1974: 116). The truth is that different languages divide or articulate the world in different worlds. Saussure gives a number of examples. For instance, where French has the single mouton, English differentiates between mutton, which we eat, and sheep.............(Belsey, 36-37).

طوالت کے باعث اس اقتباس کو بھی مختصر رکھا گیا ہے، تاہم انتہائی قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ بیلسی نے اپنے تجزیے میں سیوسئر کی کتاب سے لیے گئے حوالے کو بشمول صفحہ نمبر پیش کیا ہے، جبکہ گوپی چند نارنگ نے یہ تاثر قائم کیا ہے کہ سیوسئر کا حوالہ انھوں نے بیلسی کی کتاب سے اخذ نہیں کیا بلکہ انھوں نے سیوسئر کا براہِ راست مطالعہ کیا ہے، یہ ادبی بددیانتی کی واضح مثال ہے۔ گوپی چند نارنگ کے مندرجہ ذیل اقتباس کو دیکھئے،

''انیسویں صدی کے نصفِ آخر اور بیسویں صدی نصفِ اوّل میں فکرِ انسانی تخصیص کے مختلف میدانوں میں بٹ بٹا کر اس حد تک پارہ پارہ ہوگئی تھی کہ اس میں کسی طرح کی کوئی شیرازہ بندی ممکن نظر نہیں آتی تھی۔ اور تو اور خالص فلسفہ بھی جسے علومِ انسانیہ کا بادشاہ کہا جاتا ہے، وہ بھی لفظوں کے الگ تھلگ پڑ جانے والے کھیل میں لگ چکا تھا۔ وٹگنسٹائن کا فلسفہ لسان ہو یا یورپی مفکرین کی وجودیت، اصلاً یہ سب مراجعت کے فلسفے ہیں۔ (ص، ۳۴)۔

آیئے انگریزی میں رابرٹ سکولز کے اس اقتباس پر غور کریں،

The last half of the nineteenth century and the last half of the twentieth were charecterized by the fragmentation of knowledge into isolated disciplines so formidable in their specialization as to seem beyond all synthesis. Even philosophy, the queen of the human sciences, came down from her throne to play solitary word games. Both the language-philosophy of Wittgenstein and the existentialism of the Continental thinkers are philosophy of retreat.........

(Scholes, Robert. Structuralism in Literature, New York, Vail-Ballou Press, p,1)

رابرٹ سکولز کی مذکورہ بالا کتاب سے گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب کے کئی ابتدائی صفحات نقل کیے ہیں

۔مصادر میں گو کہ اس کتاب کا نام درج ہے لیکن سوال تو لفظ بہ لفظ ترجمے کا ہے، کیونکہ محض ترجمہ کرنے سے کوئی بھی لکھنے والا خود کو مصنف کہلوانے میں حق بجانب نہیں ہوسکتا۔ رابرٹ سکولز نے اس کتاب میں ساختیات کی حمایت میں لکھا ہے ۔ یہ ان کا تجزیہ ہے جسے مدلل طریقے سے مسترد بھی کیا جاسکتا ہے۔ اُنیسویں اور بیسویں صدی کے سماجی، سیاسی یا پھر معاشی کشمکش کے نتیجے میں نظریات کی تخریب اور تشکیل کا جو تجزیہ انھوں نے پیش کیا ہے یہ ان کے مکتبہءِ فکر کا نکتہءِ نظر ہے۔ ریڈیکل مارکسی مفکرین اس اجتماعی تناظر کی مختلف طرز پر تشریح و تجزیہ پیش کرتے ہیں ، جو پوسٹ ماڈرن تھیوری کے حوالے سے مضبوط بھی ہے اور موئثر بھی، لیکن سوال یہ ہے کہ گوپی چند نارنگ کہاں کھڑے دکھائی دیتے ہیں؟ آیئے گوپی چند نارنگ کی کتاب سے ایک اور اقتباس پر غور کریں،

’’دریدا فلسفے کو بحیثیت ضابطہ علم یہ آمرانہ درجہ دینے کو تیار نہیں کہ فکرِ انسانی کے جملہ حقوق فلسفے کے نام محفوظ کر دیے جائیں۔اس کا دعویٰ ہے کہ فلاسفہ اپنے نظام ہائے فکر کو مسلط کرنے کے لیے زبان کے داخلی تضادات کو دباتے، پسِ پشت ڈالتے یا نظر انداز کرتے رہے ہیں۔۔۔۔۔(ص،۲۱۸۔۲۱۷)

کرسٹوفر نورس انگریزی میں لکھتے ہیں،

Derrida refuses to grant philosophy the kind of privileged status it has always claimed as the sovereign dispenser of reason. Derrida confronts this pre-emptive claim on its own chosen grounds. He argues that philosophers have been able to impose their various systems of thought only by ignoring, suppressing, the disruptive effects of languages.........
(Norris, Christopher. Deconstruction.3rd ed, London, Routledge,2002, P18-19)

گوپی چند نارنگ کی کتاب میں دریدا اور ردِ تشکیل پر زیادہ تر مواد کرسٹوفر نورس کی کتاب کا ہو بہو ترجمہ ہے ۔مضمون کی طوالت کے پیشِ نظر یہاں اقتباسات، جو کہ بے شمار ہیں، دینے سے گریز کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا حوالہ جات کے علاوہ روسی ہئیت پسندی پر لکھے گئے باب کا بیشتر حصہ جوناتھن کلر کی Strucuralist Poetics سے نقل کیا گیا ہے ۔طریقہءِ کار یہ تھا کہ گوپی چند نارنگ براہِ راست اصل کتابوں سے استفادہ کرتے اور جہاں کہیں فقروں کو لفظ بہ لفظ نقل کرتے وہاں حوالہ درج کرتے ۔ ایسا عمل یقیناً اُردو سے وابستہ نئی نسل کے لیے ایک اچھی مثال کے ساتھ ساتھ اُمید افزا بھی ہوتا ۔کتاب کا وہ حصہ جو مشرقی شعریات پر مبنی ہے وہ میری تحقیق کا قطعاً موضوع نہیں تھا۔ اس لیے وہ حصہ اس مضمون کی بحث سے خارج ہے۔اس مضمون میں کتاب کے مآخذات کا انکشاف کر کے ایک رجحان تشکیل دے دیا گیا ہے اب اگر اُردو سے وابستہ محققین مشرقی شعریات والے حصے کو بھی زیرِ تحقیق لانا چاہیں تو شاید مزید انکشافات ممکن ہوسکیں۔

برصغیر پاک و ہند کے دانشوروں نے مشرقی انسان کو ذرات کی محض انفعالی تجسیم تصور کیا ہے جو مغرب زدہ نظریاتی و فکری دلدل میں پھنس کر اس کی قوت کی شدّت کو زیر کرنے کے لیے فکری سطح پر اپنا نظریہ تخلیق نہیں کرتا جو مغربی نظریے کی مزاحمت کرے (مخالفت نہیں)، مشرقی خود ساختہ دانشور مغربی فکر میں اترتے ہی غرقاب ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتا ہے۔ وہ مزاحمت کی بجائے اسی کی حرکت کی سمت میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

آج شناخت متعین کرنے والے عوامل اس کے لیے مسئلہ ہی نہیں رہے۔ وہ اس حد تک ذہنی کشمکش کا شکار ہے کہ نعرہ تو روایت کا بلند کرتا ہے اور بہتا پوسٹ ماڈرن ازم کی رو میں ہے۔ بات مذہبی آئیڈیالوجی کی کرتا ہے اور کچلا شدّتِ خواہش کے تحت جاتا ہے، علَم آزادیءِ فکر کا بلند کرتا ہے لیکن تخیل پر غلامی بھی خود ہی مسلط کرتا ہے۔ جینا مستقبل میں چاہتا ہے زندگی کی تلاش ماضی بعید کے دھندلکوں میں کرتا ہے۔ "اصل" کے مسائل کو ترک کر کے "دوسرے" کی تلاش میں چل نکلا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھ رہا کہ "دوسرے" کا ظہور مغربی تاریخ کے ایک خاص وقت پر ہوا ہے۔ گوپی چند نارنگ کو بھی مغرب میں Jazz کی دھن پر کشش محسوس ہوتی ہے لیکن ہندوستان میں غیر انسانی جرائم کا ارتکاب متحرک نہیں کرتا۔ برطانیہ میں اسّی کی دہائی میں تیار شدہ جوتوں کا سرخ رنگ ضرور متاثر کرتا ہے جو پوسٹ ماڈرن ازم کا جزوِ لازم ہے، لیکن ہندوستان میں اقلیتوں پر مسلط کی گئی برسوں پرانی کتھا جو آج بھی پورے تعصب سے دہرائی جاتی ہے، نارنگ صاحب کی توجہ کا مرکز نہیں بنتی ۔ برصغیر پاک و ہند کے ساٹھ کروڑ عوام خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں اور دنیا کا پچاسی فیصد سرمایہ چار سو نوے خاندانوں کے پاس مرتکز ہے یہ سب کچھ برصغیر کے دانشور کو آج بھی نظر نہیں آتا۔ ویسے مارکس نے دولت کے اس ارتکاز کی پیشین گوئی اُنیسویں صدی کے آغاز میں کمیونسٹ مینی فیسٹو میں کر دی تھی۔ اگر یہی پوسٹ ماڈرن ازم کا ماحصل ہے تو پھر مارکس ہی سب سے بڑا پوسٹ ماڈرنسٹ کہلوانے کا مستحق ہے اور اس کے ساتھ وہ افلاس زدہ عوام بھی پوسٹ ماڈرنسٹ ہیں جو مارکس کی پیشین گوئی کی سچائی کا مواد ہیں۔ یہاں پر سوال یہ ہے کہ کیا ’ازم‘ محض چند افراد کی سرگرمی پر محیط ہے؟

مابعد جدیدیت کے حوالے سے گوپی چند نارنگ نے جن نکات پر گفتگو کی ہے وہ تضادات سے پُر نظر آتے ہیں، جن کا اظہار مذکورہ کتاب کے علاوہ ان کی دوسری مرتب کردہ کتاب (اُردو مابعد جدیدیت پر مقالمہ،۲۰۰۰) میں بھی کیا گیا ہے۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے واضح ہے کہ اس میں اُردو ادب میں برپا ہونے والی تبدیلیوں کو اس کے اپنے سیاسی، معاشی، سماجی اور ثقافتی پسِ منظر میں بیان کیا جانا چاہیے تھا، لیکن اس کتاب میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ گوپی چند نارنگ نے ادبی و ثقافتی سطح پر عالمی منظر نامے کی اہمیت پر زور دیا ہے، جس سے ان کی مراد مغربی منظر نامہ ہے، جو یقیناً مغربی آئیڈیالوجی کا مظہر ہے جس نے نہ صرف مغربی معاشرے، بلکہ تیسری دنیا کے ممالک میں پائے جانے والے انگنت تضادات کو دبا رکھا ہے۔ ایسا کرنے سے اُردو ادب کے اپنے پسِ منظر میں جنم لینے والے حقیقی مسائل بھی دبے رہیں گے۔

کتاب میں بعض جگہوں پر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گوپی چند نارنگ ارادتاً اپنے مسائل کی پردہ پوشی میں مصروف ہیں۔ دوسری صورت میں اُنھیں شاید مسائل یا ڈسکورس کا ادراک و شعور نہیں ہے۔ مثلاً جیسے وہ اپنی کتاب ’’ساختیات پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات‘‘ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ’’متن ہرگز خود مختار و خود کفیل نہیں ہے کیونکہ اخذِ معنی کا عمل غیر مختتم ہے‘‘ (ص۱۱)۔ نارنگ صاحب سے یہاں یہ غلطی سرزد ہوئی ہے کہ وہ اخذِ معنی کو متن سے باہر دیکھ رہے ہیں۔ دریدا کے مطابق اخذِ معنی کا عمل متن سے باہر قطعاً نہیں ہے۔ اسی کتاب کے چوتھے باب میں جو ’’ردِ تشکیل‘‘ کے نام سے لکھا گیا ہے اس میں موصوف لکھتے ہیں ’’دریدا کا کہنا ہے معنی کوئی ماورائی موجودگی

نہیں ہے جو متن سے ورے، قریب یا دور وجود رکھتی ہو اور جس کو نقاد ڈھونڈ نکالے۔ معنی متن کے اندر ہے اور جیسے ہی متن تحریر ہوتا ہے وہ اپنی ردِ تشکیل کا بیج بو دیتا ہے'' (ص ۲۳۲)۔

گوپی چند نارنگ کے مندرجہ بالا دونوں بیانات میں واضح تضاد ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُنھیں مابعد جدید تھیوری کی تفہیم کی مزید ضرورت ہے، بالخصوص دریدا کی ''ردِ تشکیل'' کی۔ دریدا واضح طور پر Of Grammatology میں کہتا ہے کہ

There is nothing outside the text (p227).

اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ جونہی متن وجود میں آتا ہے، اس کی حیثیت خود مختار ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد معنی کے اخذ ہونے کے عمل کا انحصار متن پر ہوتا ہے نہ کہ خارجی دنیا پر۔ ردِ تشکیل کے عمل کے دوران متن خود کو سائنسی بنیادوں پر Deconstruct کرنے کا مکمل طور پر اہل ہوتا ہے۔ بہر حال اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گوپی چند نارنگ پوسٹ ماڈرن تھیوری کی تفہیم سے عاری ہیں۔

مغربی مابعد جدیدیت کی حتمیت کو تسلیم کرنا اس کی مرکزیت کو قائم کرنے کے مترادف ہے، جو مابعد جدیدیت کی اپنی روح کے بھی منافی ہے۔ کہیں کہیں یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ گوپی چند نارنگ کو اپنے معاشرے کی اہمیت کا احساس بھی جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کیفیت میں وہ لکھتے ہیں کہ ''دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ تمام معاشروں اور ثقافتوں کو نئے چیلنج اور نئی تبدیلیوں کا سامنا ہے۔ ہم بھی نئے حالات اور نئے مسائل سے دوچار ہیں، اور انھی کی رعایت سے علومِ انسانیہ اور ادب اور آرٹ میں نئی سوچ اور نئے رویے سامنے آرہے ہیں، ظاہر ہے کہ اُردو کی ہماری ادبی فکر، ہمارے اپنے چیلنج اور ہماری اپنی ضرورتوں کی رو سے ہوگی'' (ص ۱۳)۔ وہ نئے حالات اور ضروریات کیا ہیں، ؟ ان کی طرف مکمل توجہ کی ضرورت تھی، لیکن اُنھوں نے محض بیان جاری کیا ہے، ڈسکورس کی تشکیل نہیں کی۔

اس پیراگراف اور کتاب کے بقیہ صفحات میں درج مواد کا تضاد اس امر کا داعی ہے کہ اہلِ اُردو کو محض تسلی کے چند کلمات سنائے جاتے ہیں۔ تبدیلی کی نوعیت اور تقاضے مخصوص ثقافت اور سماج کے بطن سے جنم لیتے ہیں جس کے پس منظر میں انگنت عوامل عمل آراء ہوتے ہیں، جن کی تلاش و تجزیہ نظریہ سازوں کا کام ہے۔ اس کے برعکس اُردو ادب اور ہندوستانی معاشرے میں پائے جانے والی تبدیلی کی خبر گوپی چند نارنگ کو فریڈرک جیمسن یا لیوٹارڈ کی بدولت ہوئی ہے اور اس خبر کے بعد جس ڈسکورس کی تشریح ہو رہی ہے، وہ مغربی تشکیل ہے۔ زبان اور سوچ الگ نہیں ہیں، جیسا کہ بیلسی کہتی ہے کہ '' زبان اور سوچ کا تعلق نئے معنی اور دنیا کے تجزیے کے نئے طریقوں کی وضاحت کرتا ہے، جو طریقہ ہائے کار وضع ہو جاتا ہے معنی اسی کے اندر قائم ہوتا ہے۔ نئے معنی قائم کرنے کے لیے، زبان اور سوچ کے تعلق کو تبدیل کرنا ہوگا۔'' جس کے لیے ایک نئے ڈسکورس کی ضرورت ہے جو پاک و ہند کے یکساں اور متضاد مفادات سے تشکیل پائے۔ فریڈرک جیمسن کی نظر سے دیکھنے سے اسی کا لفظ اور معنی ایک مخصوص تناظر اور ''ساخت'' میں خود کا اظہار کرے گا۔ گوپی چند نارنگ چونکہ مختلف تناظر میں ہیں، اس لئے بھی انھیں مابعد جدیدیت کی رو سے اپنا ڈسکورس تشکیل دینا پڑے گا۔

دوسرا نکتہ جس کا سرسری طور پر ذکر کیا گیا ہے وہ مابعد جدیدیت کو تسلیم کر کے مغرب کی مرکزیت کو تسلیم کرنا ہے، یعنی مابعد جدیدیت کو آفاقیت عطا کر دی جائے، جو کہ خود آفاقیت کے خلاف ہے۔ گوپی چند نارنگ نے 'مابعد جدیدیت، بعد از جدیدیت، بعد جدیدیت، پسِ جدیدیت' (ص ۹۲)۔ جیسی اصطلاحیں مغربی پوسٹ ماڈرن مفکروں کی اندھی تقلید میں استعمال کر کے مابعد جدیدیت کو آفاقیت عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا کرنے سے وہ مابعد جدیدیت کی وضع کردہ اصطلاحوں سے مکمل طور پر انحراف کر رہے ہیں۔ اپنے ایک مضمون ''مابعد جدیدیت عالمی تناظر میں'' وہ لکھتے ہیں کہ ''مابعد جدیدیت تھیوری سے زیادہ صورتحال ہے، یعنی جدید معاشرے کی تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی حالت، نئے معاشرے کا مزاج، مسائل، ذہنی رویے یا معاشرتی و ثقافتی فضا یا کلچر کی تبدیلی، جو کرائسس کا درجہ رکھتے ہیں'' (ص ۱۹)۔ مزید لکھتے ہیں کہ ''ہم میں بہت سے، سابقہ مفروضات کے اسیر ہیں اور ان سے ہاتھ اُٹھانے کو تیار نہیں، اس لیے نئے قضایا نے جو نئی روشنی دی ہے، اس کو اکثر لوگ دیکھ ہی نہیں پاتے۔''

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات کو بنظرِ غور دیکھیں تو تضادات کھل کر سامنے آجائیں گے۔ ایک طرف مابعد جدیدیت انھیں روشنی کا منبع دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف خود ہی اسے کرائسس بھی سمجھتے ہیں، جو حقیقت میں کرائسس ہی ہے۔ اہلِ اُردو کا تو المیہ ہی یہ رہا ہے کہ انھیں 'روشنی' اپنی سرحدوں سے باہر ہی دکھائی دیتی ہے۔ مغرب کی مرکزیت نہ صرف مابعد جدیدیت کے حوالے سے، بلکہ اُردو میں جدیدیت کی بناء پر بھی مسلّم ہے اس طرح ترقی پسندی جس کا مارکسیت کی حقیقی روح سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ جو صرف کم علمی کا نتیجہ تھی۔ اس نے بھی اپنی مرکزیت کو پاک و ہند سے باہر تلاش کیا۔ مابعد جدیدیت ہو، جدیدیت یا پھر ترقی پسندی، یہاں پر ان کی مخالفت مقصود نہیں ہے، بلکہ مخالفت کو تخلیقی اور اختراعی جہت پر استوار کرنا ہے۔

ہیگلیائی مارکسی مفکر فریڈرک جیمسن مابعد جدیدیت پر کاری ضرب لگاتا ہے، جبکہ دوسری طرف وہ 'عظیم نظریات' کے لاشعور کی تہوں میں چلے جانے کا داعی ہے۔ امریکی یا یورپی معاشرے کے حوالے سے بھی اس امر پر بحث کی خاصی گنجائش موجود ہے، جبکہ پاکستان یا ہندوستان میں 'عظیم نظریات' (اسلام، ہندوازم، مارکسیت وغیرہ) کی گمشدگی کا اعلان سراسر دروغ گوئی پر مبنی ہے۔ نظریاتی مباحث میں کوئی قباحت نہیں ہے، تاہم عملی سطح پر انگنت تضادات ہیں۔ ہندوستان میں حالیہ برسوں میں مذہبی انتہا پسند جماعت 'بھارتیہ جنتا پارٹی' کے کارناموں کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب میں سکھوں اور گجرات میں مسلمانوں کے قتلِ عام کو کیا نام دیا جائے گا؟ دوسری جانب اسلامی انتہا پسندی بھی عروج پر ہے۔ مغرب میں بھی آنکھیں بند کر کے مابعد جدیدیت کی Whole Sale تبدیلی کا دعویٰ جھوٹ پر مبنی ہے۔ ٹیری ایگلٹن کو آکسفورڈ یونیورسٹی سے اس کے نظریات کی بدولت ہی فارغ کیا گیا۔ عملی سطح پر انتہا پسندی اور نظریاتی سطح پر مابعد جدید مباحث۔ تضادات کتنے واضح ہیں! پاکستان یا ہندوستان کے حوالے سے 'عظیم نظریات' کے انہدام کا دعویٰ قطعاً غلط ہے۔ گوپی چند نارنگ کے فکری تضادات کو دیکھ کر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ اُن میں لاکاں کی اصطلاح میں شعور، زبان کے علامتی نظام کی شکل میں، جبکہ لاشعور امیجنری کے روپ میں، بیک وقت عمل آراء ہو رہے ہیں۔ ایک اور جگہ پر کہتے ہیں، ''مارکسزم کی آزاد تعبیروں اور

سوشل ازم کی معنویت ختم ہوگئی ہے ایسا بھی نہیں، بلکہ یہ معنویت آج کی دنیا میں بالخصوص تیسری دنیا کے مما لک میں اور ہندوستان میں پہلے سے زیادہ ہے'' (ص،۸۷)۔اگر زیادہ ہے تو یہ بوجھ اُنھوں نے کس کے کندھے پر رکھا ہے؟ مندرجہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں انھوں نے ادبی سے زیادہ معاشرتی اور سیاسی جہت کی طرف اشارہ کیا ہے۔محض اشارہ کر دینا ہی کافی نہیں، بلکہ اس کی مختلف اور نئی تعبیروں سے نظریاتی اور عملی سطح میں مطابقت قائم کرنا ہے۔گوپی چند کا لہجہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اُنھیں کسی نظریے سے کوئی مخالفت نہیں، بلکہ وہ تو آزاد فکر انسان ہیں۔ یہ کہنے کے بعد وہ پھر مابعد جدیدیت کی جانب ہی لوٹتے ہیں۔اگر ہندوستانی یا پاکستانی معاشرے میں ماضی کی نسبت امتیازات قائم ہو بھی چکے ہیں تو اُنھیں مغربی مابعد جدیدیت کے جھنڈے تلے ہی نشان زدکیوں کیا جائے، تاہم یہ واضح رہے کہ مارکسزم تشریح اور تعبیر کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک عملی سرگرمی ہے۔نظریہ سازوں کا حقیقی مقصد نظریے اور عمل میں ہم آہنگی قائم کرنا ہے۔جیسا کہ ایلن ووڈز لکھتا ہے کہ

Marxism is not an academic exercise.

گوپی چند نارنگ ایک پڑھے لکھے انسان ہیں اور ثقافتی وسماجی نقاد کے برعکس ادبی نقاد ہیں۔دوسری طرف ہندوستانی عوام کی اکثریت تمام تر حیاتیاتی افتراق کے باوجود انسانوں کے زمرے میں ہی آتی ہے۔ایک غریب انسان کی فکری پرواز اس کی معاشی اور سماجی ترجیحات کے جبر تلے آ کر معذور ہو چکی ہوتی ہے۔وہ اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ تصورات کی تشکیل کر سکے۔مابعد جدیدیت جس طریقے سے اہلِ اُردو میں متعارف کرائی جا رہی ہے، یہ اس فرق کو دوام عطا کرنے کی ایک کوشش ہے، جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ جاہل اور عالم، امیر اور غریب، رجائی اور قدامت پسند اور برہمن اور شودر کے درمیان پائی جانے والی تفاوت کو ختم کیا جائے یا پھر اسے رولاں بارتھ کی ''مائیتھالوجی'' میں تشکیل کردہ ثقافتی تہوں کی حتمیت کو قبول کر کے قومی شناخت کا مظہر قرار دے دیا جائے۔یعنی ہندوستان میں برہمن اور شودر کے درمیان تفاوت کو ہندوستانی ثقافت کا جزوِ لاینفک قرار دے کر مابعد جدیدیت کی تقلید میں حتمی شناخت عطا کر دی جائے۔بصورتِ دیگر اگر گوپی چند نارنگ اس صورتحال کا ادراک رکھتے ہیں تو نظریہ سازی کا عمل ممکن ہو سکتا ہے۔

طاقتور ملک کمزور ملک کا اسی طرح ذہنی و مادی استحصال کرتا ہے، جس طرح کمزور ملک کا حاکم اپنے ہی ملک کے کمزور عوام کا کرتا ہے۔ موافقت اور ہم آہنگی دونوں سطحوں پر ضروری ہے، کیونکہ یہ انصاف کا تقاضا ہے اور مابعد جدیدیت کی واحد مبنی بر موافقت قدر 'انصاف' ہی ہے، جس کی حمایت کرنا اور اسے مرکزیت عطا کرنا اس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ لیوٹارڈ کے پاس کہنے کو کچھ اور نہیں تھا اور وہ نٹشے کا ہم خیال بھی نہیں بننا چاہتا تھا۔

پاک و ہند کے پس منظر میں مابعد جدیدیت کے حوالے سے تھیوری کی تشکیل کس طرح کی جائے؟ آیئے دو مابعد جدید مفکروں کے متخالف نظریات پر غور کرتے ہیں۔ہیبر ماس مغربی معاشرتی زندگی کو ٹکروں میں بٹا ہوا دیکھتا ہے۔اس کے نزدیک سائنس، تکنیک، فن اور سیاست جیسے شعبوں میں بھی وسیع خلیج حائل ہو چکی ہے۔اس نے ان ٹکڑوں میں وحدت قائم کرنے کے لیے 'ابلاغی نظریے' کو متعارف کرایا۔ہیبر ماس کلیت پسندی پر یقین رکھتا ہے

اور دوسری طرف عقل کا بھی مخالف ہے اس کے نزدیک ذہن عقلیت کا منبع نہیں ہے، اس کے برعکس ابلاغ کی قابلیت ہے، جس کو بنیاد بنا کر وہ مختلف شعبوں میں موافقت قائم کرنا چاہتا ہے۔ہیبر ماس کے نزدیک تھیوری کا کام ان شرائط کو متعین کرنا ہے، جن کی بنیاد پر حقیقی ابلاغ ممکن ہو سکے۔ہیبر ماس کے 'ابلاغی نظریے' میں فن کا کردار اہم ہے، جس کا مقصد کلیت پسند فلسفوں کی پیدا کی ہوئی 'نجات' کی خواہش کو عملی جامہ پہنانا ہے۔یہ ہے مابعد جدیدیت سے نمٹنے کا طریقۂ کار، جو ہیبر ماس کا تخلیق کردہ ہے۔دوسری طرف لیوٹارڈ لسانیاتی چالوں کے ساتھ طاقت کا رشتہ جوڑ کر بٹی ہوئی لسانیاتی چالوں کو باطنی طور پر عمل آراء دیکھتا ہے، جو ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔لسانیاتی چالیں مختلف اداروں سمیت ہر جگہ عمل آراء ہیں۔انھی کی بنیاد پر اصول وقواعد وضع کر کے مخالف اور کمزور آوازوں کو خاموش کر دیا جاتا ہے۔یعنی طاقت کا اصول ہر جگہ متحرک ہے۔تاہم وہ ہیبر ماس کے برعکس فن کی علویت کو پانے کی صلاحیت پر یقین کرتے ہوئے ہیگلیائی اور کسی قدر ہیبر ماس کی کلیت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔وہ اپنے مضمون What is Postmodernism میں ہیبر ماس کی سماجی وثقافتی نامیاتی وحدت کا مزاق اُڑاتا ہے۔وہ فن سے کلیت کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کرنے کا متقضی ہے۔مقصود یہاں ہیبر ماس یا لیوٹارڈ کے طریقہ ہائے کار کی وکالت کرنا نہیں ہے، کیونکہ عملی فلسفیانہ نکتۂ نظر سے ان کے طریقۂ کار میں بھی نقائص پائے جاتے ہیں۔ یہاں پر اس نکتے کی وضاحت کرنا ہے کہ اہلِ اُردو بالخصوص گوپی چند نارنگ نے مغربی مابعد جدیدیت اور ہندوستانی معاشی، سیاسی اور سماجی صورتحال میں کیا تضادات دیکھے ہیں یا پھر وہ ہندوستان اور امریکی معاشرے میں کوئی فرق ہی نہیں سمجھتے۔کیا ہندوستان کے انگنت داخلی تضادات اور پھر عالمی سطح پر اس کی ترجیحات وتلازمات کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے ہی کسی طریقۂ کار کی توقع گوپی چند نارنگ سے کی جا سکتی ہے؟

فرانسیسی فلسفی مشل فوکو مابعد جدید مفکر ہے جو مارکسی اقدار کا بھی قائل ہے اور اسے سرمایہ داری ہی کی طرح طاقت کا سرچشمہ بھی گردانتا ہے۔اس کے نزدیک طاقت کا مرکز صرف ریاست، فوج یا پولیس ہی نہیں ہے، بلکہ سماجی گروہ، مختلف ڈسکورس کو وضع کر کے اپنی آئیڈیالوجی پر مبنی معنی کا قیام عمل میں لا سکتے ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مزاحمتی طریقۂ کار کو اپنایا جائے۔مغربی ڈسکورس میں یہی خیالات مابعد جدیدیت کی حقیقی روح ہیں۔یعنی macro-narrative نہیں بلکہ micro-narrative۔اقلیتیں اپنے حقوق مانگیں نہیں، بلکہ چھین لیں۔وہ ملکی نظام میں اصلاحات کی خواہش نہ کریں، بلکہ مزاحمتی طریقۂ کار اختیار کریں، فوکو سرعام سماجی گروپوں کی حمایت میں نکلتا تھا۔اس کے مزاحمتی فلسفے کو بنیاد بنا کر ہم جنس پرستوں نے مغربی معاشرے میں اپنی شناخت کو قائم کیا۔سرمایہ داری منطق کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان مزاحمتوں کے مدِمقابل اپنی مزاحمت قائم کر کے اپنی توانائی کو ضائع نہ کرے۔اس سارے عمل کو سامنے رکھتے ہوئے سرمایہ داری نظام کے اندر انقلابیت کے مستقل ہونے کو تسلیم کر لیا گیا، جبکہ حقیقت میں ان گروپوں کے مفادات کو معاشی مفادات کے تابع کر کے کنٹرول کرنے کا اک نیا ذریعہ دریافت کر لیا گیا۔ہندوستان اپنے داخلی تضادات کی وجہ سے بدترین صورتحال سے دوچار ہے۔کیا گوپی چند نارنگ بحیثیت پوسٹ ماڈرن مفکر، ہندوستان میں مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کے ساتھ کھڑے ہو کر ان کی

الگ شناخت قائم کرنے کا بیڑا اُٹھا سکتے ہیں؟ کیا وہ بحیثیت مابعد جدید مفکر اُنھیں ہندوستان میں اقلیتوں کو مزاحمتی فلسفہ اپنانے کا درس دے سکتے ہیں؟ ہندوستان میں اکثریت کی رسائی ہی ان مزاحمتی فلسفوں تک نہیں ہو پاتی۔ جن افراد کی رسائی ان تک ممکن ہوتی ہے ان کے اذہان پہلے ہی کئی طرح کی فکری پراگندگی کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں۔ جو کمی رہ جاتی ہے اسے برہمن ازم کی غیر انسانی آئیڈیالوجی سے پورا کر دیا جاتا ہے۔ ثقافتی عوامل کو آئیڈیالوجی سے کچلا جاتا ہے۔ اور دعوے اس طرح کے کیے جاتے ہیں کہ آئیڈیالوجی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ رولاں بارتھ کی "متھ" مارکس کا بیان کردہ بورژوا تصورِ آئیڈیالوجی، مشرقی مذہبیت و توہم پرستانہ روایتِ تصوف ابھی بھی مغربی اور مشرقی معاشرے میں ظاہری و باطنی سطح پر متحرک ہیں۔ وہ اپنے جبری تفاعل سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ ان کی تدفین کا محض غلط تاثر قائم کر دیا جائے؟ اگر نہیں تو پھر کس آئیڈیالوجی کا خاتمہ مقصود ہے؟ اگر آئیڈیالوجی ابھی زندہ ہے تو سماجی سطح پر مابعد جدیدیت کیسی؟ ٹیری ایگلٹن کا یہ کہنا درست ہے،

A dominant power may legitimate itself by promoting beliefs and values congenial to it; naturalising and universalising such beliefs so as to render them self-evident and apparently inevitable; denigrating ideas which might challenge it, excluding rival forms of thought, perhaps by some but systematic logic; and obscuring social reality......(Ideology, p5)

ہندوستان میں کئی تحریکیں اسی کی زد میں آ کر دم توڑ رہی ہیں۔ دوسری طرف کئی محازوں پر مزاحمتیں بڑھ رہی ہیں، لہٰذا دانشوروں کو چاہیے کہ صدیوں سے قائم شدہ 'معنی' کے نیچے دبے ہوئے معنی کے ظہور کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے یقیناً ایک الگ عملی ڈسکورس کی ضرورت ہے۔ Bakhtin کے نکتۂ نظر سے وہ خارجیت سے تشکیل پائی ہوئی زبان سے جنم لے۔

عہدِ حاضر کا سب سے اہم مسئلہ مشرق اور مغرب کے مابین اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے بین الاقوامی ڈائیلاگ کی ضرورت ہے جس کی تکمیل مشرق کو عالمی ایجنڈے سے حذف کر کے ممکن نہیں بلکہ بحیثیت اہم فریق اس کی شمولیت ضروری ہے۔ اس شمولیت کو بامعنی اسی صورت بنایا جا سکتا ہے جب مغربی نظریات کی تہہ میں پیوست عوامل کی تفہیم کر کے انھیں مشرقی ثقافتی، سماجی، سیاسی اور معاشی صورتِ حال کے مدمقابل رکھ کر جانچا جائے۔ اس تقابل کے دوران جہاں مشرق و مغرب کی صورتِ حال کے مابین تضادات ظاہر ہوں انھیں اپنے مفادات کی روشنی میں نظریانہ چاہیے۔ لیوٹارڈ نے تکنیکی عہد میں علوم کی صورت پزیری کا نظریہ یورپی اور امریکی سیاسی، معاشی اور سائنسی صورتِ حال کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے، جیسا کہ وہ خود اپنی کتاب 'مابعد جدیدیت علم پر ایک رپورٹ' کے تعارف میں کہتا ہے کہ،

The text that fallows is an occasional one. It is a report on knowledge in the most highly developed societies......

پاکستان یا ہندوستان کس حد تک ترقی یافتہ ممالک کے صف میں شمار ہوتے ہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم مابعد جدیدیت کا لفظ بہ لفظ پاکستان یا ہندوستان کی صورتِ حال پر اطلاق کہاں کی دانشوری ہے۔ مابعد

جدیدیت مغربی ثقافتی حالت ہے، جو بحران کی عکاس ہے۔ یہ کوئی آسمانی صحیفہ نہیں جسے سب کے لیے لازمی قرار دے دیا جائے (یہ واضح رہے کہ مذکورہ مضمون میں مقصود پوسٹ ماڈرن ازم یا پھر ساختیاتی فکر پر مفصل تنقید نہیں ہے، بلکہ چند اہم نکات کی جانب اشارہ کرنا اور نارنگ صاحب کے کارنامے کا انکشاف ہے)۔

پاک و ہند کا المیہ یہ ہے کہ ہر عہد میں بے شک نظریہ سازی کا عمل ہو یا کوئی تخلیقی عمل، افسانہ نویس کی کہانی کی تلاش کا عمل ہو، مشرق کا کوئی شاعر ہو یا مشرق کا کوئی ''فلسفی شاعر'' اور تجنیلیٹی کا ہمیشہ فقدان رہا ہے۔ چند لوگ جو ادب پر براجمان ہوتے ہیں ان کو اہلِ اُردو کی ذہنی معذوریوں کا شاید ادراک ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل قریب یا بعید میں ان کی غیر تخلیقی سرگرمیاں آشکار نہیں ہونگی، جس کی وجہ سے وہ مغربی افکار کو اپنے ناموں سے منسوب کر کے خود نظریہ ساز بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان حقائق کے ظاہر ہو جانے سے علمی ہیجان سرد پڑ جاتا ہے۔ ادب سے وابستہ افراد کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ نااہلی کا احساس بڑھنے لگتا ہے اور احساسِ کمتری پروان چڑھنے لگتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ایسے اعمال سے چشم پوشی کرنا بھی جرم کا ارتکاب کرنے کے مترادف ہے۔ اور تجنیلیٹی کی کمی کی وجہ سے ہی اُردو کی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوتا اور نہ ہی کبھی مغربی درسگاہوں میں اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، کیونکہ ایسی کتابیں مغربی درسگاہوں میں فکر کی کسی بھی نہج کو مہمیز عطا نہیں کر سکتیں۔ فرض کیجیئے کہ گوپی چند نارنگ کی مذکورہ کتاب کا اگر انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو کتنے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں، کیونکہ مغرب کی تمام کتب کے حقوق یا تو مصنفین کے پاس یا پھر پبلیشرز کے پاس ہوتے ہیں۔ ان کتب کی انگریزی زبان میں اشاعت سے گوپی چند نارنگ کی ساری زندگی کی محنت بھی رائیگاں جائے گی اور ان کی ساکھ بھی متاثر ہوگی۔ ہندوستان میں ہونے والی تحقیق جن خطوط پر استوار ہے یہ راز بھی فاش ہو جائے گا۔

''آگے بڑھنے سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'' کے بارے میں کچھ اور عمومی لیکن اہم وضاحتیں پیش کر دی۔ پہلی بات تو یہ کہ زیرِ نظر کتاب نارنگ کی تصنیف نہیں بلکہ محض تالیف ہے۔ انہوں نے ساختیات، پس ساختیات، ردتشکیل اور قاری اساس تنقید وغیرہ کے ضمن میں سوسیئر سے لے کر جوتھن کلر تک اور پھر رولاں بارتھ اور دریدا سے لے کر اسٹینلے فش تک درجنوں مفکرین کے خیالات کا خلاصہ تو پیش کر دیا ہے لیکن شاذ و نادر ہی کسی مفکر کا اپنے طور پر نیز آزادانہ انداز میں تنقیدی محاکمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر نارنگ صاحب ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ زبان کے تعلق سے ساختیاتی، پس ساختیاتی اور ردتشکیلی نقادوں کا رویہ کیا ہے، لیکن ان نقادوں کا تقابلی موازنہ اور خود اپنے طور پر تنقیدی نتائج مرتب کرنے کی خواہش ان کے یہاں قطعاً مفقود ہے''۔ (**فضیل جعفری** کے مضمون ''ساختی کباب میں ردتشکیل کی ہڈی" سے اقتباس مطبوعہ **ذہنِ جدید** شمارہ ۲۲، ۲۳۔ ۱۹۹۷ء)

ڈاکٹر محمد آصف قادری (گوجرانوالہ)

کبیر ___ اردو کا پہلا ترقی پسند شاعر

''ہیومنزم کبیر کے کلام کی روح ہے، ان کے نغموں کا جوہر ہے۔ جبر کے خلاف ان کی مزاحمت کی طبعی داستان لہو کو گرمی دیتی رہتی ہے۔ ان کے جذباتی اور حسّی اضطراب اور ان کی حقیقت پسند اور مشاہدہ اور تخیل سے مضمحل، نڈھال اور تھکے ہوئے ذہن کو آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ کبیر کے کلام میں لطف و بصیرت کے اتنے پہلو ہیں کہ ہر طبقے کے افراد انسانی اقدار، سماجی گھٹن اور زندگی کی پیچیدگی کے پیش نظر فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔'' ۸؎

پروفیسر موصوف کے افکار کی حقانیت سے انکار نہیں ہو سکتا مگر اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کبیر کے کلام کی بہ نسبت اس کی شخصیت مزاحمتی جذبات و احساسات کی حامل زیادہ تھی۔ اس کے خیال میں صداقت اور محبت کے مقابلہ میں پوجا پاٹ کی نمائش اور یوگ اور تپ کی ورزش بالکل، ہیچ ہیں۔ دل کی صفائی کے بغیر خدا نہیں مل سکتا۔ کبیر نے اپنے کلام میں ریاکاری، دھوکہ بازی، طمع و حرص، غرور و فکر اور دیگر منفی اقدار کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ کہتا ہے:

مایا تجی تو کیا بھیا مان تجا نہہ جائے — مان بڑے منی در گلے مان سبن کو کھائے
مایا تیاگے کیا بھیا مان تجا نہہ جائے — جہہ مانے منی ور ٹھگے مان سبن کو کھائے

یعنی دولت چھوڑے سے کیا ہوتا ہے جب اعزاز یا عزت کی چاہ نہیں چھوٹتی، جاہ و منصب پانے کے چکر میں بڑے بڑے رشی منی ختم ہو گئے۔ آج کے عہد میں مایا (دولت) سیاسی مفادات کے حصول کا ہوس پرستانہ عملہے۔ سردار جعفری نے ٹھیک ہی کہا ہے:

''آج کے عہد کی سب سے بڑی مایا سیاست ہے۔ یہ اسی مایا کا کرشمہ ہے کہ ہماری پچاس فیصدی سے زیادہ آبادی مفلسی کا شکار ہے اور انسانوں کی اکثریت ان پڑھ اور جاہل ہے۔ روزانہ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں اور پاتال کے جہنم سے ہماری جنت ارضی پر آگ برسائی جاتی ہے۔ یہ اسی مایا کا کرشمہ ہے کہ ہم اپنی عزت نفس اور احساس انسانیت کو بڑی حد تک کھو چکے ہیں لیکن اسی مایا کا یہ بھی کرشمہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے درجنوں ممالک اور قومیں مغربی سامراج کی گرفت سے باہر نکل رہی ہیں اور اپنے رقص و نغمہ کو دوبارہ زندہ کر رہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ بے ایمان اور سفاک ہاتھوں میں سیاست گندی، بے ایمان اور سفاک ہو جاتی ہے اور مخلص اور ایمان دار ہاتھوں میں وہ کبیرؔ کے الفاظ میں ''رام کی چیری بن جاتی ہے'' ۹؎

سردار جعفری کے ان خیالات میں خاصا وزن ہے۔ کبیرؔ کے ہاں مایا کے جال میں پھنسے ہوئے جن لوگوں کا ذکر ملتا ہے، ان کے خلاف وہ بار بار اپنا جذباتی ردعمل ظاہر کرتا ہے جسے مزاحمتی ردعمل کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جب وہ حرص و ہوس اور دھوکے بازی کے بارے میں کہتا ہے۔

بہت جتن کر کیجیے سب پھل جائے نسائے + کبرا سنچے سوم دھن انت چور نے جائے

جل جیوں پیارا ماچھری لوبھی پیارا دام ؎
کامیکر ودھی لالچی ان تیں بھگتی نہ ہوئے بھگتی کر لے اس کوئی سور ماجات برن کل کھوئے

کبیرؔ کے خیال میں کنجوس دولت مند کتنی ہی دولت جمع کر لے اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا جس طرح مچھلی کو پانی پیارا ہے لالچی آدمی کو دولت سے محبت ہوتی ہے۔ شہوت پسند، غصہ ور یا لالچی لوگوں سے بھگتی نہیں ہو سکتی، بھگتی کرنا تو ایسے بہادر کا کام ہے جو اپنی ذات، ورن (برہمن، چھتری وغیرہ) اور خاندان کو چھوڑ دے تو ہم اسے مزاحمتی اشعار نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان میں محض برات کا اظہار ہوا ہے۔ اسی طرح جب کبیرؔ کہتا ہے۔ ؎

ماتھا تلک لگائے کے بھگتی نہ آئی ہاتھ — داڑھی مونچھ مُڑائے کے چلے دُنی کے ساتھ
داڑھی مونچھ مُڑائے کیہوا گھوئم گھوٹ — من کو کیون نہیں موڑیے جا میں بھریا کھوٹ
سادھو بھیا تو کیا بھیا جو نہیں بول بچار — ہے پرائی آتما جیبھ لیے تروار

تو بد طینت لوگ اس کا نشانہ ملامت بنتے ہیں ان لوگوں کے ظاہر اور باطن میں تجاد اسے ایک آنکھ

نہیں بھاتا جو لوگ بظاہر مذہبی پیشوا ہیں اگر ان کے باطن برائیوں سے بھرے پڑے ہیں یا پھر ان کی زبان تلوار کی طرح چلتی ہے اور لوگوں کے جذبات مجروح کرتی ہے۔ ایسے لوگوں کو نشانہ ملامت بنانے والا شاعر یقیناً مزاحمت پسند فن کار ہوتا ہے، اس کی انسان دوستی اس سے ایسے خیالات منظوم کراتی ہے۔ کبیرؔ لوگوں کو خبردار کرتا ہے کہ دھوکے بازوں سے بچو، دھوکے باز کی دوستی انار کی مانند ہے کہ جس کا ظاہر سرخ ہوتا ہے اور باطن سفید۔

کبیرا تہاں نہ جایئے جہاں کپٹ کا ہیت جانوں کلی انار کی تن راتا من سویت

کبیرؔ اپنے ضمیر کی آواز سننے پر اصرار کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک وہی شخص ذی فہم اور دانش مند ہوتا ہے جو اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھرتا ہے:

سمجھا سوئی جانیے جاکے روے بی بیک

کبیرؔ کے کلام میں انسان دوستی ایک انتہائی مثبت رجحان کے حامل انسان کا پتا دیتی ہے کبیرؔ سب کو مساوات کا درس دیتا ہے۔ اس کے نزدیک تمام مخلوقات قابل احترام ہیں۔ دوسروں کا دکھ درد سمجھنے والا ہی بڑا بزرگ ہے انسان دوست ہے۔ وہ شخص جو دوسروں کا دکھ درد محسوس نہیں کرتا وہ بڑا بے رحیم کافر ہے۔

کبرا سوی پیر ہے جو جانے پر پیر جو پر پیر نہ جانئ سو کافر بے پیر

انسان کے دل و دماغ کے بارے میں کبیر کا یہ کہنا بھی بے مقصد نہیں ہے۔

من کنجر مہمنت تھا پھرتا گہرِ گنبھیر دوہری تہیر چوہری پڑ گئی پریم زنجیر

باجگیر کا باندراجیو امن کے ساتھ نانا ناچ نچائے کری راکھے اپنا ہاتھ

ایسا دل جو طاقت ور ہاتھی کی مانند تھا اور ہر وقت توڑ پھوڑ پر آمادہ رہتا تھا اس پر جب پریم کی دوہری تہری چوہری زنجیر پڑ گئی تو قابو میں آ گیا۔ دوسرے شعر میں کبیر لوگوں کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ اپنے دماغ کو بازی گر کا بندر مت بننے دو، ورنہ اسی کی انگلیوں پر ناچو گے۔ تمہیں اپنے ذہن سے کام لے کر زندگی کو سنوارنا ہے اور خالق حقیقی تک رسائی حاصل کرنی ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن کی رائے میں:

> ''کبیرؔ نے انسانی اقدار کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ انسانی اقدار پر ان کا زبردست اعتماد دنیا کے بڑے انسان دوست دانش وروں اور فن کاروں کی صف میں نمایاں مقام دیتا ہے۔ کبیرؔ کی ہیومنزم تاریکی کو روشنی میں تبدیل کرتی ہے۔ اداسی کو خوشی میں اور مایوسی کو امید اور اعتماد میں بدل دیتی ہے۔'' [۱۰]

کبیرؔ کی انسان دوستی مذہب کے نام نہاد رہنماؤں اور پیشواؤں کو پسند نہیں کرتی جو لوگوں کو اپنے استحصالی شکنجوں میں جکڑ لیتے ہیں۔ کبیر کو ایسے لوگ بھی ناپسند ہیں جو دوسروں کی خرابیوں پر ہنستے ہیں اور اپنی خامیوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔

دوش پرایا دیکھ کے چلے ہنست ہنست اپنے یاد نہ آوَیں جا کو آدمی نہ انت

ویسے کبیر کے خیال میں ہر شخص کے اندر کئی طرح کا نشہ ہوتا ہے جیسے جسم کا نشہ (غرور)، دل کا نشہ، ذات کا نشہ اور دولت کا نشہ۔

مدتو بہتک بھانت کا تاہ نہ جانے کوئے تن مد من جات مد سب لوئے

اگر ناؤ میں پانی بڑھ جائے یا گھر میں دولت تو کبیرؔ کے الفاظ میں۔

جو جل باڑھے ناؤ میں گھر میں باڑھے دام دونوں ہاتھ ایلچے یہہ سن کو کام

انہیں دونوں ہاتھوں میں بھر بھر پھینکنا چاہیے، یہی اچھے آدمیوں کا کام ہے۔ ایسی شاعری اخلاقی شاعری ہے اور اصلاحی شاعری بھی۔ ہم اس قسم کی شاعری کو مزاحمتی شاعری قرار نہیں دے سکتے البتہ ایسی شاعری کو برات اور انسان دوستی کے رجحانات کی حامل شاعری ضرور مانا جا سکتا ہے۔ البتہ درج ذیل اشعار میں مزاحمتی روح ہمیں اپنی جھلک دکھلائی ہے۔

سورا سو ای سراہیے رنگ نہ پہرے لوہ جو مجھے سب بند کھول کے چھانڑے تن کا موہ

کھیت نہ چھانڑے سورما جو مجھے دو دل مانہہ آسا جیون مرن کی من میں لاوے نانہہ

گویا بہادر کی تعریف میں کبیرؔ نے اس کے مخالف فوجوں کے خلاف مزاحمتی کردار کو سراہا ہے جسے موت کا خوف نہیں بس اس کے ذہن پر دشمن پر فتح حاصل کرنے کی دھن سوار ہوتی ہے۔

ان اشعار کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو راہ سلوک میں جتنی رکاوٹوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے ان کو خاطر میں نہ لانا چاہیے تاکہ اس کو معرفت مردانہ وار عبادت و ریاضت کرتے رہنا چاہیے تاکہ اس کو معرفت الٰہی نصیب ہو جائے۔

کسی شاعر یا ادیب کا جذبہ چاہیے کتنا ہی شدید ہو، اس کا تقاضائے اظہار شاہیے کتنا ہی زبردست ہو اسے الفاظ سے کشتی لڑنی پڑتی ہے۔ [۱۱] لیکن کبیرؔ کے اکثر اشعار کے مطالعے سے یقین نہیں آتا کہ اس کو الفاظ سے کشتی لڑنی پڑتی ہے چنانچہ اس کے قاری کو یوں لگتا ہے کہ ایسے شعر ڈھلے ڈھلائے اور بنے بنائے نوک قلم پر اترتے ہیں۔ اس کا بیشتر کلام آمد کا نتیجہ ہے۔

منقولا بالا اشعار اس کے فن کے شاہکار ہیں جو اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کے مافیہ یا مواد پر

ہر پہلو سے بار بار غور وفکر کرلیا گیا تھا۔ لہذا یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ فن کا کوئی بھی کامیاب شاہکار غیر محتاط اور ادنیٰ تخیل سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ ۱۲ چنانچہ کبیرؔ کو اردو کا پہلا بڑا شاعر ہی نہیں ، پہلا مزاحمتی شعر کہنے وال شاعر تسلیم کرنے میں بھی کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید کبیر محض بھگتی تحریک کا رہنما ہی نہیں بلکہ صحت منداد بی تحریک کا نقطہ آغاز بھی ہے اور س نے جہاں نچلے طبقے کو بلندی کی طرف مائل کیا وہاں ایک غریب زبان کو بھی تونگری عطا کرنے کی کوشش کی۔ ۱۳

کبیرؔ آزاد فکر اور آزاد منش موحد تھا۔ اس کی انسانی دوستی، عوام دوستی اور سماج دوستی قابل تعریف ہے۔ اس نے بدی کے بجائے نیکی کی تلقین کی جسے برات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں کہیں اس نے بدی کی قوتوں کے خلاف اپنا جذباتی ردِ عمل ظاہر کیا فی الواقع مزاحمتی ردعمل کے علاوہ کچھ نہیں۔

ہر شاعر مزاحمت کا سا بھاری پتھر اٹھا نہیں سکتا اور نہ ہی ہر کوئی مزاحمتی چنگاریاں روشن کرسکتا ہے اور پھر کبیر کے عہد تک تو ایسا کچھ کبیر کے سوا کسی سے ممکن نہ ہوا تھا۔ قصر تصوف کی بنیادیں عشق ومحبت پر قائم ہیں، یہی حال بھگتی تحریک کے پیروؤں کا تھا کہ عشق ومحبت سے اپنے صوفیانہ مراحل طے کرنا چاہتے تھے۔ اسی دوران میں کبیر جیسے بھگت باطل خیالات اور باطل قوتوں کے خلاف اپنا ردعمل مختلف اشاروں، کنایوں اور استعاروں میں بیان کرتے رہے، جو برات سے مزاحمت تک کے سفر پر محیط ہیں۔ شارٹر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا بیان ہے:

"A study of his poems makes it clean that he had no desire to attach himself to any organised religion. Nor did he attempt to formulate any religious or philosophical system of his own. " ۱۴

راقم الحروف کے خیال میں کبیرؔ کا مذہب انسان دوستی تھا ہندو یا مسلمان دوستی نہیں! وہ کسی مذہب یا فلسفہ کے دائرے میں مقید نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے کبیر نے ہندو مسلم مذاہب کی خوب صورتی کو سمو کر اسے عوام کے نام کردیا۔ کبیر کی شاعری اپنے کلام میں ایک بھگت، ایک صوفی، ایک عظیم انسان بار بار ظاہر ہوتا ہے۔

تاراچند کے الفاظ ہیں:

"Kabir asked the Hindus to give up ceremonials, sacrifices, lip worship, Brahmin supremacy, caste differences, and untouchability." ۱۵

جو شخص ہندوؤں کو بے جا رسومات، زبانی کلامی عبادات اور ذات پات کی تقسیم کو ترک کرنے کا درس دیتا ہے اس کے کلام میں کسی بھی مذہب کے پیروؤں کے غیر انسانی رویوں پر کیونکر ردعمل ظاہر نہ ہوتا؟ غیر طبقاتی معاشرے کا قیام ہر ترقی پسند فن کار کا خواب رہا ہے جس کی تعبیر پانے کے لیے ہر دور میں کبیر جیسی صفات کی حامل شخصیات مصروف عمل رہی ہیں۔ کبیر ایسے ترقی پسند شاعر نے ایک شعر میں اپنے قارئین وسامعین کو یہ دعوت دی

تھی۔

کبیرا کھڑا بیزار میں لیے لکاٹھی ہاتھ
جو گھر پھونکے آپنا چلے ہمارے ساتھ

اور پھر ایک وقت آیا کہ ترقی پسندی جو کبھی ایک صفتِ ادب تھی ایک تحریک بن کر ابھری اور جو شخص اکیلا ہی جانبِ منزل چلا تھا اس کو ہم سفر ملتے گئے اور کارواں بن گیا۔ اردو ادب کی ترقی پسند تحریک کا قیام بیسویں صدی کی تیسری دہائی (1935ء) میں عمل میں لایا گیا جب کہ اردو ادب میں پہلا ترقی پسند شاعر کبیر اس سے تقریباً پانچ سو برس پہلے (پ1435ء) اپنے ترقی پسند افکار کا ابلاغ واظہار کر چکا تھا۔

حوالہ جات

1۔ محمود اختر شیروانی۔ حافظ، پنجاب میں اردو، ص204، مکتبہ معین الادب لاہور طبع دوم: س ن
2۔ جمیل جالبی ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول، ص43، مجلس ترقی پسند ادب لاہور طبع سوم دسمبر 87ء
3۔ علی سردار جعفری نے غالبؔ، میرؔ اور اکبیرؔ پر اپنی کتاب کا نام ہی 'پیغمبران سخن' رکھا ہے۔
4-The New Encyclopaedia Britannica, 15th ... , P 786 Printed in U.S.A, 1974.
5- ibil,p 788
6۔ حالؔی مولانا الطاف حسین، مقدمہء شعر وشاعری مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، ص142، مکتبہ جدید لاہور، پہلی بار 1953ء
7۔ جمیل جالبی ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول، ص45-46
8۔ شکیل الرحمٰن پروفیسر، کبیر، ص7، عرفی پبلی کیشنز گوڑگاؤں پہلی بار، 1997ء
9۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند تحریک کی نصف صدی، ص84-85، مکتبہء خلیل لاہور نومبر 1985ء
10۔ شکیل الرحمٰن، کبیر، ص100
11۔ ہادی حسین، مغربی شعریات، ص371، مجلس ترقی ادارہ لاہور طبع اول، مارچ 1868ء
12۔ احمد صدیق مجنوں، تاریخ جمالیات جلد دوم، ص122، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، بار دوم، جنوری 1959ء
13۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، ص157، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، اشاعت دوم، 1991ء
14- Shorter Encyclopaedia of Islam , H. A. R. Gibb J. H. Kramers ed; P 199, Leiden, E. J. Brill, Netherlands, 1953
15- Tara Chand, Influence of Islam on Indian Culture , P/63, Book Traders, Lahore 1st, Pakistni ed. 1979.

گوشۂ ڈاکٹر حمید سہروردی

چہرہ نما

مرتب: ڈاکٹر غضنفر اقبال (گلبرگہ)

نام: عبدالحمید سہروردی **قلمی نام**: حمید سہروردی

والدین: محمد محمود علی سہروردی، سلیمہ بی (مرحومہ) **خاندانی سلسلہ**: حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمتہ

آمد: یکم جون ۱۹۴۷ء گلبرگہ **لیاقت تعلیمی**: ایم اے پی ایچ ڈی (اردو)

ملازمت: پروفیسر وصدر شعبہ اردو۔ گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ **تظیق کاری کا آغاز**: افسانہ نگاری اور شاعری، ۱۹۶۷ء

اولین ادبی تظیق: افسانہ: "راکھ تلے" ۱۹۶۷ء، پگڈنڈی امرتسر نظم ماہنامہ "تحریک" نئی دہلی

تحقیقی مقالہ: جوگندر پال شخصیت اور افسانوی فن (برائے پی ایچ ڈی)

کتابیں: ریت ریت لفظ (افسانے) ۱۹۸۰ء عقب کا دروازہ (افسانے) ۱۹۸۷ء

بے منظری کا منظر نامہ (افسانے) ۱۹۹۶ء بین السطور (مضامین) ۱۹۹۸ء

شش جہت آگ (نظمیں) ۲۰۰۲

مطبوعاتِ آئندہ: شہر کی انگلیاں خونچکاں ۔۔ دھند چاروں طرف ۔۔ کہانی جاری ہے

خصوصی شمارے، گوشے، تحقیقی مقالے:

حمید سہروردی خصوصی مطالعہ ماہ نامہ آہنگ (بہار)

ایک شمارہ حمید سہروردی کے نام ہفت روزہ، بودھ دھرتی، گیا (بہار)

گوشۂ حمید سہروردی سہ ماہی توازن مالے گاؤں (مہاراشٹر)

اردو فکشن اور شاعری کی ربع صدی کا تابندہ نام حمید سہروردی

خصوصی اشاعت روز نامہ سالار دکن گلبرکہ یکم جون ۲۰۰۳ء

حمید سہروردی کے افسانوں کا تنقیدی تجزیہ (مقالہ برائے ایم فل) از سیدہ رفعت ہاشمی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ

حمید سہروردی فن اور شخصیت (مقالہ برائے ایم فل) از طیب خرادی۔ حیدر آباد یونیورسٹی، حیدر آباد

کتابوں پر انعامات : مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی، مغربی بنگال اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی اور پرسار رنگا گلبرگہ یونیورسیٹی گلبرگہ

اعزازات : کرناٹک اردو اکادمی بیسٹ افسانہ ایوارڈ، غالب ایوارڈ، غالب کلچرل ایسوسی ایشن بنگلور، محمد سعید ایوارڈ برائے فکشن (مجلس ادب بنگلور) نثری خدمات ریاستی ایوارڈ برائے ۲۰۰۳ (کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور)

تعلیمی، ادبی، صحافتی عھدے :

بیڑ (مہاراشٹر) کے تعلیمی اداروں سے انسلاک

انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ (حیاتی رکن)

اکیڈمک کونسل گلبرگہ یونیورسیٹی گلبرگہ

رکن کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور

بھارت کی مختلف جامعات میں نصاب کی تدوین اور امتحانات کے چیئرمین اور رکن کی خدمات

مجلس ادارت / مجلس مشاورت :

مدیر، انکور، مجلّہ مراٹھواڑہ یونیورسیٹی اورنگ آباد پندرہ روزہ "تمہید" بیڑ (مہاراشٹر)

ماہنامہ 'ادب نکھار' مئوناتھ بھنجن ماہ نامہ 'آیات' کلکتہ

سہ ماہی 'طاوس' آسنسول (مغربی بنگال) سہ ماہی 'لکیریں' آسنسول (مغربی بنگال)

نوائے گلبرگہ، مجلّہ گلبرگہ یونیورسیٹی گلبرگہ ارمغان، مجلّہ گلبرگہ یونیورسیٹی گلبرگہ

'انجمن' (کتابی سلسلہ) انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ اذکار، سہ ماہی ترجمان، کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور

گھر جنت: سعیدہ قمر سلطانہ (شریک حیات)،

ڈاکٹر غضنفر اقبال، انجنیئر خرم عماد (بیٹے) عطیہ فردوس (بہو) عائشہ صدیقہ (بہو) جویریہ راحت (پوتی)

رابطہ کے لئے:

گھر کا پتہ

"Saiban'', Zubair Colony,

Hagarga Cross,

Ring Road, Gulbarga-585104

Karnataka,(India)

ٹیلی فون نمبر: 269167-(08472)

خاکہ

امجد علی فیض

پروفیسر حمید سہروردی: ادب کا پکاسو

شب کے ٹھیک گیارہ بجے کا عمل ہوگا میں آرام کرسی کی پشت پر سر ٹکائے لاینحل مسائل میں کھویا بے نام خوابوں کے جزیرے میں بھٹک رہا ہوں، ٹکڑوں میں بٹی ایک تصویر کو جوڑ رہا ہوں اجنبی کینوس سے جانی پہچانی شبیہہ اُبھرتی ہے اب میرے اطراف سناٹا گہرا اور پُر اسرار ہوتا جا رہا ہے کہ سرگوشیاں بھی صاف سُنائی دیے جاتی ہیں:

''ایک صاف کاغذ لو پھر ایسا پن لو جس میں سیاہی کے آخری قطرے بچ رہے ہوں بناؤ ایک تصویر جس میں ہم سب کی تصویر نظر آئے تصویر ہماری تمہاری سبھی کی ایک ہی ہے، ہم بہ ظاہر علاحدہ ہوتے ہوئے بھی اپنے وجود کے اندر ایک ہی تصویر رکھتے ہیں''۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب افسانہ حقیقت اور حقیقت خواب معلوم ہوتی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ نے اپنے پروگرام شیرازہ گل میں حمید سہروردی صاحب کا ایک افسانہ نشر کیا تھا جس کی خوبی یہ تھی کہ اس افسانہ میں نہیں نہیں اور ہاں ہاں کے سوائے کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی میں نے اس مسئلہ کو ایک دوست سے رجوع کیا انہوں نے جواباً کہا تم ایک افسانہ سن کر تلملا رہے ہو میں تو ان کے افسانوی مجموعے سونے سے قبل ایک مرتبہ ضرور پڑھتا ہوں جہاں تک عدم ترسیلیت کی بات ہے میں تمہارا ہم نوا ہوں اور شاید وہ امریکی دولت مند خاتون بھی اس معاملہ میں ہمارا ساتھ دے گی جس نے پابلو پکاسو کی تصویر پچاس ہزار امریکی ڈالر میں خریدی تصویر خریدنے کے بعد اس نے پکاسو سے پوچھا ''تمہاری اس تصویر کا کیا مطلب ہے'' پکاسو نے بڑے تمسخرانہ انداز میں جواب دیا ''مادام اس کا مطلب ہے پچاس ہزار ڈالر''

اس کے بعد پکاسو بھی میرے مطالعہ میں رہا نہ پکاسو سمجھ میں آیا اور نہ حمید سہروردی البتہ میری اپنی حیثیت سمجھ میں آ گئی۔

یہ اپنے افسانوں میں جتنے گنجلک اور پیچیدہ نظر آتے ہیں فطرتاً آئینے سے لگتے ہیں غیروں کا تو پتہ نہیں میں تو

اپنے سارے عیب و ہنر اسی میں دیکھتا ہوں۔ پہروں ساتھ گذاریئے، گھنٹوں سماعت فرمایئے ان کی باتیں الف لیلوی ہزار داستان ہر بات ایک دوسرے میں پیوست اور مدغم درمیان میں کہیں ترسیل اور ابلاغ حائل نہیں گویا فصاحت کا دریا رواں دواں۔۔

شہر گل و برگ کا ایک گنجان اور قدیم علاقہ مومن پورہ ان کا مولد و مسکن رہا یہاں کی دیواروں نے ان کی غوں غاں سنیں ان ہی گلیاروں میں جوانی کی راتیں مرادوں کے دن بسر ہوئے آخری وقت میں اپنے دکھ سکھ کے ساتھیوں کو یکا و تنہا روتا بلکتا چھوڑ ان جان علاقے میں ''سائبان'' بنایا انہوں نے مکان کیا بنایا یار بار بناتے رہے کبھی گتہ دار کی شکل میں کبھی دوستی کی آڑ میں ایک کو تو جگری دوست ہونے کا دعویٰ بھی تھا اور بھی اس نے جگر پر ہی کیا لیکن روح زخمی ہوئی اب یہ وضو کے پانی سے ان زخموں کو دھو رہے ہیں!

کچھ عرصہ مجھے ان کے پڑوس میں رہنے کا بھی اتفاق ہوا پڑوس میں ان کا آبائی مکان تھا۔ مکین تھے، شور وغل، رنجشیں، رفاقتیں، سسکیاں، کلکاریاں اور قہقہے غرض زندگی کے سب رنگ موجود تھے یہ نہیں تھے معلوم ہوا بیڑ میں پڑھاتے اور وہیں فروکش ہیں تعطیلات میں مہاجر پرندوں کی طرح آتے اور ہنس بول کر لوٹتے ہیں۔ میں پڑوسی ہونے کے ناطے ہمیشہ ان سے جھگڑنے کے نت نئے منصوبے بناتا رہا لیکن ہر بار ان کی وضع داری نے مجھے مات دیدی یعنی بنا کھیلے ہی بازی ہار دی!

تہذیب، شرافت اور شائستگی کا اعلیٰ نمونہ ہیں اسی شرافت اور شائستگی نے چائے خانے اور مے خانے سے دور رکھا جب کہ ادب میں اکثریت یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے کے ذیل میں آتی ہے تاویل یہ پیش کی جاتی ہے کہ معیاری اور تخلیقی ادب میں بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر آپ نے اس کلیہ کو مفروضہ ثابت کر دیا۔

مومن پورہ کی گلیوں میں اکثر پیدل ہی نظر آتے، کبھی ملاقات ہوتی میری تخلیقات اور یہاں کی ادبی سرگرمیوں کا حال ضرور پوچھتے اس دوران کوئی مضمون نظر سے گذرتا تو بلا تامل توصیفی کلمات سے نوازتے اور حوصلہ افزائی فرماتے۔

ادبی سیاسی، اور مذہبی بصیرت میں اپنی نظیر آپ ہیں لیکن موٹر سیکل کے کل پُرزوں کے بارے میں کوئی غلطی سے بھی پوچھ لے تو ان کی وہی حالت ہوتی جو عام مسلمانوں کی الجبراء کا سوال پوچھتے جانے پر ہوتی ہے۔

جب سے شہر میں فاصلہ بڑھ گئے ہیں اور یاروں نے بہت دور بسالیں بستیاں اپنی۔۔۔ انہوں نے بھی ایک موٹر سیکل خریدی فرماں بردار فرزندان نہ ہوتے تو انہیں اخبارات میں ایک اشتہار بھی جاری کرنا پڑتا:

ضرورت ہے!
ایک ایماندار اور محنتی ڈرائیور کی
جو بیل گاڑی کی رفتار سے

موٹر سیکل چلا سکے!

سانولا رنگ، ستواں ناک، ہونٹوں پر مہر سکوت، آنکھوں میں فکر اور سر پر پریشانی پھیلی ہوئی۔ مونچھیں کبھی غنی کے دل کی طرح وسیع اور گھنی ہوا کرتی تھیں آج ہندوستان میں اردو کی حالت جیسی پتلی ہوگئی ہیں۔ مکان پر نہرو شرٹ پاجامہ، یونیورسٹی کے لئے سفاری، ادبی سمینار اور سمپوزیم کے لئے سوٹ، اور شادی بیاہ جیسی تقاریب کے لئے شیروانی مختص ہے۔ پان شوق سے کھاتے ہیں بیگم کے ہاتھوں بنی گلوریاں میسر آجائیں تو طبیعت کھل اٹھتی ہیں ہونٹوں کی سرخی گالوں پر چھا جاتی اور فضا یکلخت رومانی ہوجاتی ہے احباب کی دل جوئی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے سوچتے ہیں تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے پھر کیا دیکھتے ہی دیکھتے ''سائبان'' اپنی تنگ دامنی کا شکوہ کرتا اور یہ دوست داری اور مہمان نوازی جیسی عظیم روایات کی پاسداری میں ہمہ تن مصروف ہوجاتے تاہم اہل چمن نے ان کی کفایت شعاری پر بخالت کا لیبل چسپاں کیا ہے جو سراسر بہتان طرازی کے سوا کچھ نہیں!

اپنے آپ سے زیادہ کتابوں پر خرچتے ہیں فرزندان اور بیگم نے بھی ادب پرور ماحول بنائے رکھنے میں ان کا ساتھ دیا کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ دولت فرعون اور علم پیغمبروں کی میراث ہے۔

حلقہء احباب گلی سے دلی، دلی سے پنڈی اور پنڈی سے جرمنی تک پھیلا ہوا ہے شب و روز بڑے مصروف رہتے ہیں تاہم دوست داریاں نبھانا نہیں بھولتے۔ لاکھ طوفان آئے جان پر بن آئے لیکن پابندی سے دوستوں کی خیریت کبھی فون پر کبھی خطوط کے حوالے سے ضرور پوچھ لیتے ہیں کچھ نہیں تو ہر سال عید کارڈ ہی بھیج دیا باوثوق ذرائع سے یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ ان کی روزانہ کی ڈاک اتنی وزنی ہوتی ہے کہ محکمۂ ڈاک محض ان کے گھر ایک علاحدہ ڈاکیہ کے تقرر کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا ہے کیونکہ ان کی ڈاک پہنچانے کے بعد بے چارہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ دوسروں کی ڈاک پہنچا سکے!

ہمارے ادب کا ایک بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ادب کی موت کے دوسرے دن ہی اس کی ذاتی لائبریری کی ساری کتابیں کباڑیئے کے ہاتھوں ردّی کے مول فروخت کردی جاتی ہیں بیش تر ادیبوں کے ساتھ یہی ہوا ہے اور یہی ہوگا قصور بھی تو ان ہی کا ہے لیکن حمید سہروردی صاحب کو فکر مند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں غضنفر اقبال کی صورت انہیں ایک ایسا حقیقی وارث مل گیا ہے جو ان کے قیمتی ورثہ کی نہ صرف حفاظت کرے گا بلکہ ایک نیا جہاں آباد کرے گا اور قوی امید ہے کہ اس چراغ سے کئی اور چراغ جلیں گے نیز بزم آرائیوں کا یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

پروفیسر حمید سہروردی سے ایک مصاحبہ

شرکائے گفتگو:

ڈاکٹر سید احمد قادری، سید سجاد اختر، نور الحسنین، عارف خورشید

سید سجاد اختر:- آپ ادب کی طرف کب آئے اور اپنی صلاحیتیں آپ پر کب منکشف ہوئیں؟

پروفیسر حمید سہروردی:- قصّے کہانیاں بچپن ہی سے اچھی لگتی تھیں، پڑھ لیا کرتے تھے۔ پی یو سی میں ہی احباب کا ایک حلقہ بن گیا جن میں اکرام باگ، بشیر باگ، حامد اکمل، حکیم شاکر وغیرہ شامل تھے۔ ہم لوگ اس زمانے میں کوئی سا بھی تازہ شمارہ پڑھ لیتے اور اس پر بحث و مباحثہ کرتے یہیں سے یہ خواہش ہوئی کہ ہم بھی تخلیقی کام کریں اور کوشش کرنے پر یہ اندازہ بھی ہوا کہ ہم تخلیقی کام کر سکتے ہیں پڑھنے میں سینئر بزرگ افسانہ نگار اور شاعر آتے رہے ان سبھی کو جس طرح پڑھ سکتے تھے۔ پڑھ لیا۔

ڈاکٹر سید احمد قادری:- اگر پریم چند کفن جیسا افسانہ نہ لکھتے تو کیا آج اُردو افسانے کو جو معیار اور وقار حاصل ہے وہ نہ ہوتا آپ کا کیا خیال ہے؟

پروفیسر حمید سہروردی:- پریم چند اُردو افسانوی ادب کی ایک تاریخی حقیقت ہے میں انہیں اُردو کا ایک اہم افسانہ نگار سمجھتا ہوں، مگر یہ کہنا کسی قدر زیادتی ہوگی کہ افسانہ ،کفن، اگر نہ ہوتا تو آج جو اُردو افسانے کو معیار اور وقار حاصل ہے وہ نہیں ملتا، (ایسا کہنا) ان کے ہم عصر اور ان کے بعد آنے والی نسل کے ساتھ زیادتی ہے پھر میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اگر اُردو میں داستان نہ ہوتی تو پریم چند کیا لکھتے؟ کیا پریم چند کچھ نہیں لکھتے؟ وغیرہ وغیرہ بے شک کفن اُردو کا ایک ناقابل فراموش افسانہ ہے جس طرح زندگی کہیں نہیں رکتی بالکل اسی طرح زندہ

زبان کا ادب کبھی نہیں تھمتا۔

سید سجاد اختر:- جن سیاسی وسماجی حالات و واقعات نے ہمارے افسانہ نگاروں کو بے حد متاثر کیا ہے وہ کس قسم کے تھے؟

پروفیسر حمید سہروردی:- پریم چند انگریزوں کے دور میں تھے ان کے مسائل دیہاتی زندگی کے مسائل تھے۔ پریم چند سیاسی سطح پر اپنے ملک کی آزادی کے خواہاں تھے پھر 1947ء میں آزادی کی مسرت تو حاصل ہوئی لیکن تقسیم ملک کا المیہ بھی رونما ہوا فسادات ہوئے اس کے بعد اقدار کی شکست وریخت واقع ہوئی اور انسان کے اندر کا بنجر پن انسانی رشتوں کے ٹوٹنے سے پیدا ہوا۔ عالمی ادبی تحریکات کے وسیع تناظر کی وجہ سے بھی تبدیلی آئی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور جوگندر پال کے یہاں مہاجریت کے مختلف شیڈز اور Moods پائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر سید احمد قادری:- آپ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے ہیں۔ کیا آپ اپنے احساسات وجذبات کے اظہار کے لئے کسی ایک ہی صنف کا سہارا نہیں لے سکتے؟ کیا جو بات آپ شاعری میں کہنا چاہتے ہیں۔ یا جو بات آپ افسانہ میں پیش کرنا چاہتے اس کا اظہار شاعری میں نہیں ہو سکتا۔

پروفیسر حمید سہروردی:- برادرم آپ نے میری مشکل تو آسان کر دی ہے آپ کے سوال میں ہی میرا جواب موجود ہے میں کیا اور عرض کر سکتا ہوں، جہاں تک خیال اور موضوع کی بات ہے یہ میرے افسانوں اور نظموں میں الگ الگ ہیں۔

نور الحسنین:- آپ کی افسانوی تکنک پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ آپ ڈرامہ کی تکنک کو افسانے میں برتتے ہیں جس کی وجہ سے خارجی اظہار تو ہو جاتا ہے لیکن داخلی کیفیات کی عکاسی آپ کے کردار نہیں کر پاتے اور مجموعی تاثر کہانی کے بطن ہی گھٹ کر رہ جاتا ہے؟

پروفیسر حمید سہروردی:- جناب من! ذرا غور کیجئے ڈرامہ اور افسانہ میں بے شمار مماثلتیں ہونے کے باوجود ڈرامہ کا فن بڑا فن ہے یعنی شاعری کے بعد اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ میں افسانوں میں ڈرامہ کی تکنک سے کام لیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ وہ میرے افسانوں کا تقاضہ تھا تکنک کے اعتبار سے میرے افسانوں میں ڈرامائیت سے مراد مکالمہ اور فضا آفرینی ہے تو افسانے کا تقاضہ ہے۔ اب رہی بات خارج اور داخل کی تو میرے افسانے خارج کے نہیں ہوتے (جیسے عام معنوں میں سمجھا جاتا ہے) بلکہ داخلی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں چوں کہ میرے افسانوں کی بنیادی سوچ جذبہ وفکر پر ہے اس لئے میرے افسانوں پر انہیں سطحوں پر غور کرنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے یہ عمل دانش وارانہ نہ ہو۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ ہوتا یہی ہے۔ تاثر تو مکمل فن پارہ سے ہی حاصل ہوتا ہے ویسے بھی میرے افسانے کسی قدر نامانوس ہوتے ہیں قاری فوراً تاثر کو قبول نہیں کرتا ہوگا اس کے لئے پریم چند سے لے کر نئے افسانے تک کا مطالعہ ضروری ہے۔ میں ادب تفریح کے لئے نہیں لکھتا میرے لئے ادب ایک مہذب دیوانگی کا عمل ہے۔

ڈاکٹر سید احمد قادری:- آپ اپنی شاعری یا افسانہ نگاری دونوں میں سے کس صنف سے مطمئن ہیں؟

پروفیسر حمید سہروردی:- میں نہ شاعری سے مطمئن ہوں اور نہ ہی اپنی افسانہ نگاری سے، سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ میں نے ابھی کیا ہی کیا ہے؟ ابھی تو میں نے اپنا سفر شروع کیا ہے۔ میری خواہش اور کوشش یہی ہے اور رہے گی کہ میں سفر میں رہوں۔

عارف خورشید:- کس افسانہ نگار کو پڑھ کر راحت ملتی ہے؟

پروفیسر حمید سہروردی:- جو فن اور زندگی کو یک جا کر کے پیش کرتا ہے۔

عارف خورشید:- کس کو پڑھ کر الجھن ہوتی ہے یا غصہ آتا ہے۔

پروفیسر حمید سہروردی:- غصہ ان پر آتا ہے جو فن کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں اور الجھن ان سے ہوتی ہے جو فن کو اکہری سطح پر برتتے ہیں۔

سید سجاد اختر:- بعض اوقات تعمیر کے لئے تخریب ضروری ہوتی ہے آپ کے خیال میں جدید ادب وتنقید نے ایسی تخریب کاری کہاں کی ہے؟

پروفیسر حمید سہروردی:- جدید تنقید تو بڑی سخت رہی پہلے ہماری تنقید میں جو مشرقیت کے آداب واخلاق تھے اس کو توڑا۔ فن بارے کو جانچنے میں ادبی اصولوں کو ہی بروئے کار لائی۔ اخلاق وآداب اپنی جگہ درست مگر ادب فہمی کے لئے کہیں نہ کہیں مانع ہیں ترقی پسند تحریک وہاں تک اچھی تھی کہ اپنے معاشرے کی اصلاح مقصود تھی معاشرے کے مسائل کو حل کرنے کی ادبی انداز سے کوشش جاری تھی لیکن جب اس نے پارٹی مینی فیسٹو کو فالو کرنا شروع کر دیا تو ادبی معیار سے ہٹتی چلی گئی جدیدیت کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ترقی پسندی کی توسیع ہے یا پھر ردعمل! لیکن میرا خیال ہے کہ یہ نہ تو ردعمل ہے اور نہ توسیع بلکہ وقت کی دین اور حالت کی پیداوار ہے اور اپنے طور پر پھوٹنے والے شجر کی طرح ہے۔

نور الحسنین:- حمید صاحب! آپ میں بھرپور تنقیدی بصیرتیں ہیں۔ ایک سلجھا ہوا ذہن ہے آپ کے پاس۔ آپ چاہتے تو تنقید کے نئے زاویئے دریافت کر سکتے تھے آپ پر یہ الزام ہے کہ آپ نے نثری شاعری کر کے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا خون کیا ہے اور نثری نظمیں لکھ کر اپنے ادبی وقار کو ٹھیس پہنچائی؟

پروفیسر حمید سہروردی:- میں ہر لکھنے والے سے یہی امید رکھتا ہوں کہ وہ ذہن وشعور سے کام لے، اندھا دھند لکھنے سے کیا حاصل۔ آپ غور کیجئے ایک تنقیدی بصیرت رکھنے والے اور ایک سلجھا ہوا ذہن رکھنے والے افسانہ نگار سے تفریحی افسانوں کی امید کیوں رکھی جائے کیا یہ اس کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔ کیوں ہوگی کہ نہیں؟ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے کیوں ٹھیک ہے نا؟ ہم کسی لکھنے والے سے پابندی موضوع اور پابندی فن کا تقاضہ کیوں کریں۔ اب ہمارے معاشرے میں ادیب ہی تو آزادئ ذہن کا اظہار کر سکتا ہے کیوں کہ اس کے پاس زبان ہے اور زبان کے بہت سارے

لوازمات علامت تمثیل، استعارہ اورابہام وغیرہ۔

ادب میں تنقید ایک فن کی حیثیت رکھتی ہے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اعلیٰ تخلیق بغیر تنقیدی شعور کے ممکن نہیں اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ ہر تخلیق میں تنقیدی شعور کارفرما ہوتا ہے میں اپنی تخلیقات کے بارے میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میری تخلیقات اعلیٰ درجہ کی ہیں۔مگر یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ان تخلیقات میں تنقیدی شعور ضرور ہے۔میرا افسانہ سماج کے لئے ایک نئی تنقید کا زاویہ دریافت کرتا ہوا لگے گا۔

اب رہا نثری نظموں کا سوال ! مستقبل کی شاعری نثری نظم ہی ہوگی میں نے ایسی تنقیدی صلاحیتوں کا خون ہرگز نہیں کیا۔نثری نظمیں پڑھیئے ۔میری شاعری محض زلف ورخسار کی شاعری نہیں ہے میں نے معاشرہ کی آلودگی، حکومت کی ناقص کارکردگی، رہنماؤں کی خودغرضی اوراشخاص اور جماعتوں کے قول وفعل کے تضاد کی باتیں کی ہیں۔ جہاں میں نے معاشرہ کے ایک پہلو کی بات کی ہے وہیں دوسرا پہلو بھی میرے نزدیک اہم ہے۔ مجھے کسی سے بغض وعناد نہیں ہوتا میری تخلیقات تفریحی ادب کے زمرہ میں نہیں آئیں وہ افسانہ ہو کہ نظم ہر صنف ادب میں میں نے سماج پر راست یا ناراست طور پر تنقید کی ہے۔آپ فرماتے ہیں میں نے نثری نظمیں لکھ کر ادبی وقار کو ٹھیس پہنچایا ہے! کمال ہے برادرم نورالحسنین میری نثری نظمیں کئی انتھالوجیوں میں شامل ہوگئی ہیں۔ کتنے ہی غزل گو ہیں جن کی غزلیں کسی انتھالوجی سے محروم ہیں۔

<u>سید سجاد اختر:۔</u> آپ کا شمار اُردو کے شاعر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے آپ کے خیال میں افسانے کی زبان کیسی ہونی چاہئے؟

<u>پروفیسر حمید سہروردی:۔</u> آپ نے جو بات کہی ہے کہ شاعر افسانہ نگاروں میں میرا شمار ہوتا ہے تو یہ بات درست ہے افسانے کی زبان نثر ہی کے تقاضوں کو پوری کرنے والی ہو لیکن جب افسانے میں ایک اسرار پیدا ہوجاتا ہے تو وہاں زبان نثر کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہتی ہے نثر میں آہنگ ہوتا ہے شاعری میں نغمگی ہوتی ہے اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے تاکہ یہ حدیں آپس میں گڈمڈ نہ ہوجائیں۔

<u>ڈاکٹر سید احمد قادری:۔</u> اُردو کے نقادوں سے آپ کو کوئی شکایت:

<u>پروفیسر حمید سہروردی:۔</u> اُردو کے نقادوں سے کیوں شکایت ہوگی بھائی قادری صاحب نقاد اپنا کام کرتا ہے اس کی نیک نیتی پر شک کیوں کریں کوئی نقاد کسی مکتب فکر سے وابستہ ہے، کوئی کسی دوسرے مکتب فکر سے ہر نقاد اپنی مقدور بھر کوشش اور اپنی آئیڈیالوجی کے تحت فن پارہ کی فہم تک رسائی کی کوشش کرتا ہے کیا نقاد کا کہا حرف آخر ہے؟ ایسا تو نہیں ہے پھر افسانہ نگار کا اپنا کام یہی ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ لکھے اور فنی تقاضوں کو بھرپور استعمال کرنے کی کوشش کرے۔

حمید سہروردی (گلبرگہ)

کربلا بہت دور ہے

فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد سے ہی علی جان مسرور وشادماں نظر آرہا تھا۔اس کے دل میں کوئی خوشی سمائی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہر کام میں اس قدر تیزی دکھا رہا تھا کہ ہر کام دیکھتے ہی دیکھتے پورا ہوتا جارہا تھا۔صاحجی کو علی جان نے چائے لاکر دی اور صاحب جی نے کہا:''میں آج ایک ضروری کام سے باہر جارہا ہوں''۔اتنا کہہ کر صاحب جی اپنے ضروری کام کر کے واپس آئیں گے پھر میں اپنی خوشی سے واقف کراوں گا۔علی جان، کبھی ادھر، کبھی ادھر، اس کے قدم ایک جگہ نہیں رک رہے تھے کبھی گنگنا رہا ہے، کبھی بچوں کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہے۔کبھی ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی صفائی کے لیئے جارہا ہے۔شاید ہی کبھی علی جان اتنا خوش رہا ہوگا۔

خلاف توقع صاحب جی دوپہر میں گھر واپس نہیں آئے۔علی جان نے اتنا کبھی انتظار نہیں کیا ہوگا۔علی جان کو کسی قدر تشویش ہونے لگی۔آخر کیا وجہ ہے! آج صاحب جی دوپہر میں کیوں نہیں آئے۔؟؟۔

سورج دن بھر کے منظر سے معدوم ہوتا ہوا پہاڑوں کی اس طرف چلا گیا۔صاحب جی آئے خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔علی جان نے انھیں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور فوراً چائے بنانے کے لیے مستعد ہوگیا۔پھر اُسے خیال آیا، آجصا حجی ناشتے کے فوراً بعد ہی کسی کام سے باہر چلے گئے تھے۔ان سے پوچھ لیا جائے کہ کیا وہ کھانا کھانا پسند کریں گے۔ویسے علی جان کو معلوم تھا کہ صاحب جی اس وقت کھانا نہیں کھائیں گے وہ تو مغرب کی نماز پڑھ کر ہی رات کا کھانا کھایا کرتے ہیں۔

علی جان، صاحب جی کا ایسا ملازم جو ہر وقت سائے کی طرح ساتھ رہتا ہے۔بیگم صاحب کے انتقال کے ءبعد رلی جان کی توجہ صاحب جی پر زیادہ تھی۔ وہ ہر وقت ان کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔

علی جان نے ساحب جی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا:..................

''صاحب جی! کھانا لگاؤں۔''

صاحب جی کپڑے بدل کر آرام کرسی پر بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔خاموش۔علی جان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔پھر بھی اس نے ان کے قریب جا کر آہستہ سے پوچھا:''کیا، صاحب جی! بہت

تھک گئے ہیں؟''

صاحب جی نے کروٹ بدلی اور کہا:نہیں،کوئی خاص بات نہیں ہے۔تم جاؤ.......................تمہیں معلوم ہے، یہ میرے کھانے کا وقت نہیں ہے۔

''مگر آپ صبح صرف ناشتہ کر کے چلے گئے تھے۔دوپہر کا کھانا بھی آپ نے نہیں کھایا''۔علی جان اپنی ہی ترنگ میں کہتا رہا۔

''اب تم جاؤ مجھے اکیلا رہنے دو''۔

''کیوں سر درد ہو رہا ہے؟''

''نہیں ؟''

''پھر کیا بات ہے؟صاحب جی!''

صاحب جی خاموش رہے اعر پھر آرام کرسی پر پیر پھیلا کر آنکھیں بند کرلیں۔علی جان سوچتا رہا ....کہیں آج صاحب جی ، بیگم صاحب کی یادوں ہیں تو کھوئے ہوئے نہیں یا پھر کسی اور کام کی وجہ سے ....مگر کون سا کام ہوسکتا ہے؟!صاحب جی تو ہر وقت ہشاش بشاش رہتے ہیں۔ہوسکتا ہے،دن بھر کی تھکن سے نڈھال ہوگئے ہوں ....علی جان نے بغیر کسی اطلاع کے کمرے سے نکل گیا،اور کچھ دیر میں چائے لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ صاحب جی بدستور اسی حالت میں تھے۔

علی جان نے انھیں آواز دی: آپ تھکے ہوئے ہیں لیجیئے چائے لے کر آیا ہوں۔

اب صاحب جی ''ہوں'' کہہ کر آرام کرسی پر سیدھے ہوگئے،اور سامنے آئے ہوئے ٹیبل پر رکھی ہوئی ٹرے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔علی جان نے آگے بڑھ کر چائے کا کپ صاحب جی کو دے دیا، پھر اپنے ہی موڈ میں کہنے لگا :''کیا،۔۔۔صاحب جی!طبیعت ٹھیک نہیں؟''

''نہیں،بس یونہی۔۔۔۔۔کسی قدر تھکن سی محسوس کر رہا ہوں۔''

''میں نے سمجھا،کوئی خاص بات ہے۔''علی جان،صاحب جی کو بات کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوا۔

''صاحب جی! آپ نے کھانا نہیں کھایا!''

''نہیں، میں نے کھانا کھالیا تھا اپنے دوست کے گھر۔''

''صاحب جی! ایک بات کہوں ؟آج فجر کے بعد ہی سے مجھے احساس ہو رہا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

''ہاں، ہاں، کہو، کیا بات تمہارے احساس میں اتر آئی ہے؟''

علی جان کچھ دیر خاموش رہا اور، ادھر ادھر کمرے پر نظر ڈالی۔

''کہو، کیا بات ہے؟ خاموش کیوں ہو؟ ادھر ادھر کیوں دیکھ رہے ہو؟'' کوئی راز کی بات ہے ؟۔۔۔۔۔کیوں؟ پھر اب کئی شادی کرنے کا خیال تو نہیں آیا؟!''

''نہیں،صاحب جی!اس عمر میں شادی کرکے کیا کروں گا!''

''تو پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟!''

''بات یہ ہے کہ آج صبح۔۔۔۔۔۔۔''

''ہاں،بھئی آج صبح کیا ہوا۔۔۔؟!''

علی جان پھر صاحب جی کو دیکھنے لگا۔

''کہو،کیا کہنا چاہتے ہو!۔۔۔۔مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟!''میری مدد کی ضرورت ہے؟''

''صاحب جی! آج صبح میرے جی میں آیا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔''

''کیا آیا تمہارے جی میں؟۔۔۔۔جلدی کہو۔میری مدد کی ضرورت ہو تو کہو، میں تمہاری مدد کروں گا۔''

''ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔آپ کی مدد کی ضرورت تو ہے۔۔۔۔۔میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔۔۔''

''اب کہو گے بھی یا یوں ہی پہیلی بجھواتے رہو گے!''

''ہاں،تو۔۔۔۔۔۔۔۔صاحب جی!۔۔۔۔۔۔۔۔آج صبح میرے جی میں آیا کہ میں کربلا جاؤں۔۔۔۔۔''

''کیوں نہیں!ضرور جاسکتے ہو۔۔۔لیکن تم کربلا کیوں جانا چاہتے ہو؟!''

''صاحب جی!''سچ تو کہ ہے، مجھے خود بھی معلوم نہیں۔۔۔۔۔۔''اور علی جان صاحب جی کی طرف دیکھنے لگا۔

''بھئی یہ کیا بات ہوئی کہ تم کربلا جانا چاہتے ہو۔۔۔۔کیوں جانا چاہتے ہو،معلوم نہیں!''

''بس!،صاحب جی!فجر کی نماز کے بعد یہ خیال آگیا۔''

''میاں! کربلا جا کر کیا کرو گے؟''

علی جان ویسا ہی کھڑا رہا اور زیر لب بڑبڑانے لگا۔۔۔۔۔۔۔''ہاں! کربلا جا کر

کیا کروں گا!!''

جب' کربلا' تمہارے احساس میں شامل ہے تو کربلا جا کر کیا کرو گے! وہاں تمہاری آنکھیں اشک بار ہو جائیں گی۔''

صاحب جی! آنکھیں اشک بار کیوں ہوں گی؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کربلا تو عبرت کی جگہ ہے ۔''

''کیا کہا۔؟!۔۔۔۔۔''

''کچھ نہیں، صاحب جی! یہ سب کچھ تو آپ کی خدمت میں رہنے کا نتیجہ ہے۔ سچ تو یہ ہے، صاحب جی!، جب آپ جھوم جھوم کر کتابیں پڑھتے رہتے ہیں تو میں آپ کو دیکھ دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کربلا کا دیکھ لیتا ہوں اور ایسا لگتا ہے، صاحب جی! اب ہیں کربلا کا گیان پا ہی لوں گا۔''

''تم جب کربلا اپنی آنکھوں میں بسائے ہوئے ہو تو پھر کربلا جا کر کیا کرو گے؟ نہیں بابا نہیں!!۔۔۔۔۔میرے پڑھتے رہنے سے تمہیں کربلا کیوں کر سمجھ میں آئے گا۔!۔۔۔کربلا تو متقی اور پرہیز گار لوگوں کا مقدر ہے۔''

''تو، کیا میں کربلا نہیں جا سکتا؟''

کیوں نہیں ! کیوں نہیں !!۔۔۔۔۔۔۔تم بھی تو متقی اور پریز گار لوگوں میں سے ہو!''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''پھر میں کربلا کس طرح جا سکتا ہوں؟''

''چونکہ تم نے کربلا جانے کا ارادہ کیا ہے، تم ہی جانو کہ کیسے جاؤ گے۔۔۔۔۔۔میں کیوں کر جانوں!۔۔۔۔۔میں تو ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جن کا مقدر کربلا ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔اور پھر کربلا تو بہت دور ہے۔''

''مگر میں تو کربلا جاؤں گا۔''

''تمہارا جی جانا چاہتا ہے تو جاؤ ۔ میں تمہارے اس نیک ارادے کو کیوں کر بدل سکتا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔!''

''مگر، صاحب جی! راستہ تو آپ ہی کو بتلانا ہوگا۔''

''میرے مقدر میں کربلا نہیں ہے۔''

''ایک بات کہوں صاحب جی! آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟!

''ارے! تم تو باتیں کیے جا رہے ہو۔ میں کیوں تمہاری بات کا بُرا مانوں گا۔۔۔!۔۔۔۔۔۔کہو

!''

''صاحب جی! میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا، میری بند آنکھوں میں سُرخ رنگ ہی نظر آتا ہے۔ کیا کربلا کی زمین بھی سُرخ ہے؟''

''پتہ نہیں، تم جانو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!''

''پھر آپ کتابوں میں کیا پڑھتے ہیں صاحب جی؟!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

علی جان، صاحب جی کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھنے لگا۔

صاحب جی نے آرام کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔''تم نہیں مانو گے۔، میں کتابوں میں کچھ اور ہی پڑھتا ہوں۔ تم نہیں سمجھو گے۔''

''اور اخبارات میں کیا ہوتا ہے؟ صاحب جی!''

''خبریں ۔۔۔۔۔۔۔اور کون کون سی ضروری اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے ۔۔۔۔۔۔''

''پھر سرکار کیا کرتی ہے؟!، صاحب جی!''

''سرکار بھاشن سیتی ہے، اور کیا کرتی ہے!''

''کیا وہ بھاشن ہی دیتی ہے۔؟''

''ہاں! وہ صرف بھاشن ہی دے سکتی ہے!''

''ایسا کیوں ہوتا ہے؟، صاحب جی!''

''ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ کربلا بہت دور ہے۔ بس!۔۔۔۔۔۔۔تم اب یہاں سے جا سکتے ہو۔''

''کیا۔، صاحب جی! ناراض ہو گئے؟''

''نہیں، علی جان! اب تم جاؤ۔۔۔۔۔۔۔تم نہیں سمجھو گے۔۔۔۔۔۔۔'جو لوگ کربلا سے نہیں گزرتے وہ بھاشن دے کر شانت ہوتے ہیں'

''اور جو مطمئن نہیں ہوتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟''۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔''وہ کربلا کے آرزومند ہوتے ہیں۔''

''اور وہ، صاحب جی۔۔۔۔۔۔''

''اور کون۔۔۔۔۔۔۔۔؟''

''وہ جو کربلا کو بھی جانتے ہیں اور بڑھتی ہوئے قیمتوں سے بھی واقف ہوتے ہیں، وہ کیا کرتے ہیں؟''

''وہ تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ تو بس کربلا ہیں بسر ہوتے رہتے ہیں۔''

''ایسا کیسے ہوتا ہے؟ صاحب جی!''

''یہ مت پوچھو کہ یہ کیوں کر ہوسکتا ہے۔اب تم جاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟''

صاحب جی خاموش ہوتے ہیں اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیتے ہیں اور آرام کرسی پر پیر پھیلا یے ہیں۔

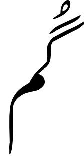
علی جان، صاحب جی کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ بھی لفظوں کو تھام لیتا ہے۔اور صاحب جی کو آرام کرتے دیکھ کر کمرے سے، بڑبڑاتا ہوا باہر آتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

شاید کربلا بہت دور ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مٹی کنکر اور ہوا : پروفیسر حمید سہروردی

شام کے منظر نامے میں
خواب سبھی کچھ بکھرے بکھرے رہتے ہیں
رات تلک اک سناٹا
مٹی کنکر اور ہوا
سب آہستہ آہستہ
بولنے لگتے ہیں
رات تمہاری ہوتی ہے
رات مری کب ہوتی ہے
خواب سے آگے کچھ بھی نہیں
رات سے آگے کچھ بھی نہیں

حمید سہروردی (گلبرگہ)



عزیز الحق کسی انجانے خوف کی وجہ سے پریشان لگ رہے تھے۔افراد خاندان، ان کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔انہوں نے گھر کے کسی فرد سے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے یہ اندازہ کرلیا جائے کہ آخر وہ کس پریشانی سے دوچار ہیں۔

عزیز الحق علی الصبح پانچ بجے اٹھتے اور خاندان کے بڑوں اور چھوٹوں کو بھی نیند سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوکر فجر کی نماز کے لئے مسجد کی طرف چل پڑتے۔ان کے ساتھ بڑے اور بچے بھی رہتے۔نماز ادا کرنے کے بعد وہ کبھی مسجد ہی میں قرآن پاک کی تلاوت کرتے یا پھر گھر آ کر۔تلاوت کلام پاک کے بعد وہ بچوں کے ساتھ، خاص طور پر آداب واخلاق کی باتیں کرتے۔ پھر اخبار کا مطالعہ کرتے اور اپنے آفس جانے کی تیاری کرنے لگتے۔

پتہ نہیں کیوں ادھر کچھ عرصے سے جیسے ان کے اندر کوئی چیز گم ہوتی جارہی تھی یا کسی خاص بات کا عرفان ہونے والا تھا۔بس ایک بے چینی کے ساتھ ''گم'' کی سی کیفیت، ان کے قلب وذہن پر طاری رہتی۔ ماں اور باپ، جب بھی ان سے دریافت کرتے، ان کی، اس کیفیت کے بارے میں، وہ مسکرا کر خاموش ہوجاتے تھے۔ والدین بھی، ان کے، اس رویے سے پریشان سے تھے۔ایک دن، ان کی خالہ نے ان کی ماں سے کہا ''رقیہ تم عزیز الحق کو ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں لے جاتیں۔آخر انہیں ایسی کون سی فکر کھائے جارہی ہے کہ وہ دن پہ دن اپنے آپ میں سکڑے، سمٹے جارہے ہیں۔ان کے چہرے کی رونق بھی کم ہوتی جارہی ہے''۔

ماں نے کہا ''میں نے بارہا عزیز میاں سے کہا ہے، مگر وہ صرف مسکرا کر ہی رہ جاتے ہیں۔اور ڈاکٹر کے پاس جانے کو تیار نہیں ہوتے''۔۔۔خالہ نے پلو سر پر درست کرتے ہوئے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا ''کہیں وہ اپنی شادی کے بارے میں تو نہیں سوچ رہا ہے''۔

ماں نے پاندان اپنی بہن کی طرف سرکاتے ہوئے کہا ''شادی کے لئے تو تم خود جانتی ہو، میں کب سے کہہ رہی ہوں، زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ ہے۔ بہو کے اچانک ڈیلیوری میں مرجانے کے بعد سے، میں انہیں سمجھا رہی ہوں مگر وہ کچھ بولتے ہی نہیں۔ پتہ نہیں کیوں وہ بہو کی موت کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں۔عزیز میاں نے ذرین

سے کچھ ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا کہ اس کی دل آزاوری ہوئی ہو۔ اب اکیلے میں ان کی کیا باتیں ہوتی تھیں میں تو جاننے سے رہی، زرین بھی کبھی لب پر شکایت نہیں لائی''۔

خالہ فکر مند ہوگئیں ''اور کون سی ایسی بات ہوسکتی ہے۔ عزیز میاں اپنے آپ میں گم رہتے ہیں۔ کسی عامل سے رجوع کر کے ان کی کیفیت معلوم کرو''۔

ماں چھالیہ کترتے ہوئے کہنے لگیں ''ایسی کوئی بات نہیں۔ عزیز میاں اللہ کی ذات پر یقین کامل رکھتے ہیں اور اسلامی تعلیمات پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ اگر میں کسی عامل کی بات، عزیز میاں سے کروں گی تو پورے گھر کو سر پر اٹھالیں گے''۔

''ایسا کرتے ہیں کل جمعرات ہے۔ ہماری درگاہ میں ایک عامل صاحب رہتے ہیں۔ ان سے غائبانے میں، عزیز میاں کی حالت بتا کر تمام حالات معلوم کرلیں گے''۔

ماں نے بے یقینی کے انداز میں کہا ''ٹھیک مگر مجھے لگتا ہے کہ اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا''۔

ابھی ان دونوں بہنوں کے درمیان عزیز میاں کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں کہ عزیز میاں، ماں اور خالہ کے درمیان آ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ خالہ کے گھریلو حالات پوچھنے لگے، خالہ نے سوچا، چلو عزیز میاں آج ان سے اتنے لگاؤ سے باتیں کر رہے ہیں۔ خالہ نے جہاں دیدہ نظروں سے عزیز میاں کو دیکھا۔ اور ان سے پوچھا۔

''کیوں عزیز میاں تم دلہن کے انتقال کے بعد سے گم صم سے رہتے تھے۔ آخر کیا ماجرا ہے؟''

''نہیں خالہ جان ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اللہ کی دی ہوئی چیز واپس لوٹ گئی۔ ہر جاندار اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اس پر مایوس اور پریشان ہونے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ ہمارے درمیان سے جو شخص اٹھ جاتا ہے۔ اس کی یادیں خوشگوار بھی ہوسکتی ہیں اور ہماری سوچ کے منفی انداز کی وجہ سے ناخوشگوار بھی۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ہر شخص زندگی میں اپنی ایک جگہ بنا لیتا ہے اور اس کے بعد وہ جگہ خالی ہی رہتی ہے۔ اسے دوسرا کوئی پر نہیں کرسکتا۔ زرین کو ہی دیکھئے اس کے ساتھ شب و روز اچھے گزرتے رہے کبھی نہ کوئی تکرار نہ جھگڑا۔ وہ سچ مچ بردباری اور اخلاق کا پیکر تھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ خاندان کے کسی فرد سے وہ بے ادبی سے پیش آئی ہو۔ آپ خود بھی تو جانتی ہیں نا۔ آپ نے کبھی اس کے لہجے میں ناشائستگی محسوس کی......درمیان میں ہی عزیز میاں کی ماں بول اٹھیں۔

''میں نے کبھی بہو کی زبان سے ایسا کوئی لفظ نہیں سنا جو بار خاطر ہو......اور نہ ایسی کوئی حرکت، اس سے سرزد ہوئی جو کسی کی ناراضگی کا سبب بنے۔ میں نے بھی اس کو بیٹی کی طرح رکھا''

خالہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا ''میں بھی اس کی تعریف کئے بنا نہیں رہ سکتی......مگر بیٹے تم اتنے گم صم کیوں رہتے ہو، تمہاری یہ کیفیت ہمارے لئے باعث تشویش ہے''۔

خالہ آپ بھی عجیب باتیں کرتی ہیں، آپ تو جانتی ہیں میں ویسے بھی کم ہی بولتا ہوں۔ یوں تو زرین کے انتقال کے بعد بھی میرا دل، اس کی موجودگی سے خالی نہیں ہوا ہے۔ لیکن ہم ایک عرصے تک دو قالب ایک جان بن کر رہے پھر وہ اچانک ہمیشہ کے لئے دور چلی گئی یہ خلا تو محسوس ہوتا رہا ہے گا۔ اس کی یاد تو مجھے کچوکے لگاتی رہے گی۔

اس کی اور میری بیٹی......خالہ آپ میری کیفیت نہیں سمجھ سکیں گی''۔

''پھر بھی عزیز میاں کوشش کرو کہ اس صورتحال سے نکل آؤ''۔ خالہ نے بڑے معنی خیز انداز میں کہا اور پھر اپنی بہن سے مخاطب ہوئیں ''بہت دیر ہوگئی ہے۔ میں گھر چلتی ہوں''۔

دونوں بہنیں ایک ساتھ اٹھیں، دونوں کے قدم آگے بڑھنے لگے۔ خالہ مکان کے باہر نکل گئیں اور عزیز میاں کی ماں گھر میں واپس چلی آئیں۔ عزیز میاں اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عزیز میاں سوچنے لگے۔ کیا واقعی مجھ پر ''گم'' ہونے والی کیفیت اس قدر طاری ہوگئی ہے کہ افراد خاندان محسوس کر رہے ہیں۔ حالانکہ میں گھر میں ہر ایک کے ساتھ ویسی ہی باتیں کرتا ہوں جیسی پہلے کیا کرتا تھا۔ امی اور خالہ کے ذہن میں یہ بات کیوں سرایت کر رہی ہے کہ میں گم ہوتا جا رہا ہوں؟''۔ کیا واقعی زرین، میری شخصیت میں اتنی شریک تھی کہ اس کے بغیر میری اپنی ذات خالی خالی ہو کر رہ گئی ہے؟ ابا بھی مجھ سے بار بار ایسا کیوں کہتے رہے ہیں کہ عزیز میاں تم اپنے دوستوں سے ملا کرو اور ان کے ساتھ خوش گپیاں کیا کرو تو وقت کے گزرنے کا احساس نہیں ہوگا۔ رہی بچی تو اس کی دادی، اس کی دیکھ بھال کرتی رہیں گی۔ اور میں خود بھی تو دن بھر گھر پر رہتا ہوں۔ تم بچی کی فکر بالکل ہی مت کرو''۔

عزیز میاں اپنے لکھنے پڑھنے کی میز پر آ بیٹھے۔ میز پر رکھا ہوا اخبار اٹھایا۔ ان کی نظر میں اخبار کی سرخیوں پر پڑیں۔ آج کی شاہ سرخی تھی۔ ''سرکاری دفاتر نذر آتش۔ گاڑیوں پر پتھراؤ۔ پانچ بسیں جلادی گئیں۔ فوج کا فلیگ مارچ''۔

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ آج کل اخباروں میں قتل و خون، غارت گری، لوٹ مار کی خبریں ہی شائع ہو رہی ہیں۔ کہیں سکون نہیں......وہ کرسی پر سیدھے ہو کر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اخبار ٹیبل پر رکھ دیا۔ اب ان کی نظریں کمرے کی چھت کو گھور رہی تھیں۔ خارجی صورتحال اور داخلی کیفیات کے دمیان ایک سنگھرش جاری تھا۔ ان کی آنکھیں بدستور، چھت کو گھور رہی تھیں، مگر ان کے ذہن میں کئی طرح کی تصویریں آ رہی تھیں اور جا رہی تھیں۔ بظاہر وہ ساکت و جامد تھے۔ لیکن ان کے چہرے پر آتے جاتے رنگ ان کی دلی حالت کا اظہار کر رہے تھے وہ ایک بار پھر کرسی پر سیدھے ہوئے اور بڑبڑانے لگے کہ زمین پیروں کے نیچے سے کھسک رہی ہے اور سر سے آسمان سرک رہا ہے۔ پتہ نہیں کون سی سمت سے کون آئے گا اور گمشدہ زمین اور آسمان کو ان کی اپنی اپنی جگہ پر محفوظ کر دے گا؟ کیا یہ ممکن ہے؟ یا پھر ظلمتوں کے پردے آن پڑیں، گے؟۔

''بیٹا تم کب تک اپنے آپ میں گم رہو گے؟ اجالے کی طرف قدم بڑھاؤ اب بہت ہو چکا''۔ اچانک ان کے ابا نے کمرے میں داخل ہوتے رہے کہا۔ عزیز میاں نے اپنے ابا کو حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔ اور ان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ان کا سارا بدن لڑکھڑا سا گیا۔ پھر انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

''ابا آپ شاید سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ ہم نے اپنی ''اصل'' سے ناطہ توڑ لیا ہے۔ اور میں ہی نہیں ہم سبھی ''گم'' ہو جانے کے اندیشوں سے دوچار ہیں''۔

● ● ●

حمید سہروردی (گلبرگہ)

اِدھر اُدھر

اُس کی ٹیبل پر کاغذات بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ کچھ کتابیں کُھلی ہوئی تھیں اور کچھ اِدھر اُدھر رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے سر کے اوپر ٹیوب لائٹ اپنی زندگی جی رہا تھا۔ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کے لیے زندگی کے انکشافات کرنے میں مدد دے رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا تحریر کر رہا تھا۔ لکھتے لکھتے اس نے بائیں ہاتھ کی طرف رکھے ہوئے دودھ کے گلاس کی طرف اپنا بایاں ہاتھ بڑھایا۔ گلاس ہاتھ میں نہیں آیا بلکہ ٹیبل پر سے نیچے زمین پر گر گیا اور اس کے ٹکڑے زمین پر پھیل گئے ۔۔۔۔اس نے گلاس کے ٹکڑے کھڑکی سے باہر گلی میں پھینک دیے ۔اور دودھ سے بھرے ہوئے فرش کو کپڑے سے صاف کر کے پھر سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

پتہ نہیں آج کیوں اُس نے اپنے روزانہ ملنے والے دوست سے روکھے پھیکے انداز میں بات کی تھی ۔روزانہ ملنے والے دوست نے اس کے روّیہ سے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ وہ ان دنوں بہت مصروف ہوگیا ہے یا اپنی گھریلو زندگی کے بہت سے معاملات سے ذہنی انتشار کا شکار ہوگیا ہے۔ دوست نے زیادہ باتیں کرنا ضروری نہیں سمجھا اور جلد ہی اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے۔

کرسی پر بیٹھے ہوئے اس نے سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس اٹھالی اور اس کی نظر میں سامنے دیوار پر لگے ہوئے عمر خیام کی رباعی کی تشریح لیے ہوئے کیلنڈر کی طرف اٹھیں ۔ٹھیک ہے کہہ کر وہ تاریخ دیکھنے لگا۔ بارہ تاریخ کو یہاں سے جانا ہوگا۔ سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے اس نے کرسی سے پشت لگا دی اور پھر آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔

’’سب کچھ لمحوں میں بدلتا ہے اور لمحوں ہی میں سنورتا ہے۔ کوئی کب تک جتن کر کے اس کے حوالے کرتا رہے گا۔‘‘

سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر اس نے پین ہاتھ میں اٹھا لیا۔ پین بہت دیر سے کُھلا پڑا ہوا تھا اور پنکھا بھی چل رہا تھا۔۔۔۔پین کی نب پر انک سوکھ گئی تھی ۔کچھ لکھا نہیں گیا۔ شاید تساہلی تھی کی بیزاری اس نے پین کو جھٹک کر لکھنے کی کوشش نہیں کی۔

کیوں اس نے اچانک روتے ہوئے کہا تھا کہ تم میری طرف کوئی توجہّ نہیں دیتے ۔ مجھے تمہارے پاس آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہوگیا ہے ۔ ہر وقت کام کام کی رٹ لگائے رہتے ہو۔۔۔۔۔آخر میں تمھارے پاس اس لیے تو آئی ہوں کہ تم سے باتیں کروں ۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ادھر دو ماہ سے تمھاری طبیعت خراب چل رہی ہے۔ یہاں آ کر یہ تو میں نے دیکھا کہ تم روزانہ دوا کھاتے رہتے ہو۔ وہ بھی بھابھی کے کہنے پر۔ کیا تم اپنے آپ کے دشمن ہو۔ ایسا کیوں کرتے ہو بھیاّ۔ اپنی صحت کا خیال رکھو۔ وہ روتی رہی۔

اس نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ تم روتی کیوں ہو۔ کیا میں مرجاؤں گا۔ تم روتی کیوں ہو۔۔۔اور کیا تمھارے آنسو میری بیماری کو یا میرے کام کو کم کر سکتے ہیں۔ دور کر سکتے ہیں۔ تم رؤو نہیں میری بہنا۔ اتنا کہہ کر اس نے وہ ٹیبل پر رکھی ہوئی چائے کی پیالی اٹھا کر اپنی بہن کو دی تھی اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ ’’تم روتی ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔‘‘ بہن چائے کی پیالی لینے کے بجائے اس کی گود میں سر رکھ کر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی اس کے رونے کی آواز سُن کر اس کے بچےّ آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے اپنی ممی اور ماما کے قریب آئے اور ممی کو روتے ہوئے دیکھ کر دونوں لڑکیان اور لڑ کا زور زور سے رونے لگے۔

اس نے کرسی سے اٹھ کر دونوں لڑکیوں اور لڑکے کو اپنے پاس بلا لیا۔ دونوں لڑکیوں کو ٹیبل پر بٹھایا اور لڑکے کو گود میں لے کر کہنے لگا۔

پیارے بچو! روتے کیوں ہو۔ کیا میں مرنے والا ہوں ۔ارے ارے تمھیں دیکھ کر میں کتنا خوش ہوتا ہوں ۔مگر بچےّ اپنی ماں کو روتا دیکھ کر ماما کی باتوں سے بے اثر ہی رہے۔

ٹیبل پر رکھی ہوئی چائے ٹھنڈی ہوگئی تھی ۔اس نے اپنی بچی کو آواز دی۔ دیکھو بیٹا یہ چائے لے جاؤ اور دوسری گرم چائے لے آؤ۔ کیوں بہنا تم گرم چائے پیوگی نا۔۔۔ارے تم ہنسیں کیوں نہیں ۔۔۔میری پیاری بہنا۔

بہن نے ایک ہچکی لی اور زور سے رونے لگی ۔اس کے رونے کی آواز سُن کر اس کی ماں بھی دیوان خانے میں چلی آئی۔ کیوں کیا ہو رہا ہے۔ کیوں رو رہی ہو بیٹی؟ بہن نے جواب نہیں دیا۔ ساڑی کے پلّو سے آنکھیں پونچھنے لگی اور اس کی دونوں لڑکیاں اور لڑکا حیرت زدہ کبھی وہ اپنی ممیّ کو کبھی اپنی نانی کو اور کبھی ماما کو دیکھ کر وقفہ وقفہ سے رونے لگتے ہیں۔

اس کی نظریں زمین میں دھنسی ہوئی تھیں ۔ماں، بہنا کے قریب بیٹھی ہوئی ہے اور بار ہا ایک ہی سوال کر رہی تھی کہ بیٹی کیوں رو رہی ہو۔ اور بہنا ہے کہ بت بنی بیٹھی ہوئی ہے۔ تینوں خاموش ہیں، ماں، بیٹا اور بیٹی اور تینوں بچےّ بھی بڑوں کی خاموشی کو گمبھیر بنائے ہوئے ہیں ۔اچانک ماں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور خاموش چہرہ متفکر، پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگا۔ بہنا نے اپنی لڑکیوں سے کہا کہ بچیو تم جا کر باہر آنگن میں کھیلو

۔دیکھتی نہیں کہ ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر اپنے لڑکے سے کہا جاؤ۔ بیٹا تم بھی باجی کے ساتھ کھیلو۔لڑکا ماما کی گود سے اُترا اور اپنے کرتے سے آنسو پونچھتے ہوئے کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر اپنی بہنوں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

ماں نے روتے ہوئے کہا۔۔کیوں بیٹا تمھیں کونسا روگ لگا ہوا ہے کہ تمھاری بیوی ہر خط میں یہی لکھتی ہے۔تمھاری اس سال طبیعت گرتی جا رہی ہے اور ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہتے ہو۔کہیں کسی آسیب کا سایہ تو نہیں ہوا۔تم بہت چھوٹی عمر سے راتوں کے جاگنے اور سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ گردی کے عادی رہے ہو۔بہو کہہ رہی تھی کہ تم یہاں بھی یہی سب کچھ کرتے رہے ہو۔تم کسی عامل سے ملتے تھے یا نہیں؟ وہ خاموش ہی رہا ---

ماں نے پھر کہا۔تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟

ماں، میں کیا کروں۔ میں خود نہیں جانتا۔کیا کچھ ہو رہا ہے۔ میں کیوں موم کی طرح پگھلتا جا رہا ہوں ۔اس نے دھیرے سے کہا۔

اسی لیے تو کہتی ہوں۔تم کسی اچھے عامل کو بتاؤ۔تمھیں ضرور کوئی آسیب کا سایہ ہوا ہے۔

تم نہیں جانتی ہو۔میں ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔

ہاں میں جانتی ہوں۔ماں نے روتے ہوئے کہا۔تمھارا اگر بس چلے تم مجھ پر بھی یقین نہیں رکھو گے۔

ماں تم سمجھتی کیوں نہیں۔وہ جھنجھلا گیا۔آسیب واسیب سب ہماری سمجھ کا چکّر ہے۔میں تم بن کر اپنے آپ کو نہیں سوچ سکتا۔

ہاں ہاں میں جانتی ہوں۔تم نہیں مانو گے۔مگر۔۔۔۔۔

ایسی بات نہیں ہے ماں۔تم میری بات کو سمجھو۔بیماری معمول ہے تم سب اتنے پریشان کیوں ہو ۔دیکھو میں بھلا چنگا ہوں۔تم فکر مت کرو۔

پلنگ پر لیٹی اس کی بیوی نے اندر کمرہ میں سے کہا۔میں ہر وقت کہتی ہوں کہ رات جاگا نہ کرو۔مگر یہ کسی کی بات مانیں تب نا۔

ارے تم کیا کہہ رہی ہو۔خاموش لیٹی رہو۔دیکھو تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ڈاکٹر نے تمھیں آرام کرنے ء کے کیلئے کہا ہے۔

ماں۔۔اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔چپ رہو۔تمھاری وجہ سے میری بہو بھی بیمار ہو گئی۔

کیا کہہ رہی ہو ماں۔ایسا نہی کہو۔میری وجہ سے، کیوں ثمینہ، ماں جو کہہ رہی ہے کیا یہ سچ ہے؟

میں کیا کہوں۔

تم بھی ان کے ساتھ ہو گئی ہو۔۔؟

بہنا پھر رونے لگی۔بھیاّ تم گھر چلو۔

کیا یہ گھر نہیں ہے۔۔۔تم۔۔۔۔

ماں نے بیچ میں ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔تم دونوں بیمار ہو۔تم دونوں کی یہ حالت دیکھ کر تمھارا لڑکا پریشان نہ ہو جائے اور وہ اپنے پوتے کو گود میں لیے۔میرا لاڈلا، میرا پیارا کہتے ہوئے اس کے گالوں پر چٹ چٹ پیار لینے لگی۔

لڑکا کھلونے دیکھ کر دادی سے کہنے لگا۔پپاّ لائے ہیں۔

اچھا تمھارے پپا کھلونے بھی لائے ہیں۔تمھارے پپاّ کو کیا ہوا ہے۔

لڑکے کے لیے دادی کا یہ سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔لڑکا دادی کی گود سے اٹھ کر اس کی بہنا کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔

بہنا بدستور رو رہی ہے۔

ماں نے بہنا سے پوچھا۔بٹی تو اتنا کیوں رو رہی ہے۔تیرا بھیاّ اچھا ہو جائے گا۔

پیاری بہنا تمھیں رونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔میں بیمار نہیں ہوں۔خدا کے واسطے تم رونا بند کرو۔

بہنا اور زور زور سے رونے لگی۔

ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔تم نے وطن سے آتے وقت بار بار کیوں بھیاّ کے پاس آنے کے لیے کہا تھا۔اسی لیے کہ تم یہاں آکر روتی رہو گی۔دیکھو بیٹا تمھارے پاس آنئے کے لیے یہ بے چین تھی اور جس رات یہاں آنے کا ارادہ تھا۔تمھاری بہنا سوئی ہی نہیں تھی۔

اس نے کرسی پر سے اُٹھ کر اپنی بہنا کے سر پر ہاتھ رکھا اور بڑی شفقت سے کہنے لگا۔بہنا تم رو رہی ہو ۔ارے کیا تمھارا بھیاّ مر جائے گا۔چل چل میری پیاری بہنا نا رو، نا رو، دیکھ میں تیرے لیے کیا لایا ہوں۔

نہیں بھیا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔وہ بدستور روتی رہی۔

بھیاّ وہیں فرش پر بہن اکے بازو بیٹھا۔چھوڑو تم میری بیماری کو۔میں بیمار نہیں ہوں۔ بھیاّ۔۔۔بھیاّ۔بھیاّ بھر ہوز ورز ور سے رونے لگی۔تم سمجھتے ہو۔بھیاّ۔مگر میں کیا سمجھوں۔۔۔۔۔!

ہاں بیٹی تم اتنا کیوں رو رہی ہو اور خود ماں بھی رونے لگی۔

اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے چہرے کو بھی صاف کیا اور اندر کمرہ میں جہاں اس کی بیوی پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی چلی گئی۔

پوچھا کیا تم نے ان سے کچھ کہا تھا۔ بہنا مسلسل کیوں رو رہی ہے؟

نہیں میں نے ان سے کچھ بھی نہیں کہا۔ بیوی نے تعجب کرتے ہوئے کہا۔۔۔ پھر بہنا کیوں رو رہی ہے۔

باہر سے اس کا لڑکا روتے ہوئے اندر کمرہ میں چلا آیا۔ پپاّ پپاّ وہ پم پم نہیں دے رہی ہے۔

اچھا اچھا ہم تمھیں ایک اور پم پم لا کر دیں گے۔ تم چپ رہو۔ اُس کا لڑکا اس کے پیروں سے لپٹ گیا اور پم پم کی رٹ لگاتا رہا۔

اُدھر دیوان خانہ میں دونوں ماں اور بیٹی آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگیں۔ بہنا بدستور روتے ہوئے اپنی بات کہہ رہی تھی۔

وہ آنگن میں رکھے ہوئے پانی کے مٹکے سے پانی لے کر پینے لگا۔ اُسے راحت سی محسوس ہوئی اور اس نے نل کے قریب جا کر اس کی ٹونٹی کھول دی۔ پانی نل سے گرنے لگا۔ اس نے نل کی ٹونٹی بند کر دی۔ اور ٹنکی کے نل کی ٹونٹی کھول دی۔ پانی ٹنکی میں آواز کے ساتھ گرنے لگا۔

ماں بیٹی سے کہنے لگی۔ تم کچھ بھی کہو۔ اُسے ضرور کسی آسیب کا سایہ ہوا ہے۔ خاموش خاموش رہتا ہے۔ دیکھو تو جب پچھلی چھٹیوں میں گھر آیا تھا۔ تو اس کی صحت کتنی اچھی تھی مگر اب تو آدھا اُتر گیا ہے۔

اُس کے اور بہنا کے بچے نل کی ٹونٹی کھول کر پانی میں کھیلنے لگے۔ بچوّں کے کپڑے گیلے ہو گئے۔ اس کی بیوی پلنگ پر لیٹے لیٹے بچوّں سے کہنے لگی۔ وہاں سے ہٹ جاؤ سردی لگ جائے گی۔

وہ بیوی کے پلنگ کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے بچوّں سے کچھ بھی نہیں کہا۔

ہاں بیٹی۔ ضرور کوئی آسیب کا سایہ ہوا ہے۔

ماں ایک بات کہوں تم بُرا تو نہ مانوں گی۔

میں تیری بات کا بُرا کیوں مانوں گی۔

ماں جب ہم یہاں آ رہے تھے نا۔ اس رات میں سو نہیں سکی تھی۔ ایسے نہیں ہے۔

ماں میری آنکھ کچھ دیر کے لیے لگ گئی تھی۔ میں ہربڑا کر اُٹھی تھی۔

کیوں کیا ہوا تھا۔ بیٹی۔ تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا تھا۔

ماں مجھے ڈر لگ رہا تھا۔۔۔۔

ڈر کس بات کا۔۔۔

ماں کیا کہوں، کیسے کہوں۔ اب بھی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔

مگر کیوں۔۔۔

کیا کہوں ماں۔۔ بھیاّ، بھیاّ کو میں نے۔۔۔۔۔۔۔

کیا ہوا۔۔۔ ایسا کیوں کر رہی ہو۔ بیٹی کہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو۔

نہیں ماں، میں بھیاّ کے بارے میں ایسا نہیں سوچ سکتی۔ نہیں میں کچھ نہیں کہوں گی۔

بہنا پھر رونے لگی۔

کہتی کیوں نہیں ہو بیٹی رو کیوں رہی ہو۔

وہ بھیاّ۔۔۔۔ میری آنکھ لگ گئی نا۔ جب۔ جب میں نے دیکھا۔ بھیاّ ٹیبل پر رکھا ہوا دودھ۔ نہیں ماں۔۔۔ میں نہیں کہوں گی۔۔۔۔

کہہ بھی دے بیٹی کیا آسیب کو دیکھا تھا۔

نہیں ماں۔۔۔ وہ دودھ۔۔۔۔۔ دودھ ٹیبل پر رکھا ہوا۔ بلّی نے پی لیا۔ بھیاّ باہر دالان میں پانی پینے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اور بلّی دیکھتے ہی دیکھتے تڑپ تڑپ کر مر گئی۔

بہنا بدستور رونے لگی ہے۔

پلنگ پر لیٹی ہوئی اس کی بیوی زور سے چیخی۔۔۔۔۔۔ اور اُٹھ بیٹھی۔ نہیں۔ ایسا ہرگز نہ کہو۔

اور وہ اس نے بہنا کے قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور زیرِ لب مُسکرا دی۔

راستے جو جاتے ہیں: حمید سہروردی

عمر سے گزرنا ہے
عمر کا سلیقہ باندھ
راستے جو جاتے ہیں
پھر کہاں وہ آتے ہیں
عمر کی صداقت کو
ڈھونڈ تو نہ ماضی میں
عمر کے جو لمحے ہیں
سیدھے سیدھے ہوتے ہیں
چشم دید ہوتے ہیں

پروفیسر بیگ احساس (گلبرگہ)

اِدھراُدھر: ......ایک تجزیہ

''ادھر اُدھر'' اپنے عنوان کی طرح مختصر اور خوب صورت افسانہ ہے۔یہ حمید سہروردی کے دوسرے افسانوں سے قدرے مختلف افسانہ ہے۔حمید سہروردی نے اس افسانے میں اپنی منفرد پر اسرار فضا سازی کو برقرار رکھا ہے لیکن اسکا اسلوب تکنیک طرز ادا ایسا ہے جس سے اردو کا قاری مانوش ہے۔ہمارا قاری اسی بیانیہ کا برسوں سے عادی ہے۔افسانے ختم کرنے کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ روایتی افسانہ نہیں ہے۔کئی باتوں کے لیے اسے دوسری اور تیسری قرات کرنی پڑتی ہے افسانہ دودھ بھرے گلاس کے ٹوٹنے سے شروع ہوتا ہے۔اور دودھ بھرے گلاس پر ختم ہوتا ہے۔اس طرح دائرہ بناتے بناتے افسانہ قاری پر اپنی گرفت مضبوط کرتا جاتا ہے۔

کہانی کا مرکزی استعارہ 'بیماری' ہے۔مرکزی کردار بیمار ہے۔اس مرد کردار سے جڑے تین نسوانی رشتے ماں، بہن اور بیوی کے ہیں۔مرکزی کردار خود نہیں جانتا کہ وہ کیوں موم کی طرح پگھلتا جارہا ہے۔بہن کو اپنی بھابھی یعنی مرکزی کردار کی بیوی پر شک ہے۔ماں تو ہم پرست ہے وہ بیماری کی وجہ آسیب کا سایہ سمجھتی ہے۔بیوی اس کا علاج کروارہی ہے۔کوئی نہیں جانتا یہ بیماری کیا ہے اور اس کا ذمہ دار کون ہے۔آخر میں افسانہ نگار بیوی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر کر ایک خلش میں مبتلا کر دیتا ہے اور شک کا تیر نیم کش جگر کے پار نہیں ہوتا۔

کہانی کردار کہانی کے واقعات سے پورے وجود کے ساتھ ابھرتے ہیں۔کرداروں کی ذہنی وقلبی کیفیات منکشف ہونے لگتی ہیں۔مرکزی کردار پڑھنے لکھنے سے دلچسپی ہے۔غالباً ادبی ذوق بھی رکھتا ہے کیوں کہ اس کے گھر مُس ایسا کیلنڈر ہے جس پر عمر خیام کی رباعی کی تشریح ہے۔وہ اپنی بے پناہ مصروفیت یا گھریلو معاملات کی وجہ سے ذہنی انتشار کا شکار ہے۔وہ کم عمری سے جاگنے اور سڑکوں وگلیوں میں آوارہ گردی کرنے کا عادی ہے۔اب بھی راتوں میں جاگتا ہے۔سگریٹ پیتا ہے۔لکھنے میں اتنا مصروف ہوتا ہے کہ دودھ پینے کی فرصت بھی نہیں ہوتی لکھتے لکھتے ہاتھ بڑھاتا ہے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے فرش پر دودھ پھیل جاتا ہے۔گلاس کے ٹکڑے وہ خود چن کر باہر پھینکتا ہے۔دودھ کو بھی وہی صاف کرتا ہے۔شاید بیوی کی بیماری کی وجہ سے یا خوف کی وجہ وہ بیوی کو تکلیف نہیں دیتا۔گھر میں کوئی ملازم بھی نہیں ہے۔وہ ذہنی خلفشار کی وجہ سے دوستوں سے روکھا برتاؤ کرتا ہے۔وہ بہن سے پیا

رکرتا ہے اس کے رونے سے پریشان ہوجاتا ہے۔اسے ہر طرح منانے کی کوشش کرتا ہے۔ماں کی عزت کرتا ہے۔جب ماں یہ کہتی ہے کہ اس کی وجہ اس کی بیوی بیمار ہوگئی ہے۔تو وہ چونکتا ہے اور بیوی سے تصدیق کرتا ہے۔اپنے بیٹے کا خیال رکھتا ہے۔بہن کے بچوں کے ساتھ بھی اس کا سلوک اچھا ہے۔اسے بارہ تاریخ کو کہیں جانا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ سب کچھ لمحوں میں بدلتا ہے اور لمحوں ہی میں سنورتا ہے''۔وہ کاہل ہے کچھ لکھنا چاہتا ہے لیکن نب پر سیاہی سوکھ گئی ہے وہ تساہل کی وجہ سے پین کی سیاہی چیک نہیں کرتا۔تساہل ہی کی وجہ سے وہ دوا وقت پر نہیں کھاتا بحیثیت مجموعی وہ ایک نارمل انسان ہے۔دوسرا اہم کردار بہن کا ہے۔جو روتے روتے کہانی میں داخل ہوتی ہے۔۔۔کوئی نہیں جانتا وہ مسلسل کیوں رورہی ہے۔بہن کے رونے کی وجہ پوچھنے میں کہانی آگے بڑھتی ہے پرتیں کھلتی ہیں۔کہانی کے اختتام تک بہن آنسو بہاتی رہتی ہے۔وہ اپنے بھائی کی مزاج پرسی کے لیے وطن سے ماں اور بچوں کے ساتھ سفر کر کے آئی ہے وہ ہفتہ بھر سے بھائی کے گھر میں ہے۔اس کا بغور مشاہدہ کررہی ہے۔اس کا گم سم رہنا دوائی وقت پر نہی کھانا۔نویں دن وہ بھائی کو پکڑ لیتی ہے اور رونے لگتی ہے کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ اتنا روکیوں رہی ہے۔آخر میں وہ اپنا خواب بیان کرتی ہے کہ ٹیبل پر دودھ کا گلاس رکھا ہوا ہے۔بھیّا پانی پینے کے لیے گئے ہوئے تھیت بلّی نے وہ دودھ پی لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے تڑپ تڑپ کر مرگئی۔اس خواب سے وہ خوفزدہ ہے وہ بھائی کے بارے میں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہتی۔لاشعور میں کہیں بھابھی کے بارے میں بدگمانی ہے۔ممکن ہے اسی بدگمانی نے وہ خواب دکھلایا ہو۔بہن کا یہ شک کہانی کی فضاء میں تناؤ پیدا کرتا ہے

ماں ایک عام سی متوسط طبقے کی عورت ہے۔اسے اپنے بیٹے کی فکر تو ہے لیکن ویسی تشویش نہیں جیسی بہن کو ہے۔اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس کے ذہن میں بہو کے متعلق کوئی بدگمانی نہیں ہے۔اسے بہو سے بھی ہمدردی ہے بیٹے کی بے راہ روی اور بیماری نے بہو کو بھی بیمار کردیا ہے۔اپنے پوتے کی بھی فکر ہے کہ دونوں کی یہ حالت دیکھ کر وہ بھی کہیں بیمار نہ ہوجائے۔وہ تو ہم پرست ہے اور اسے پورا یقین ہیکہ بیٹے پر کسی آسیب کا سایہ ہے وہ اپنی بیٹی کے مسلسل رونے سے پریشان بھی ہے رقیق القلب ہے اس لیے بیٹی کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے لگتی ہے

بیوی کا کردار پوری طرح اُبھر کر نہیں آتا ہے۔اپنی ساس کو وہی خطوط کے ذریعہ اپنے شوہر کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ کھویا کھویا رہتا ہے اس کی صحت گرتی جارہی ہے۔پورے افسانے میں اس کے تین چار مکالمے ہیں۔جس میں وہ شوہر کے رات میں دیر تک جاگنے کی شکایت کرتی ہے۔جب اس کا شوہر پوچھتا ہے کہ کیا وہ اس کی وجہ سے بیمار ہوگئی ہے تو کہتی ہے 'میں کیا کہوں' پھر کہانی کے اختتام پر اپنی نند سے خواب سن کر چیخ اٹھتی ہے پھر زیرِ لب مسکرادیتی ہے۔یہ مسکراہٹ معنی خیز بھی ہوسکتی ہے اور طنزیہ بھی۔

یہ افسانہ نفسیاتی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال ہے۔مرکزی کردار کی بیماری کا ردّعمل کرداروں کی نفسیات کو ابھارتا ہے۔اس بیماری نے سب کو الجھا رکھا ہے۔یہ ایک متوسط طبقے کا خاندان ہے۔گھر چھوٹا ہے

دیوان خانے اور کمرے میں اتنا کم فاصلہ ہے کہ دیوان خانے میں کی جانے والی گفتگو کمرے میں سنائی دیتی ہے ۔گھر میں فریج نہیں پانی کا مٹکہ ہے۔بچے کھلونوں کے لیےلڑ رہے ہیں۔پانی کی ٹونٹی کھول کر کھیلنے لگتے ہیں۔گھر میں کسی ملازم کا بھی پتہ نہیں چلتا۔کرداروں کی گفتگو میں بھی مقامی رنگ ہے۔کہانی کی سب سے بڑی خوبی جزوئیات نگاری ہے۔مرکزی کردار کے کمرے اور گھر کی تفصیلات بچوں کا ماں کو روتے دیکھ کر کچھ سمجھے بغیر رونے لگنا۔بچوں کو بڑوں کے درمیان سے ہٹا کر انھیں کھیلنے کے لیے بھیج دینا۔ایک حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں اس کی صحت کتنی اچھی تھی مگراب آدھا اتر گیا ہے، بھیا وہیں فرش پر بہنا کے بازو بیٹھا۔بہن چائے کی پیالی پینے کے بجائے جیسی زبان افسانے کا ماحول اور فضا بنانے میں ممدو معاون ثابت ہوتی ہے۔حمید سہروردی کا یہ افسانہ رشتوں کی نزاکت کا ایک عمدہ افسانہ ہے۔

صفر
ایک
صفرصفردو
صفرصفرصفرتین
صفرصفرصفرصفرچار
صفرصفرصفرصفرصفرپانچ
صفرصفرصفرصفرصفرصفرچھ
صفرصفرصفرصفرصفرصفرصفرسات
صفرصفرصفرصفرصفرصفرصفرصفرآٹھ
صفرصفرصفرصفرصفرصفرصفرصفرصفرنو
صفرہی صفر
ہجوم صفر
تیرااورمیرا
حاصل
ایک دائرہ
یا
ایک نقطہ

(صفر از حمید سہروردی)

حمید سہروردی (گلبرگہ)

منظروں سے ڈوبتی اُبھرتی کہانی

اطراف واکناف کے ہنگاموں سے بے خبر، سمندر کی لہریں ساحلوں سے ٹکرا رہی ہیں اور میدان میں خودرو پودے لہک لہک کر ایک دوسرے سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہہ رہے ہیں۔آسمان میں بے رنگ شکلوں میں ایک دھندلی سی شبیہ نظر آ رہی ہے۔سمندر تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہا ہے۔پتہ نہیں بھنور سے اٹھنے والی لہریں کس دشا میں بہنا چاہتی ہیں، ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی ہیں۔بیکراں اور وسیع سمندر کے اندر آبی جانور بے چین اور بے سکون، شانتی کے متلاشی نظر آ رہے ہیں۔آبی جانور اور پرندے سمندر کی پیٹھ پر بیٹھے خوشی اور مسّرت کے گیت گاتے نظر آ رہے ہیں۔ان میں جب حرکت ہوتی ہے تب سمندر کی لہریں بپھر بپھر کر ان پر سوار ہونا چاہتی ہیں لیکن آبی جانور اور پرندے تیز تیز، پرسکون جگہ پر کھڑے استہزا اور طنزیہ نظروں سے میٹھی میٹھی مسکراہٹوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔سمندر مغموم اور نروس ہو کر ان کی اور جھپٹنے کی سعی کرتا ہے لیکن بے سود۔۔۔۔خودرو پودوں کو زہریلے کیڑے کاٹ کھانے لگتے ہیں۔خودرو پودوں میں حرکت ہوتی ہے۔بادِصبا کے جھونکوں سے زہریلے کیڑے لڑکھڑا جاتے ہیں۔جھنجھلاہٹ میں زمین کے شگافوں میں گھس پڑتے ہیں۔آسمان سے بے رنگ شکلوں میں سے نظر آنے والی شبیہ غائب ہو جاتی ہے۔

سمندر کی آنکھیں ہنوز بھری ہوئی ہیں۔اور خودرو پودے لہلہانے لگے ہیں۔یوں لگتا ہے کہ شبیہ ساتویں آسمانوں سے کسمسا کسمسا کر آخری آسمان سے بھی رشتہ منقطع کیے، دھرتی کے جسم پر یا سمندر کی پیٹھ پر سوار ہونا چاہتی ہے۔خودرو پودے ٹھنڈی ہواؤں سے بے قابو ہو رہے ہیں اور زور زور سے گا رہے ہیں۔اب سمندر کی آنکھوں میں روشنی نظر آ رہی ہے البتہ شبیہ کسی چیز کی یاد آسمان سے دور لے جا چکی ہے۔

سمندر اپنی پوری تمکنت اور وقار سے، دور جہاں ندی، تالاب اور دلدل ہے، وہاں دیکھ رہا ہے۔تالاب میں پانی ٹھہرا ہوا ہے اور دلدل میں کسی قدر ہلچل ہو رہی ہے۔ندی میں موجِ طرب وقفے وقفے سے اٹکھیلیاں لیتی ہوئی معدوم ہو چکی ہے۔سمندر انھیں اپنی طرف متوجہ نہ پا کر آتش ناک ہو اٹھتا ہے۔اس کی موجوں

میں تلاطم پیدا ہو چکا ہے۔تھوڑی تھوڑی دیر بعد موجوں کے مارے مارے پھرنے سے پانی سے غڑپ غڑپ کی آوازیں آ رہی ہیں۔لیکن بادصبا خراماں خراماں دریا کے جسم نازنین کو چھوکر دور دور چلی جا رہی ہے۔تالاب جوں کا توں خاموش ہے۔دلدل میں پھیلی ہوئی بیلوں اور درختوں میں بادصبا کے گزرنے سے حرکت پیدا ہو چکی ہے۔

سمندر سے پیدا ہونے والی غڑپ غڑپ کی آوازیں غائب ہو جاتی ہیں اور پھر سمندر دُور دُور سے نظر آنے والے تالاب، دلدل اور ندی کو دیکھتا ہے اور جی ہی جی میں کُڑھتا ہے۔وہ اس وقت حیرت کے گرداب میں غوطہ لگانے لگتا ہے۔جب وہ دلدل میں صبح کی تروتازگی اور شادابی کو دیکھ لیتا ہے۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دلدل میں بسنے والی کیچڑ اور پانی میں پروان چڑھ کر جینے والی بیلیں اور درخت مجبور محض، اس کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھتے رہتے، برخلاف اس کے کہ وہ ہر چیز میں بےفکری اور بےاعتنائی کا نظارہ کرتا ہے۔جب وہ چیں بہ جبیں ہو کر تالاب کی طرف نظریں دوڑاتا ہے تو وہاں بھی اس کی آشائیں، نراشا، کاہی پیراہن اوڑھے، سر جھکائے، تھکے تھکے قدموں سے بیکراں وسعتوں میں پھیلے ہوئے آکاش کی طرف چلی جاتی ہیں اور کہیں اپنی پناہ گاہ ڈھونڈ لیتی ہیں۔سمندر بےچین و بےقرار ، اپنے آپ میں جھنجھلاہٹ محسوس کرتا ہے اور کف دست ملتا رہ جاتا ہے۔تالاب کے چہرے پر بجائے افسردگی اور اکتاہٹ کے تمتماہٹ اور دبدبہ دیکھ لیتا ہے۔جیسے دن کی تمام توانائی اور رعنائی بے ڈر، تالاب پر چلی آئی ہے۔پھر وہ کنکھیوں سے ندی کی طرف دیکھتا ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ ندی چاندنی میں نکھری نکھری، دُھلی دُھلی، صاف وشفاف، دودھ دودھ نظر آ رہی ہے۔

سب سے پہلے دلدل میں پھنسی ہوئی بیلوں اور درختوں نے تالاب کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔تالاب نے بخوشی دوستی کا ہاتھ، اپنی کم سنی میں ہی دلدل کی طرف بڑھایا تھا۔وہ ہر وقت دلدل کی پیٹھ پر بڑی محبت اور لگاؤ کے ساتھ ہاتھ پھیرتا تھا۔دلدل تالاب کے اس فعل سے، اس کے لمس سے اپنے اندر گرمی اور حدّت محسوس کرتا تھا۔ایسا لگتا تھا کہ دلدل کی بیلوں اور درختوں کو نسیمِ بہار چھو رہی ہے اور دلدل کے چہرے پر صبح کی تازگی اور شگفتگی پھیل رہی ہے۔کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ جب بھی تالاب دلدل کے پاس رہتا تھا، ندی شرما شرما کر، لجا لجا کر اس کے پاس سے گزرتی تھی۔تالاب ندی سے بے پروا رہتا تھا۔وہ تو بس دلدل کے سنگ خوش و خرّم ایاّم بسر کیے جا رہا تھا۔

ایک دن دلدل کی بیلیں تالاب کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔پتہ نہیں کیوں اس دن وہ اداس اداس چہرہ لیے آسمان میں نظر آنے والی دھندلی صورت غائب ہوئی تھی۔معاً ایک روح افزا ہوا کا جھونکا تالاب کے جسم کو چھو گیا۔تالاب کھل اٹھا۔بیلوں اور درختوں کے پتّے بھی باغ باغ ہو اُٹھے۔تالاب جوشِ مسرت سے دلدل کے درختوں اور بیلوں کو سہلاتے ہوئے دلدل سے گتھم گتھا ہوا۔

درختوں اور بیلوں کو سہلانے سے لے گتھم گتھا ہونے کا سفر، طویل وقت کو اپنے اندر اُتار چکا

تھا۔تالاب نے اچانک ندی کی طرف دیکھا۔ندی اس کے اطراف اپنی تمام بہار کے ساتھ گیت گاتی، بےسمت راہوں پر گامزن تھی۔تالاب کو اس کی بےاعتنائی میں گھمنڈ دکھائی دیا۔لیکن اس پر اس چھپ کا اثر یہ ہوا کہ وہ ندی کو روزانہ دیکھنے کے لیے بےقرار ہوتا۔اور آہستہ آہستہ اس کی طرف مائل بہ کرم ہوئے جا رہا تھا۔لیکن ندی تالاب سے بےخبر اپنی ترنگ اور اپنی امنگ میں مترنم آوازوں سمیت سبک وروان تھی۔

ندی پر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔تارے جگمگا رہے تھے۔ندی چاروں طرف ٹھنڈی چاندنی کا دل لبھانے والا منظر تالاب کی آنکھوں میں چھوڑے جا رہی تھی اور بل کھاتی، لچکتی، تھرکتی پون کو اپنے میں جذب کیے غرور و تمکنت کے ساتھ بڑے بڑے پہاڑوں اور ترٹے مڑے راستوں کو پاٹ کر، لامحدود ہوتی جا رہی تھی لیکن اس نے ترچھی نظر سے بھی تالاب کی طرف نہیں دیکھا۔

اچانک ایک دن بادوباراں کے جھکّڑوں مین تالاب میلا میلا اور گدلا گدلا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ریت بس گئی۔جسم کے تمام اعضا مضمحل مضمحل، تھکے تھکے دکھائی دینے لگے۔تالاب جو سمندروں کو دن کا احساس دلاتا تھا۔اب وہ یوں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا پورا جسم ڈھیلا ڈھیلا ہو گیا ہے اور خورشید روشن سے جلد ہی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔پر گردوں کی گردش کی ڈور ڈھیلی نہیں پڑ رہی تھی، چلچلاتی دھوپ جسم کیا یک ایک مسام میں گھس رہی تھی۔وحشت اور دہشت کی کرنیں اپنا جوبن اٹھائے، تالاب پر مسلط ہو رہی تھیں۔کون جانے، آنے والے لمحوں کی پشت پر شام کے ساتھ ساتھ شب کی تاریکی سوار ہے یا چاندنی کی بارش استمالیت زدہ آنکھیں ریت سے بھری ہوئی تھیں۔تالاب اپنے آپ سے سوال کرتا ہے، وہ کون سے لمحے تھے۔

وہ کون سے۔۔۔۔۔؟

دلدل اور ندی کا رشتہ صدیوں پرانا تھا۔گو کہ دلدل نے تالاب کو آس دلائی تھی۔وہ اس پر سے ہی ہو کر ندی تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔جب جب بھی تالاب نے دلدل کو وعدہ وفا کرنے کے لیے کہا، دلدل ہنس ہنس کر ٹال مٹول کر دیا کرتا۔دلدل کے اس رویے سے عاجز آ کر تالاب نے خود ہی ہمت کر ڈالی اور ندی کی طرف نادیدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔دھیرے دھیرے تالاب اور دلدل کے درمیان دوری کی ریکھائیں پھیلتی چلی گئیں۔ایک لمبے وقفے تک تالاب نے چُپ کا برت رکھ لیا۔موسم برسات کی ایک سہانی شام تالاب، ندی کے فراق میں دلدل کے قریب سے گزر رہا تھا کہ دلدل سے مڈبھیڑ ہوئی۔دلدل نے پوچھا: ’’تم اب چودھویں کا چاند ہو گئے ہو؟‘‘

تالاب نے بےرُخی سے کام لیا اور ایک لفظ بھی اس کی طرف نہیں اُچھالا۔

دلدل نے پھر پوچھا: ’’وہ گھوڑا کہاں ہے جو شام سویرے تمھارے پاس پانی پینے آتا تھا؟‘‘

تالاب نے کہا: ’’وہ بکری کہاں گئی جو ہمیشہ تمھاری پیٹھ پر سوار رہتی تھی۔اب تمھارے پاس سے بیلیں

اور درخت اکھاڑ لیے گئے ہیں ۔تاہم میں صرف ایک بار انھیں آنکھ بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں ۔صرف ایک بار ۔۔۔ایک سرد آہ بھری، پچھلی ملاقاتوں، باتوں اور گھاتوں کا ذکر ہی کیا۔۔۔!'' اتنا کہہ کر تالاب خاموش ہو گیا۔

دلدل کا چہرہ سرخ ہوا اور آنکھیں نکال کر تالاب کو دیکھنے لگا اور اپنی طرف آنے کا اشارہ کرنے لگا۔لیکن تالاب نے تہیہ کرلیا کہ وہ اب ہرگز دلدل کی چکنی چپڑی باتوں میں نہیں آئے گا۔تالاب کی غیر متوقع حالت دیکھ کر دلدل میں کھد بد ہونے لگی ۔اس کی شعلہ بار آنکھیں تالاب کو اپنی طرف ملتفت کرنے کی کوشش کرنے لگیں، لیکن تالاب دلدل سے بے پروا آگے بڑھا اور ندی کو نا دیدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ندی اپنی ترنگ اور امنگ میں آگے ہی آگے بڑھنے لگی ۔ندی کے تبسم کو دیکھ کر تالاب تلملایا۔بہتی ہوئی ندی سے تالاب نے بڑی لجاجت سے کہا:

''میں کسی صحرا کی اڑتی ہوئی ریت کا ایک سراب ہوں ۔تم اپنے لب کھولو اور میرے قریب آجاؤ۔۔۔یہ نظارہ دید کب تک ۔۔۔۔میں تمھاری بڑی بڑی اور پھیلی ہوں آنکھوں میں جامِ جمشید دیکھ لوں ۔تمھارے نرم نرم اور گداز گداز سینے پر سر رکھ کر محسوس کرلوں کہ جہان رنگ و بو میں تیری ذات کے سوا اور کچھ بھی نہیں ۔۔۔آجاؤ۔۔۔یا تم مجھ میں سما جاؤ۔۔۔میں تمھاری پھیلی ہوئی وادیِ حسن میں خود کو پہچان لینا چاہتا ہوں اور تمھاری زلف میں زنجیر گیتی کو بھی دیکھ لینا چاہتا ہوں، تمھاری شائستہ ہتھیلی پر مہر محبت ثبت کرنا چاہتا ہوں ۔میرے قریب آجاؤ۔۔۔۔سچ مانو کہ میں زماں و مکاں کے قیود سے ماسوا، تمھیں جان لینا چاہتا ہوں۔مین نے ایک ایک پل تیرے فراق میں گزارا ہے۔مجھے مزید انتظار کے کرب سے بچاؤ''

ندی نے کہا:''تم صرف میرے حسن کی وادی میں اپنے آپ کو پہچان لینا چاہتے ہو۔جو اپنی پہچان اپنی ذات سے نہیں کرا سکتا، بھلا وہ دوسری شئے میں خود کو کیسے پہچان لے گا۔تم کس ہوش میں ہو۔جاؤ دلدل میں ہی پھنسے رہو۔''

دلدل تالاب کے لیے گڑگڑاتا رہا۔لیکن اب تالاب کے اس حال پر ندی نے ذرہ برابر بھی افسوس نہیں کیا۔وہ تیز بہتی رہی۔اور اس کی موسیقی میں اور شدت پیدا ہو گئی۔

میں ہوں آپ اپنی پہچان
کہاں تو اور کہاں میں
کون آرہا ہے آہستہ آہستہ
میری طرف
کسی سے میری الجھن ہرگز نہیں
میں تنہا رہی ہوں

تنہا رہوں گی
میں تو خود ہوں
ایک محشر خیال
کدھر ہے
نسیم سحر، کہاں کھو گئی
اس بھیانک طلسمات میں
کون آنے لگا ہے: آہستہ آہستہ
کسی سے نہیں ہے۔اُلجھن میری
میں اکیلی اکیلی چلی جاؤں گی
تم تالاب ہو
تالاب کی حقیقت ہے کیا
گدلا گدلا ہے، پانی تیرا
تو ریت کا ایک ذرہ ہے
اور
میں صاف و شفاف پانی سے نتھری ہوئی
کون ہو تم
حقیقت ہے کیا

تالاب نے کہا:

''مجھ سے خطا یہی ہوئی کہ غفلت سے نیند کا ایک جھونکا لے لیا اور سارے نفس کے پردوں میں گھس پڑا دلدل کا مہیب سایہ۔۔۔۔۔اور پھر سبھی کچھ تماشہ ہوا میرے شریر کی لرزش بے معنی دلدل کی نذر ہو گئی۔اور سبھی کچھ بے وجہ اور بیکار ہو گیا۔میں نے تجھے بے انتہا چاہا تھا (اور ہوں) مگر دلدل میں پھنس کر سبھی کچھ کھو دیا۔اب میرے شریر میں کچھ باقی نہیں رہا۔بیہودہ تھا، وہ وقت بے شرم عادتیں تھیں ۔عمر کے بہترین لمحوں میں رونے لگا ہوں ۔اور وہ آکاش کی طرف دیکھنے لگا۔خوامخواہ میں دلدل میں کود پڑا معمولی سی خواہش کے لیے اور پہاڑوں میں خود کو محسوس کرنے لگا تھا۔۔۔میں ۔۔۔۔میں تم سے اس وقت جب تم میرے قریب سے گزرتی تھیں ، انجان رہا۔یعنی بے مروتی دیدوں کی عادت بن گئی تھی اور میں اب اپنے سائے سے بھی جڑا ہوا نہیں ہوں۔ایسا لگتا ہے کہ میرا سایہ بھی روٹھ کر دور چلا گیا ہے ۔ویران موسم کی آمد سے پہلے ۔میں نے سرسبز اور شاداب زمینوں کو بنجر تصور کرلیا۔میں نہیں جانتا

تھا۔۔۔“ تالاب زاروقطار رونے لگا۔

سمندر کی تہہ میں ہلچل ہوئی۔سمندر چنگھاڑتا ہوا اپنے ساحلوں کو توڑ کر دلدل، ندی اور تالاب کی طرف بڑھنے لگا۔ایک چٹیلا میدان راستے میں ملا۔اوراس نے حیرت سے پوچھا:”تم ادھر۔۔۔؟“سمندر بس اپنی ہی رو میں بہا تھا۔راہ میں آنے والے تمام میدان، نالے، گدلے پانی کے گڑھے،اس کے غضب وعتاب کے شکار ہوگئے۔سمندر آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔۔۔اورآگے چٹان نے بھی حیرت وتعجب سے پوچھا:

”تم کدھر جارہے ہو؟“

سمندر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا:”تم میرے رستے میں رکاوٹ نہ بنو۔مجھے پربت کے دامن میں بہنے دو۔مجھے ادھر،اس طرف، جہاں ندی،تالاب اور دلدل ہے،تک جانا ہے۔“

سمندر اتنا کہہ کرآگے بڑھا تو ایک لق ودق صحرا ملا۔۔صحرا نے بھی سمندر سے وہی سوال کیا، جو چٹان نے کیا تھا۔سمندر اس موقف میں نہیں تھا کہ خشک اور بے برگ وبار صحرا کی ابھی ٹھہر کر جواب دیتا۔وہ خاموش سیدھی سمت میں تیز بہاؤ سے بڑھنے لگا۔چٹان، صحرا اور میدان،سمندر کی اس تیز گامی پر حیران تھے۔دلدل نے سمندر کو اپنی طرف تیز گام آتا ہوا دیکھ لیا اوراپنے اوپر لپٹنے والی بیلوں سے خود کو ڈھانک لیا اور تالاب متوحش ہوگیا۔ندی اپنی ہی ترنگ میں بہتی رہی۔لیکن سمندر کی گڑگڑاہٹ نے ندی کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔ندی تالاب کی وحشت کو دیکھ کر پشیمان ہوگئی تھی۔وہ یہی سمجھتی رہی کہ شاید میری باتوں نے تالاب کی یہ حالت بنا رکھی ہے۔لیکن راز،راز ہی رہا۔سمندر نے آہستہ آہستہ دلدل پر قبضہ کرلیا۔پھر تالاب کی طرف بڑھا اور ندی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پہاڑوں،صحراؤں اور میدانوں میں بہنے لگا۔۔۔۔

اورتمام دوسرے مناظر ڈوبتے چلے گئے۔۔۔۔

افسانہ کہنے کے ان گنت جانے اور انجانے طریقے ہیں،اوراسی غیر رسمی پن کی بدولت اس کی یہ خوبی قائم ہے کہ وہ زندگی کے مخفی گوشوں میں پھیلتا چلا جائے،مگر ہر افسانے کے تمام تر وسائل اُسی میں مضمر ہوتے ہیں اور صرف اُنہی وسیلوں کی دریافت پر وہ اپنی اصل سورت اختیار کر پاتا ہے۔علامت، تجرید اور اسطور بھی بیانیہ کے مانند ہمارے افسانے کے گراں بہا ذروئع ہیں۔تاہم قیمتی ذرائع بھی اس شئے کا نعم البدل نہیں ہوتے جس کے حصول کی خاطر انہیں کام میں لایا جاتا ہو۔

جوگندر پال کے مضمون **نیا اردو افسانہ: زبان و بیان کے مسائل** سے اقتباس

سلیم شہزاد (انڈیا)

ریت منظر کی سراب کہانی

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ادبی افق پر طلوع ہونے والے جدید افسانے کو صنفی،لسانی، تکنیکی اور اظہاری جہات سے آشنا کرانے والے فنکاروں میں حمید سہروردی کا نام اپنی ایک انفرادی شناخت رکھتا ہے۔”ریت ریت لفظ“،”عقب کا دروازہ“اور”بے منظری کا منظر نامہ“جیسے افسانوی مجموعوں کی اشاعت سے انھوں نے نہ صرف اس صنف کی قدر ومنزلت بڑھائی ہے بلکہ اپنے منفرد اسلوب،فنی برتاؤ اور بیانیہ میں روایت وجدت کے امتزاج سے جدید افسانوی روایت کو تازہ کار فکر وفن کی آئینہ دار ہونے کی مثال بھی بنا دیا ہے۔جدیدیت کے موضوعات، انھیں فن میں برتنے کے طریقے اور ان کا فکری اور فلسفیانہ اظہار اپنے مخصوص رنگوں میں حمید سہروردی کے افسانوں کا وصف بنا ہوا ہے۔افسانے کے روایتی تصورات کو توڑ کر واقع کے زبان ومکاں سے گزر جانے کی سعی جدید افسانے کا اہم وصف رہی ہے۔اس ذیل میں صنفی تقاضوں اور زبان و بیان کے قواعد سے انحراف اور بیانیہ کے مختلف زاویوں کی یکجائی یا ان کا انتشار وغیرہ جدید افسانے کو ماضی کی سکہ بندی روایت سے الگ کرنے والے عوامل کی طرح ابھرے۔

حمید سہروردی کے افسانوں کا لسانی برتاؤ،نظم ونثر کی حد بندیوں کو توڑ کر داستانی اسلوب میں خیال کے مختلف پہلوؤں کو ایک مرکزی نقطے سے ملانے کے مترادف ہے ان کا افسانہ کثیر جہت بیان کی مثال ہے کہ جہاں سمندر کی لہریں ساحلوں سے ٹکرا رہی ہیں، وہیں منظر کا حصہ ایک میدان بھی ہے جس میں خود رو پودے لہک لہک کر ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے ہیں۔ابھی آسمان میں بے رنگ شکلوں میں ایک دھندلی سی شبیہ نظر آرہی ہے اورابھی بے چین جانور شانتی کے متلاشی نظر آرہے ہیں۔

بیان جو متعدد لسانی تعملات سے افسانے کی بی کات تشکیل دیتا ہے۔

حمید سہروردی کے افسانوں میں نثر کے ایک نقطے پر ٹھہرے نہ رہتے ہوئے شعریت اور نظم کی طرف بھی لپکتا رہتا ہے۔اسی پر بس نہ کرتے ہوئے حمید سہروردی کا بیان نثر کی خارج اور ظاہری ہیئت سے دامن چھڑا کر نظم کی

خارجی شکل بھی اختیار کرلیتا اور اسی طرح افسانے کا خیال اپنی کثیر رنگی میں منظروں سے ڈوبتی اُبھرتی ایک کہانی میں بدل جاتا ہے۔

حمید سہروردی کی پہلی کتاب ''ریت ریت لفظ'' میں شامل ''منظروں سے ڈوبتی اُبھرتی کہانی'' کبھی کے زمانے کی ایک تجریدی علامتی تمثیلی وغیرہ وغیرہ کہانی ہے۔سمندر، میدان، پہاڑ، صحرا، سراب، ندی، تالاب اور دلدل وغیرہ اس کہانی کے کردار ہیں (یہ اسماے مکانی کو باشعور کرداروں میں تحویل کرنے کی عمدہ مثال ہے) ان سب کی بہت کچھ علامتی معنویتیں ہوسکتی ہیں لیکن اب وقت گزر چکا یا پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے کہ ان علامتوں کی پرتوں میں جھانک کر گہرہاے معنی تلاش کیے جائیں۔اس کہانی کی مجموعی معنویت یہ ہے کہ سمندر اپنی راہ میں آنے والی ہر شئے کو ، ہر وجود کو نگل جاتا ہے۔اسے تصوف کی رو سے جزو کل کی وحدت بھی قرار دیا جاسکتا ہے لیکن یہ وحدت بیک لمحہ واقع نہیں ہوتی۔اس وقوع کے ساتھ تالاب ندی سے ملنا چاہتا ہے جس کے بظاہر روایتی رومانی بیان کو حمید سہروردی نے اس کہانی کا منظر یوں بنایا ہے:

''ندی سے تالاب نے بڑی لجاجت سے کہا،''میں کسی صحرا کی اڑتی ہوئی ریت کا ایک سراب ہوں۔تم اپنے لب کھولو اور میرے قریب آجاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تم مجھ میں سما جاؤ۔میں تمھاری پھیلی ہوئی وادیِ حسن میں خود کو پہچان لینا چاہتا ہوں۔۔۔۔

غرورِ حسن کی مانی ہوئی ندی کا جواب ایک نظم کی صورت میں نمود کرتا ہے:

میں ہوں آپ اپنی پہچان
کہاں تو اور کہاں میں
۔۔۔۔۔میں صاف اور شفاف پانی سے نتھری ہوئی

تبھی کہانی سے ایک نیا منظر یوں اُبھرتا ہے کہ

سمندر چنگھاڑتا ہوا اپنے ساحلوں کو توڑ کر دلدل، ندی اور تالاب کی طرف بڑھنے لگا۔۔۔

کئی مناظر اُبھرے اور ڈوبے اور بالآخر سمندر نے اپنی راہ میں آنے والے ہر وجود کو نگل لیا اور تمام مناظر ڈوبتے چلے گئے۔

یہاں کہانی کے مناظر کا ڈوبنا ابھرنا بیان میں لسانی تعملات کی تکرار سے متعدد حرکی پیکروں کی تشکیل کرتا ہے۔کہانی پر ابہام کی پُر اسرار دھند بھی چھائی ہوئی ہے جو داستانی جمالیات کا ایک اہم حصہ ہے اور حمید سہروردی کے افسانوی بیان کو جدیدیت اور جدت کے ساتھ روایت اور قدامت سے بھی مربوط کرتی ہے۔

''عقب کا دروازہ'' (افسانہ نگار موصوف کا دوسرا مجموعہ) میں شامل ''وہ ایک کہانی'' بھی ''منظروں سے

ڈوبتی اُبھرتی کہانی'' ہے جس کی ابتداء کہانی کار کو کہانی لکھنے کی مختلف ہدایات سے ہوتی ہے:

''ایک صاف کاغذ لو۔ایک ایسا پین لو جس میں سیاہی کے آخری قطرے جی رہے ہوں۔لکھو ایک کہانی۔۔۔کچھ اس طرح لکھو کہ تمھاری کہانی ہم سب کی کہانی بن جائے۔''

اسی لیے مذکورہ افسانوی مجموعے کے پیش لفظ میں ڈاکٹر ارتکاز افضل نے کہا ہے کہ

افسانہ حمید سہروردی کے لیے ایک ایسا میڈیم ہے جس کے ذریعے وہ ذات کے وسیلے سے کائنات کی دریافت کرتا ہے۔۔۔وہ زندگی کو مختلف ابعاد میں دیکھنے اور برتنے کا قائل ہے۔۔۔زندگی کی ہر واردات اس کے لیے ایک کہانی پن رکھتی ہے۔

وغیرہ وغیرہ باتوں سے قطع نظر جب ہدایت دینے والوں کی باتوں میں اگر حمید سہروردی کہانی سناتے ہیں (اور یہ ھدایت دینے والا افسانہ نگار کے ضمیر متکلم کے سوا کوئی اور نہیں) تو کچھ ایسی کہانیاں جنم لیتی ہیں:

۱۔ایک درخت تھا۔درخت کے نیچے ایک آدمی خاموش بیٹھا ایک لمبی کہانی سوچ رہا تھا۔
۲۔ایک غار تھا۔غار میں گھپ اندھیرا تھا۔۔شاید وہاں ایک سانپ بھی تھا۔
۳۔ایک کہانی سقراط کی ہے جو کہانی لکھتا نہیں سناتا ہے۔آخر اس نے زہر پی لیا اور ایک نئی کہانی پیدا ہوئی۔
۴۔ہاں تو ایک مرتبہ ایک آدمی دنیا میں آیا۔
۵۔ہاں، تو کچھ یوں ہوا۔۔۔۔
۶۔تو سنو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ نصف درجن جملے اور فقرے پھانسی کے تختے، ہجرت کے مسئلے اور غار نشینی وغیرہ کی کہانیوں سے جڑے ہوئے ہیں اور حمید سہروردی نامی فنکار ہر کہانی بڑے انہماک سے سنا رہا ہے، ویسے اس کے سامعین کی رائے یہ بھی ہے کہ

''تم بکواس کر رہے ہو، کہانی سناؤ''

تب فنکار یوں گویا ہوتا ہے کہ

''میری طرف دیکھو۔کیا دیکھ رہے ہو؟ دنیا کی سب سے بڑی کہانی!''

کہانی کا ہدایت کار اور کہانی کہنے سنانے والا آپ ہی کہانی بھی ہو تو اس نقطے سے حمید سہروردی معاشرہ، معاشرے کا فرد اور معاشرے سے اُگتی کہانی آپ بن جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''ریت ریت لفظ'' کے پیش لفظ میں مہدی جعفر نے لکھا ہے:

''حمید سہروردی کا طریقہ پرانی قدروں کے کھنڈروں میں رہتے ہوئے نئی تعمیر کا خواب

دیکھنا ۔۔وہ اپنے اسلوب میں بھی قدیم طرز کو منقلب کر کے تو تعمیری سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔۔۔۔حمید سہروردی کے یہاں نیا اسٹرکچر بنانے کی کوشش تیز ہے۔''

نیا اسڑکچر بنانے کی یہ کوشش ،جیسا کہ کہا گیا،زبان و بیان کی نئ ساختیاتی تعمیر وتعبیر کے مترادف ہے ۔خارجی سطح پر نظم ونثر کا ادغام،کہانی کے مختلف اسالیب یعنی داستان ،حکایت اور تمثیل وغیرہ کی تکنیکوں کا استعمال اور بعض افسانوں میں ڈرامے کی ہیئت اختیار کرنا اور داخلی سطح پر اقدار کی کشمکش ،تصوف اور سریت سے لگاؤ،مذہب اور اخلاق اور تہذیبی روایات کی پاسداری یا ان کی سمت مراجعت ،یہ ایسے واضح آثار وعوامل ہیں جن کی Designing سے حمید سہروردی کی ڈوبتی ابھرتی ایک سے دوسرے میں نمو کرتی کہانی تشکیل پاتی ہے۔اسی رجحان کی اچھی مثال ''کہانی در کہانی'' نامی تخلیق (مشمولہ ''ریت ریت لفظ'') ہے جس کی تجریدی ماورائی اور داستانی تکنیک آگے چل کر افسانہ نگار کے تیسرے مجموعے ''بے منظری کا منظر نامہ'' میں موضوعات اور لسانی تعملات کی یکسانیت میں اُجاگر ہوتی ہے مثلاً اسی کتاب میں شامل نو افسانے جن کے عنوانات میں سابقہ ''بے'' استعمال کیا گیا ہے: بے بضاعتی ،بے اعتنائی ،بے ربطی ،بے چہرگی ،بے منظری وغیرہ اسی طرح ایک موضوعی افسانوی تاثرات کی ان افسانوں میں تخلیقی تشکیل جن کے عنوانات میں لفظ ''رات'' شامل ہے مثلاً

رات ایک مکالمہ،آدھی رات تک ،اترتی رات ،اور ایک اور رات ۔فن اور اظہار فن کا یہ رویہ جدیدیت کے بعد کا فنی رویہ ہے۔

مابعد جدیدیت سے متعلق کثیر معنویت کا نظریہ بھی گزشتہ دس برسوں سے بالعموم شاعری کی کثیر معنویت دریافت کرنے میں مصروف رہا ہے۔افسانے میں خیال اور موضوع کے فنی لسانی اظہارات اس نظریے کے تحت حمید سہروردی کے فن سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔مثالوں میں پیش کیے گئے افسانوں کے نام سابقے 'بے' کی منفیت کا اظہار کرتے ہیں اور یہ معنویت اپنے عنوانات یعنی موضوعات کے ساتھ تمام افسانوں کو محیط کرتی ہوئی ہے۔اسی طرح اسم زماں ''رات'' اپنی سیاہی ،خوف ،اسرار ،جنس اور وصل کی معنویتوں کا حامل ہونے کے سبب حمید سہروردی کے ''رات کے سلسلے'' کے افسانوں میں نہ صرف زمانی ماحولی رات بلکہ کردار و ضمیر پر اُتری ہوئی رات کے اظہار کا بھی حامل ہو گیا ہے۔

نئ نسلیں دراصل بنی نوع انسان کی بزرگ تر عمر اور سوجھ بوجھ کی نمائندہ ہوتی ہیں۔اسی لئے میں اس سے نا امید نہیں ہوں کہ ان برتر نسلوں کے لکھنے والوں کی کہانیاں ہر دور میں زندگی کی نت نئ رہائش کی تخلیقی ٹوہ میں بہم پہنچاتی رہیں گی۔دیوانوں میں کمی واقع نہ ہو تو ریگ زار بھی جھیلیں اگلنے لگتے ہیں۔

جوگندر پال کے مضمون **اردو افسانے کا منظر نامہ** سے اقتباس

صبا اکبر آبادی

نہ آؤں صبحِ محشر تک میں اپنے ہوش میں ساقی
اگر اک رات کٹ جائے ترے آغوش میں ساقی

ابھی درماندگی کا ہے گماں قدموں کی لغزش پر
ابھی دنیا کو شک ہے کچھ ہمارے ہوش میں ساقی

ذرا سی لغزشِ مستانہ سے سب مل گیا مجھ کو
مرے قبضے میں پیمانہ مرے آغوش میں ساقی

خدا معلوم کیسے چل رہا ہے نظمِ میخانہ
نہ اپنے ہوش میں میکش نہ اپنے ہوش میں ساقی

گیا ہے جب سے یہ مستانہ اُٹھ کر تیری محفل سے
کسی نے پھر نہیں دیکھا صباؔ کو ہوش میں ساقی

صبا اکبر آبادی

جب زباں مچلی دہن کو سی لیا
آگ اگر بھڑکی تو غصہ پی لیا

عشق پیغامِ اجل سے کم نہ تھا
مجھ سے جیسے بن پڑا میں جی لیا

جیتے جی اک شغلِ پیہم تھا یہی
مرتے مرتے نام تیرا ہی لیا

کسقدر پھولوں کو آئی ہے ہنسی
جب ذرا ہم نے گریباں سی لیا

گریۂ غم آنکھ تک آیا نہیں
اے صباؔ یہ زہر ہم نے پی لیا

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

دوستو اب نیا زمانہ ہے
آپ کا آئینہ پرانا ہے

آدمی سے جو آدمی تک ہو
ہم کو وہ راستہ بنانا ہے

کہکشائیں تو سج رہی ہیں بہت
اب تری مانگ کو سجانا ہے

دکھ کی راتیں اجالتا ہے جو
میرا دل وہ چراغ خانہ ہے

یونہی بہلا رہا ہوں دل ورنہ
کِسی کو آنا ہے کس کو جانا ہے

ایسا رشتہ ہے دنیا و دل میں
جیسے تان ہے اور بانا ہے

جتنا ڈھونڈو گے اتنا پاؤ گے
میرے لفظوں میں وہ خزانہ ہے

میں نے پوچھا ''ارادہ ہے کہ نہیں''؟
مسکرا کر کہا ''کہانا ہے !!

اکبر حمیدی

فضا میں اس کی خوشبو بھی ہے شامل
کہ جنگل میں وہ آہو بھی ہے شامل

جو شامیں سُرمئی ہونے لگی ہیں
تری آنکھوں کا جادو بھی ہے شامل

زمانہ اچھا لگتا ہے مجھ کو
زمانے میں کہیں تو بھی ہے شامل

سنورتے رہتے ہیں دنیا کے تیور
کہ دنیا میں وہ خوش خود بھی ہے شامل

میں خود کو جھانکتا ہوں خود میں، شاید
کہیں وہ آئینہ رُو بھی ہے شامل

روپئے بائیں بازو کے ہیں سارے
مگر کچھ دایاں بازو بھی ہے شامل

نظر آتا ہے دنیا دار اکبر
پر اس میں ایک سادھو بھی ہے شامل

تاجدار عادل (کراچی)

تاجدار عادل

نفرت کے ساتھ عشق بھی ہوتا رہا سدا
دنیا بڑی سی قبر تھی زندہ رہا سدا

ایمانداری عشق میں ہے شرطِ اولیں
لیکن اسی اصول میں گھاٹا رہا سدا

میں جانتا تھا اب نہ ملے گا وہ پھر کبھی
لیکن میں اس کو ڈھونڈتا پھرتا رہا سدا

اُس کو تو میرے درد کی کوئی خبر نہ تھی
جس سے میں عرضِ حال بھی کرتا رہا سدا

کیا باکمال تھا کہ وہ حد سے گزر گیا
لیکن میں اک مقام پہ ٹھہرا رہا سدا

دل نے بھی سو گمان کئے اس کے عشق میں
ہم کو بھی اپنے آپ پہ دھوکا رہا سدا

اس نے کچھ اس طرح سے مجھے مات دی کہ میں
خود کو ہی فتح مند سمجھتا رہا سدا

بیٹھا رہا ہجوم میں عادل تمام عمر
لیکن کسے خبر کہ وہ تنہا رہا سدا

دل کے ساحل پہ کُھلا اُس کا نشاں اب کے برس
ہے سمندر سے پرے جس کا مکاں اب کے برس

بوڑھی آنکھوں کی اک حسرت بھی اسے یاد رہے
اُس نے دیکھا تو ہے اک تازہ جہاں اب کے برس

اِسی خواہش میں زمیں دیر تلک پیاسی رہی
شاید آجائے وہی ابرِ رواں اب کے برس

دل اسی یاد کا تھا ایک چراغِ روشن
روشنی جس کی ہوئی عکس کناں اب کے برس

شبِ رفتہ نے مجھے خواب میں آنکھیں دی تھیں
اور اسی خواب میں ٹھہرا ہے جہاں اب کے برس

ایک بارش نے نئے پھول کھلائے دل میں
اور یہ دشت ہوا رقص کناں اب کے برس

تھا گماں جس کا کہ وہ بجھ بھی گئی راکھ ہوئی
ہاں اُسی آگ سے اُٹھا ہے دھواں اب کے برس

وہ جو اک عمر میانِ لب و الفاظ رہا
غم وہ میں نے بھی کیا اُس سے بیاں اب کے برس

زندگی دیکھنے کو جس کے گزاری عادل
کیا خبر ہوگا وہ ہمزاد کہاں اب کے برس

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

ڈاکٹر انور سدید

یہ اہلِ درد نے دل کھول کر اٹھایا ہے
خزانہ پھول نے خوشبو کا جو لٹایا ہے

مجھے یقیں ہے کہ اب روشنی ہی پھیلے گی
چراغ اس نے اندھیرے میں اک جلایا ہے

رقیب خیر منائیں اب اپنی پگڑی کی
مجھے تو اس نے بھری بزم سے اٹھایا ہے

تھا انتظار تو میں نے چراغ دل اپنا
کبھی جلایا، کبھی آپ ہی بجھایا ہے

بکھرتی جائیں گی انور سدؔید خوشبوئیں
کہ پھول اک ترے آنگن میں مسکرایا ہے

زندگی جس طرح گزاری ہے
اس پہ اب ہم کو شرمساری ہے

عادتاً عشق اختیار کیا
عادتاً جنگ ہم نے ہاری ہے

دستکیں موت دیتی رہتی ہے
زندگی آپ کی ادھاری ہے

رو رہی ہے زمین شدت سے
پانی برسا ہے جو وہ کھاری ہے

دل پہ تازہ لگا ہے زخم سدؔید
اور یہ زخم ـ ـ زخمِ کاری ہے

ڈاکٹر شہناز نبی (کلکتہ)

بساطِ جاں پہ نئی چال چلنے والا تھا
وہ شخص جو کہ محبت میں مرنے والا تھا

یہی ہوا کہ زمانے نے تجھ کو ڈھال لیا
زمانہ کب ترے سانچے میں ڈھلنے والا تھا

تڑپ رہے تھے سبھی آسماں پہ چھانے کو
مگر وہ ایک دیا گھر میں جلنے والا تھا

کسی نے پوچھا تو ہوتا مزاجِ شہرِ وفا
یہاں سے کون سلامت گذرنے والا تھا

وہ آنکھیں ڈال کر آنکھوں میں بات کیا کرتا
جو اپنے آپ سے اک دن مکرنے والا تھا

خدا تلاش بھی لیتے تو کس جگہ رکھتے
ہمارے دل سے کہاں وہ نکلنے والا تھا

قدم سے آکے لپٹتی تھیں منزلیں کتنی
ادھر وہ شوقِ سفر میں بھٹکنے والا تھا

بچا بچا کے تو دامن چلے تھے ہم بھی مگر
وہ ایک شعلۂ سرکش لپکنے والاتھا

ڈاکٹر شہناز نبی

ہوائیں تند ہیں پھر بھی چراغ جلتے ہیں
ستم شعار انہی حادثوں سے ڈرتے ہیں

چلو کہ کوچ کریں ہم بھی اپنی منزل کو
پڑاؤ دیر تلک ہو تو پاؤں دھنستے ہیں

اتار آئے سبھی قرضِ جاں خجالت میں
نہ کوئی یاد، نہ آنسو، نہ رشتہ رکھتے ہیں

سلگتے شہروں سے اتنا دھواں اٹھا اب کے
پرندے دور بیابانوں میں بھٹکتے ہیں

مزاحمت ہے کہیں سے نہ احتجاج کوئی
کہ خامشی میں بھی کچھ انقلاب پلتے ہیں

جہاں کو زیر و زبر کرکے وہ یہ بھول گیا
کہ ہم میں ایسے بھی کچھ ہیں جو پیش رکھتے ہیں

چراغاں کوئی کہاں تک کرے سرِ مژگاں
دلوں میں کتنے ہی ارمان روز مرتے ہیں

حسن عباس رضا (نیویارک)

کیا خبر ، کس کی وہ داستاں ہوئے گی
جو ترے آنسوؤں سے بیاں ہوئے گی

سرحدِ جاں سے جس روز گزریں گے ہم
جانے اُس شامِ غم تُو کہاں ہوئے گی

دیکھ پائے گا کون آگ کے اُس طرف
اِس طرف زندگی جب دھواں ہوئے گی

یہ تو ممکن ہے ہم شہرِ جاں میں نہ ہوں
پر وہاں ہوں گے ہم ، تُو جہاں ہوئے گی

میری سانسوں میں اک سانس تیری بھی ہے
جب یہ تھم جائیں گی ، وہ رواں ہوئے گی

چاند ابھرے گا اب تیری پازیب سے
تیرے پیروں کی خاک آسماں ہوئے گی

مجھ کو تقسیم کر دے گی اطراف میں
اور تُو خود کہیں درمیاں ہوئے گی

خواب اُتریں گے تیری ہتھیلی پہ جب
تُو بھی اُس روز خود پہ عیاں ہوئے گی

وہ نگر آرزوؤں کا ہوگا ، جہاں
ہم عوام ، اور تُو حکمراں ہوئے گی

دل بچھا دیں گے آنگن سے دہلیز تک
جب کبھی تُو وہاں میہماں ہوئے گی

خود ہدف اُڑ کے پہنچیں گے تیروں تلک
تیرے ہاتھوں میں جس دن کماں ہوئے گی

ہم کھنچے آئیں گے مسجدِ عشق میں
جب بھی مینارِ جاں سے اذاں ہوئے گی

چوم لیتی تھی وہ میرے آنسو حسنؔ
میری ماں جیسی کیا کوئی ماں ہوئے گی !

قاضی اعجاز محور (گوجرانوالہ)

انسان نما لوگ یہ آئے ہیں کہاں سے
یہ شہر تو کہتا ہے نکل جاؤ یہاں سے

جنگل ہے کہ بستی یہ درندے ہیں کہ انساں
اب لوگ یہاں بسنے کو لاؤ گے کہاں سے

ڈرتا ہوں نہ بن جائے مری موت کا باعث
جو لفظ ادا ہو نہ سکا میری زباں سے

رک رک کے دھڑکنے کا عجب شوق ہے دل کو
سمجھائے اسے کون کہ یوں کھیل نہ جاں سے

بے وجہ اٹھا دیتا ہے طوفان رگوں میں
یہ خون میں جاگ اٹھتی ہے گرمی سی کہاں سے

بیٹھا ہے عدو گھات لگائے مرے اندر
میں اس سے لڑوں کیسے اسے روکوں کہاں سے

تکتا ہے فرات آج بھی اک جنگ کا منظر
یہ تیر یہ لاشے چلے آتے ہیں کہاں سے

ماتم سے یزیدوں کو ہرانا نہیں ممکن
اس طرح حسینؓ اور کئی جائیں گے جاں سے

محورؔ تری باتوں کی معافی نہیں کوئی
چپ کر جا ،نہ کچھ اور نکل جائے زباں سے

عادل منصوری (ٹورنٹو۔کینیڈا)

مانا کہ ترا شہر میں ثانی بھی نہیں ہے
ہم نے کبھی تجھ کوچے کی ٹھانی بھی نہیں ہے

جل پریوں کا جھمگٹ بھی کنارے نہیں لگتا
دریاؤں میں پہلی سی روانی بھی نہیں ہے

جپتے ہیں کھلے عام ترے نام کی مالا
اغیار کی وہ ایذا رسانی بھی نہیں ہے

تم کہتے ہو وہ بات تمہیں یاد نہیں اب
وہ بات مگر اتنی پرانی بھی نہیں ہے

اب آخری ڈیرا ہے یہ ٹوٹا ہوا چھپر
اب آگے کوئی نقل مکانی بھی نہیں ہے

اک بار تجھے ملنے کے متمنی ہیں یوں ہی
ہم نے تو کوئی کھچڑی پکانی بھی نہیں ہے

رضیہ فصیح احمد (شکاگو۔امریکہ)

جو ہوسکے تو تم اتنا حضور کرلینا
کہ میرے فخر کو اپنا غرور کرلینا

کہاں ہر اک کو ہنر یہ نصیب تیرے سوا
قریب ہوکے بھی اپنے کو دور کرلینا

شراب کی نہیں حاجت کہ ہم نے سیکھ لیا
کسی کی دید سے حاصل سرور کرلینا

ہمارے بس میں کبھی ہوسکا نہ ہوگا کبھی
زمان و وقت کا دریا عبور کرلینا

سفر نصیب ہو رضیہ جو اس کے کوچے کا
تو ہوکے قبلہ رو، سجدہ ضرور کرلینا

صادق باجوہ (امریکہ)

وارفتگی و جوشِ جنوں کا بھی پاس تھا
اہلِ وفا کا دل تو محبت شناس تھا

بے چینیاں سمٹ کے نگاہوں میں آگئیں
منظر کسی کی آنکھ کا کتنا اداس تھا

دشت و جبل زمان و مکاں خاک چھان لی
دل ڈھونڈتا پھرا وہ کہیں آس پاس تھا

اے کاش وقتِ مرگ شہادت ہو ساتھ ساتھ
اس رُو سیہ کا وِرد تو حمد و سپاس تھا

یادیں لپٹ کے رہ گئیں تارِ نفس کے ساتھ
بچھڑا وہ خوش خصال جو مردم شناس تھا

آوارگانِ دشتِ وفا کا رہا بھرم
خوگرِ جفا تو قیافہ شناس تھا

صادق بپھرتی موج بھنور سے لپٹ گئی
شاید اسے سکونِ کنارا نہ راس تھا

معید رشیدی (مغربی بنگال)

دردِ دل کی کسک، دردِ جاں کی کسک
میرے دل میں ہے سارے جہاں کی کسک

سوئے منزل میں تنہا ہی چلتا رہا
اپنے دل میں لئے کارواں کی کسک

میرے پیروں تلے اب زمیں بھی نہیں
ہے ابھی تک مگر آسماں کی کسک

دور اپنے چمن سے میں کب تک رہوں
ہے قیامت مجھے آشیاں کی کسک

ہر قدم پر لٹا کر بہاریں ہزار
میں لئے پھر رہا ہوں خزاں کی کسک

کوئی تلوار، خنجر، نہ نیزہ، نہ تیر
ہے کہاں کی خلش، یہ کہاں کی کسک

دوریاں بے کراں، پیر میں آبلے
اور رستے میں سنگِ گراں کی کسک

عظیم انصاری (مغربی بنگال)

چرکے جو بار بار یوں کھاتا رہے گا دل
کب تک وفا کی رسم نبھاتا رہے گا دل

دیوار و در سے سبزہ اگاتا رہے گا دل
شاداب اپنے غم کو بناتا رہے گا دل

باتوں سے اپنی آگ لگاتا رہے گا دل
ہر ہر قدم پہ اس کو بجھاتا رہے گا دل

شاید اسی کے عزم سے ڈر جائے یہ ہوا
آندھی میں بھی چراغ جلاتا رہے گا دل

نفرت کے بیج لاکھ وہ بوتا رہے مگر
اس سر زمیں سے پیار اگاتا رہے گا دل

جب جب نئے خیال سے ٹکرائے گا دماغ
شعروں کو بے نظیر بناتا رہے گا دل

جاگے گا یہ سماج بھی اک صبحِ نو کے ساتھ
امید کی جو جوت جلاتا رہے گا دل

جب تم نہیں رہوگے تو جینے کا لطف کیا
اوروں کے ساتھ کیسے نبھاتا رہے گا دل

دل کا معاملہ ہے اسے دل پہ چھوڑیئے
آئے گا جب دماغ تو جاتا رہے گا دل

کچھ تو اسے قرار ملے زیست سے عظیم
کب تک غموں کا بوجھ اٹھاتا رہے گا دل

سہیل احمد صدیقی (کراچی)

زندگی کیا ہے؟ رات گزری ہے
گیسوؤں میں حیات گزری ہے

کیا بھلا فائدہ ہو شبنم سے
جب خزاں پات پات گزری ہے

محوِ حیرت ہوں چشمِ جاناں سے
جگنوؤں کی برات گزری ہے

ہم سے ملتا رہا ہے مہرِ دونیم
کس قیامت کی رات گزری ہے

آتش گل بجھائے گا کیسے
اُس کے سر سے یہ بات گزری ہے

فصلِ گل جب کبھی ادھر آئی
ہم سے بے التفات گزری ہے

تذکرہ پھر سہیل مضطر کا
رات گزری ہے، بات گزری ہے

کاوش پرتا پگڑھی (دہلی)

دربدر پھر رہا ہوں گھر دے دے
گھر نہ دے، سایۂ شجر دے دے

کچھ نہ دینا اُدھر مجھے یارب
جو بھی دینا ہے بس اِدھر دے دے

میرے حق میں ہو یا نہ ہو لیکن
مجھ کو کچھ تو مِری خبر دے دے

شعر پڑھنے کا جب دیا ہے ہنر
شعر کہنے کا بھی ہنر دے دے

زیر لکھا ہے میری قسمت میں
تو چاہے مجھے زبر کر دے

کچھ تو دے ہم کو گرمیٔ ایماں
شعلہ دے یا نہ دے، شرر دے دے

بخش دے قوم کو سفید عبا
اور ہمیں خوں سے تربتر دے دے

دیکھ کیسی اُڑان بھرتا ہوں
تو مجھے پہلے بال و پر دے دے

رات کو رات، دن کو دن لکھوں
حوصلہ مجھ کو مٹھی بھر دے دے

کاخ و ایوان کی نہیں چاہت
میرے بچوں کو صرف گھر دے دے

رفیق شاہین (علی گڑھ)

اگر آئینہ دکھلاتے رہو گے
تو سب کی گالیاں کھاتے رہو گے

خدارا چھوڑ دو یہ حق پرستی
وگرنہ جان سے جاتے رہو گے

ہمیں بھی بولنے کی دو اجازت
کہ سب کچھ خود ہی فرماتے رہوگے

مری جاں لے لو بے شک ہوں میں راضی
اگر تم قبر پہ آتے رہوگے

مِرا دعویٰ ہے تم چاہو نہ چاہو
مِرے خوابوں میں لہراتے رہو گے

میں گائے جاؤں گا الفت کے نغمے
اگر تم رقص میں آتے رہو گے

کیا ہے کیا مِرے دشمن سے وعدہ
کہ تم مجھ پر ستم ڈھاتے رہو گے

ستم گر کو بتا کر حق بجانب
کہاں تک سچ کو جھٹلاتے رہو گے

رئیس الدین رئیس (علی گڑھ)

مِرے ہنر پہ نہیں صرف نکتہ چیں خاموش
ہنوز آسماں حیران ہے، زمیں خاموش

میں ان کے بیچ میں بیٹھا ہوا ہوں چپ سادھے
گمان ذہن پہ غالب ہے اور یقیں خاموش

کوئی نشان بظاہر نہ میں نے چھوڑا تھا
میں کیا کروں جو نہیں میری آستیں خاموش

وصال و ہجر کے لمحے زباں نہیں رکھتے
یہ کون ہے مِرے دل میں کہ جو نہیں خاموش

ترس رہے ہیں کئی آستانے سجدوں میں
تمہارے در پہ پڑی ہے مِری جبیں خاموش

مخالفین نے تم سے بہت سوال کیے
تمہارے سامنے بیٹھے رہے ہمیں خاموش

تمام شہر پہ سکتہ سا ہے رئیسؔ مگر
نہ جانے کیوں مِرے دل کا مکیں نہیں خاموش

بلند اقبال (مغربی بنگال)

اٹھنے لگی ہے باغ میں دیوار، ایک پھر
تقسیم ہونے والا ہے گلزار، ایک پھر

منزل قریب آئی تو رستے بدل گئے
مجھ سے بچھڑ گیا ہے مرا یار، ایک پھر

ماحول میں تناؤ ہے پھر اپنے گاؤں کے
لایا ہے کوئی شہر سے اخبار، ایک پھر

شاید کھلے گا پھر کوئی صحرا میں سرخ پھول
دیوانہ ہنس رہا ہے سرِدار، ایک پھر

بکھرے گا پھر سکوں کا تصور یہ جان لو
لگنے لگا ہے گاؤں میں بازار، ایک پھر

اپنے تمام شعر میں ان کو سنا چکا
پھر بھی ہے بار بار یہ اصرار، ایک پھر

نازاں ہے کوئی اپنی جفاؤں پہ اے بلندؔ
شرمندہ ہے وفا کا گنہگار، ایک پھر

ناظم خلیلی (رائچور)

ہم بکھرنے سے پہلے بکھر جائیں گے
انتظارِ اجل ہی میں مرجائیں گے

صبح تک سر پہ یادوں کی شمعیں لیے
قافلے آہٹوں کے گزر جائیں گے

رہروانِ رہِ عاشقی ایک دن
ٹھوکریں کھا کے خود ہی سدھر جائیں گے

دیکھ کر ہم کو جو پھول سا کھل اُٹھے
کوئی ایسا نہیں پھر بھی گھر جائیں گے

صبح تک چشمِ نم خشک ہوجائے گی
صبح تک روح کے زخم بھر جائیں گے

جا کے مغرور پیڑوں سے کہدے کوئی
ایک دن اُن کے کپڑے اتر جائیں گے

زندگی چار روزہ سہی پھر بھی ہم
چار ہی دن میں کچھ کام کرجائیں گے

سعید خان (سڈنی، آسٹریلیا)

تو بتا اے دلِ بیتاب کہاں آتے ہیں
ہم کو خوش رہنے کے آداب کہاں آتے ہیں

میں تو یکمشت اسے سونپ دوں سب کچھ لیکن
ایک مٹھی میں میرے خواب کہاں آتے ہیں

مدتوں بعد تجھے دیکھ کے دل بھر آیا
ورنہ صحراؤں میں سیلاب کہاں آتے ہیں

میری بیدار نگاہوں میں اگر بھولے سے
نیند آئے بھی تو اب خواب کہاں آتے ہیں

شدتِ درد ہے یا کثرتِ مے نوشی ہے
ہوش میں اب ترے بے تاب کہاں آتے ہیں

ہم کسی طرح ترے در پہ ٹھکانہ کر لیں
ہم فقیروں کو یہ آداب کہاں آتے ہیں

سر بسر جن میں فقط تیری جھلک ملتی تھی
اب میسر ہمیں وہ خواب کہاں آتے ہیں

عذرا پروین (لکھنؤ)

جس سے ہم کھلتے ، وہ چابی اور تھی
یہ بھی ہم میں اک خرابی اور تھی

میرے زنداں کے اندھیرے بھی الگ
ہر کرن بھی آفتابی اور تھی

آنکھ جلتے پربتوں کا ڈھیر تھی
منظروں کی بے حجابی اور تھی

اب ترا کاسہ ملاوٹ کی کتھا
دل،تری کل کی گلابی اور تھی

عذرا پروین

زوالِ ذات کے پھر کچھ نئے طبق دیکھو
درندگی پہ بشر کی،درندے فق دیکھو

اُڑے ہیں کبڑوں کے سردار بھی،حواری بھی
کہ ان کی پیٹھ پہ کوبڑ نہیں،افق دیکھو

یہ سچ ہے نت نئے منظر بڑے معلم ہیں
پڑھو کہ وقت نے الٹا ہے پھر ورق دیکھو

تمہیں کو دھوپ سے،سورج سے تھا حسد بے حد
تمہیں اداسی خاموشی شفق دیکھو

پرویز مظفر (برمنگھم)

تیری بندوق میرے شانے پر
اور میں بھی ترے نشانے پر

پھر کسی اور وقت مولانا
دل نہیں ہے ابھی ٹھکانے پر

اب مری زندگی کا دارومدار
ہے ترے آنے اور نہ آنے پر

تتلیوں کا قصور بخشا جائے
غنچے کھلتے ہیں چومے جانے پر

رات پھر دھوکہ کھا گئے پرویزؔ
اُٹھ گئے چاند کے جگانے پر

حیدر قریشی (جرمنی)

دیارِ دل میں کسی نے وُرود کرتے ہوئے
بجھا دیا، ہمیں روشن وجود کرتے ہوئے

نقاب اُلٹ دیئے سارے، مہذب انساں کی
بہیمیّت کی جبلّت نے عود کرتے ہوئے

یہ میرے جسم نے کیا کھیل مجھ سے کر ڈالا
مجھے نکال دیا بے وجود کرتے ہوئے

پہنچ گئے جو کنارے کبھی تباہی کے
تو بچ کے آ گئے وردِ دُرود کرتے ہوئے

کھڑے تھے شاہ کئی جھولیوں کو پھیلائے
فقیر گزرے تھے جس رہ سے جود کرتے ہوئے

کئی برس کی جدائی بھی کچھ بدل نہ سکی
وہ زُودرنج ملا، رنج زُود کرتے ہوئے

کسی کی یاد جلائی تھی جس گھڑی حیدرؔ
فضا مہک اُٹھی صندل کو دُود کرتے ہوئے

☆☆☆

مظفر حنفی (دہلی)

جہاں کوئی بھلی صورت نظر میں بیٹھ جاتی ہے
ہمیشہ کو نمی مٹی کے گھر میں بیٹھ جاتی ہے

ہر اک آئینۂ گل میں نظر آتا ہے وہ چہرہ
مِری وحشت ہر اک تتلی کے پر میں بیٹھ جاتی ہے

کبھی کانٹے مِرے دستِ ہنر میں ڈوب جاتے ہیں
کبھی دنیا مِرے پائے ہنر میں بیٹھ جاتی ہے

تعصب سخت جان ایسا کہ صدیوں تک نہیں مرتا
بھروسے کی عمارت لمحہ بھر میں بیٹھ جاتی ہے

تمہیں کیسے بتاؤں چاندنی پر شعر کہتا ہوں
تو ظلمت آ کے میرے بام و در میں بیٹھ جاتی ہے

چبھی جاتی ہے میری آنکھ میں اخبار کی سُرخی
لہو کی بوند ہر تازہ خبر میں بیٹھ جاتی ہے

کسی فنکار کا شہرت پہ اترانا نہیں اچھا
کہ دورانِ سفر کچھ دھول سر میں بیٹھ جاتی ہے

مظفر حنفی

خون جم گیا سارا غم چھپائے رکھنے میں
کھپ گیا ہر اک آنسو دل جگائے رکھنے میں

دوسروں کے ہنسنے میں ساتھ کیوں نہیں دیتے
فائدہ سبھی کا ہے گل کھلائے رکھنے میں

اب نظر نہیں آتا دور دور تک صحرا
تاک ہو گیا وحشی گرد اُڑائے رکھنے میں

آج ہر تعلق میں یہ اصول نافذ ہے
مصلحت ہے کٹنے میں یا بنائے رکھنے میں

ڈوب جائے گا سورج،رات گھات میں ہو گی
کر لیا سفر کھوٹا سائے سائت رکھنے میں

وہ بھی دور آئے گا اور جلد آئے گا
عافیت نہیں ہو گی سر بچائے رکھنے میں

صبح کی ہوا اکثر زور آزماتی ہے
خیر ہے چراغوں کی لَو بڑھائے رکھنے میں

مظفر حنفی

دشتِ ظلمت میں بھی امکان کو زندہ رکھا
میں نے باطن میں اک انسان کو زندہ رکھا

تھا قبیلے میں وہی ایک دلاور جس نے
ڈھال سینے پہ نہ لی آن کو زندہ رکھا

اس قدر دل کو کیا صاف کہ خود ہو گیا خاک
آئنوں نے مِری پہچان کو زندہ رکھا

تاکہ وہ امن کے موسم میں ہمیں قتل کرے
ہم جو کٹتے رہے، سلطان کو زندہ رکھا

سوچتا ہوں تو تعجب مجھے خود ہوتا ہے
کیسے اس دور میں ایمان کو زندہ رکھا

واقعہ یہ ہے مظفؔر کہ ترے لہجے نے
تجھ کو مارا ترے دیوان کو زندہ رکھا

مظفر حنفی

وفا کی راہ میں مرنا تو ہم بھی جانتے ہیں
ہمارے مسئلے کیا محترم بھی جانتے ہیں

عدالتیں اگر ان کو معاف بھی کر دیں
تو ان کے نام ہم اہلِ قلم بھی جانتے ہیں

ہمیں خوشی سے کوئی دشمنی نہیں لیکن
غریب لوگ ہیں توقیرِ غم بھی جانتے ہیں

خدا کے ساتھ محبت ہے آدمی سے ہمیں
پتہ ہے اہلِ حرم کو ، صنم بھی جانتے ہیں

ہمارے دور کے عاشق جنوں پسند نہیں
یہ بے غرض بھی ہیں اور بیش و کم بھی جانتے ہیں

وہ دست گیری نہ فرمائیں گے تو سن رکھیں
کہ ڈگمگانا ہمارے قدم بھی جانتے ہیں

شہناز نبیؔ (کلکتہ)

میں کہاں ہوں

اس نے جب کہانی مکمل کر لی تو اسے لگا ماں اسے پڑھ کر ضرور خوش ہوگی۔ اپنے طور پر اس نے اپنی کہانی کا سارا تانا بانا ماں کے اردگرد بنا تھا۔ ماں ہی اس کہانی کا مرکزی کردار تھی۔ حالانکہ اس میں اس کے باپ کا کردار بھی کچھ کم اہم نہ تھا اور کئی چھوٹے موٹے ضمنی کردار بھی تھے تاہم ماں تو ماں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اپنے بچپن کی یادوں سے کام لے کر اس نے حقیقت نگاری کی بہترین مثال پیش کی ہے۔ یوں بھی اس کے ذہن پر تھرکتی ہوئی تصویریں اب بھی اپنے رنگ و روغن کے اعتبار سے بے نظیر تھیں۔ اسے حیرت انگیز طور پر بچپن کے تقریباً سارے واقعات یاد تھے۔ اکثر بڑوں کو اس کی یادداشت سے کام لینا پڑتا تھا۔

یاد ہے ابا کے ایک دوست۔۔۔ کیا بھلا سا نام تھا ان کا۔۔۔

اوں ل ل۔۔۔۔۔

سلمیٰ آپا ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کرتیں۔

عطیہ ایک دم سے جھنجھلا جاتی۔ اف، آپ کو تو کچھ یاد ہی نہیں آتا۔

وہ۔۔۔شاید۔۔۔

ارے وہی جو کچھ گورے سے تھے۔ بھورے بھورے بال۔ آنکھوں پر۔۔۔۔

اوہ۔۔ہو۔۔۔حمید۔۔۔سلمیٰ آپا جیسے اس بار جیت جانے والی تھیں۔

نہیں بابا۔۔۔عطیہ اپنی پیشانی سہلاتی ہوئی یاد کرنے کی کوشش کرتی۔

وہ جن کے گلے میں تعویذ ہوا کرتا تھا۔ اس نے قطعیت کے ساتھ پوچھا۔

ہاں۔۔وہی۔۔۔لیکن تو تو اس وقت

ایک بار میرے لئے عید کے موقعے پر سرخ چوڑیاں لے آئے تھے۔ امی نے کہا۔۔ کیا کرتے ہو مقصودؔ۔ اتنی چھوٹی سی بچی کیلئے۔۔ ہاں۔ہاں۔۔ بالکل ٹھیک۔۔ سلمیٰ آپا مسرت سے چیخ پڑیں۔ مقصود۔ مقصود۔۔ تجھے یاد ہے؟

ہاں۔ میں امی کی گود میں بیٹھی۔۔۔

لیکن تو بہت چھوٹی سی تھی۔۔۔۔

مجھے تو یاد ہے کہ۔۔۔۔۔۔

عید قریب آ گئی تھی لیکن گھر میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ نئے کپڑے سلوائے جا سکیں۔ امی کے چہرے پر تردد کے آثار تھے۔ ابا سے تقریباً روز ہی اس بات پر چخ چخ ہو رہی تھی۔ لڑکیاں جوان ہو رہی ہیں۔ اب تو اپنی بری عادتیں چھوڑ دیئے۔

بری عادتیں۔۔۔؟ کیا گناہ کر رہا ہوں میں۔۔۔

میں نے یہ تو نہیں کہا۔۔۔ امی روہانسی ہو جاتیں۔

میں تو صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ۔۔۔ آپ اپنے پیسوں کو جن غلط قسم کے لوگوں پر خرچ کر رہے ہیں۔۔

تو میرے دوست تجھے غلط لگتے ہیں۔۔ سالی۔۔۔ میں تو۔۔۔

بچے جاگ رہے ہیں۔۔۔

کیا چاہتی ہے تو۔ بچوں کی خاطر میں دوستوں کو چھوڑ دوں۔ میری اپنی کوئی زندگی ہے یا نہیں۔۔ اور یہ سگریٹ۔۔ کتنا خرچ ہوتا ہے ان پر۔۔؟ سالی تیرے باپ نے دیا ہی کیا تھا۔۔ زندگی خراب ہوگئی میری۔۔۔۔

زندگی تو خراب ہوئی ہے میری۔۔۔ ماں سسکیاں لینے لگتی۔۔۔

کیا نہیں ملتا تجھے۔۔۔ باپ کی آواز اونچی ہونے لگتی۔ ماں کی سسکیاں مدھم ہوتی جاتیں۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا۔

اس کے بعد وہ دیر تک زمین کو گھورتی رہتی۔ اس کے چہرے پر آنسوؤں کے ساتھ بہہ جانے والی وہ کاجل کی لکیر۔ وہ کروٹ بدلتی رہتی۔ ماں اس کی پیٹھ کھجاتے کھجاتے تھک جاتی۔ سو۔ سو جا۔ سوتی کیوں نہیں کم بخت۔ دیکھ عطیہ کب کی سو گئی۔ ماں کا ستا ہوا چہرہ اسے اب بھی یاد ہے۔ وہ اپنے ذہن کے پردوں پر سے وہ منظر کھرچ دینا چاہتی تھی۔ لیکن یاد۔ ظالم یاد۔ اسے اپنے باپ سے نفرت نہیں تھی لیکن جب جب وہ ماں کو روتا ہوا پاتی تھی۔ اسے اس کے آنسوؤں کے پیچھے اپنا باپ ہی دکھائی دیتا تھا۔

اس بات نے اسے اپنے باپ سے کچھ منحرف سا کر دیا تھا۔ حالانکہ تمام تر مالی پریشانیوں کے باوجود وہ ان سب بہن بھائیوں کے لئے عید میں کپڑے بھی بنوا تا رہا تھا اور ان کی تعلیم پر معمولی طور سے ہی سہی، خرچ بھی کرتا رہا تھا۔ گھر کی کفالت کے نام پر ماں کے کتنے زیور بھینٹ چڑھے، انہیں اس کا پتہ ہی نہ چلا۔ دھیرے دھیرے وہ سب ماں کے کان، گلا اور ہاتھ کے سونے پن کے عادی ہوگئے۔ ماں کے چہرے پر آنسوؤں کے ساتھ بہہ نکلنے والی وہ کاجل کی لکیر۔ اور اس دن تو حد ہوگئی تھی جب عارفؔ اپنا پھٹا ہوا سر اور بہتا ہوا خون لیکر، سائیکل سڑک پر ہی چھوڑ، روتا ہوا آنگن میں داخل ہوا تھا۔ امی کے حواس اڑ گئے۔

ہائے۔۔یہ کیسے ہوا۔ہائے۔۔ارے اک رکشہ تو بلا۔اسے ڈاکٹر۔۔

اوراس کا باپ آفس سے گھر لوٹ آیا۔ بیٹے کے سر سے خون بہتا دیکھ اس نے ماں کی لہراتی ہوئی لمبی چوٹی کو مٹھیوں میں لپیٹا اورایک زور کا جھٹکا دے کر کہا۔۔۔کمبخت۔۔کام چور عورت۔تجھ سے بچوں کی دیکھ بھال کا چھوٹا سا کام بھی نہیں ہوتا۔۔۔۔

اس نے ماں کے آگے کاپی بڑھاتے ہوئے کہا۔

ماں۔۔۔۔

کیا ہے۔۔۔تمہاری کہانی۔۔۔۔۔

میری کہانی۔۔۔۔

ماں نے سارا قصہ پڑھ ڈالا۔کئی باراس کی آنکھوں میں آنسو جھلملائے۔کہیں کہیں اس نے سسکیاں بھی بھریں۔ دیر تک سوچتی بھی رہی۔زمین گھورنے کی پرانی عادت گئی نہیں تھی۔لیکن پھر خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے کہا۔

تیرے ابا ایسے کہاں تھے۔

کیا مطلب۔۔۔

تجھے کیا پتہ کہ وہ ہم سب کو کتنا چاہتے تھے۔تو بہت چھوٹی سی تھی نا۔ تجھے یاد نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی آمدنی بہت مختصر تھی۔اکثر فاقے کی نوبت رہتی تھی۔لیکن آخراسی مختصر آمدنی میں انہوں نے تم سب کی تعلیم کا بوجھ اٹھایا۔ سنیما وغیرہ بھی کبھی کبھی لے جایا کرتے تھے۔ تجھے یاد نہیں کہ ایک بار میلے میں۔۔۔۔

مجھے یاد ہے کہ جب عارؔف کا سر پھٹا تھا تو انہوں نے تمہاری چوٹی پکڑ کر ایک زور کا جھٹکا دیا تھا اور کہا تھا کہ۔۔۔۔

تیرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔تو ہماری زندگی اپنی آنکھوں سے دیکھنے والی کون ہوتی ہے۔اس میں، میں کہاں ہوں ؟اس میں تو،تو ہی تو ہے۔

ماں ناراض ہو گئی۔اس نے غصے کے مارے کاپی اٹھا کر پھینک دی۔

بخار آنے پر ساری ساری رات گود میں لے کر ٹہلایا کرتے تھے تجھے۔وہ سسکیاں بھرنے لگی۔عارف کے لئے مجھے مار پڑی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو بے حد چاہتے تھے۔ان کی۔۔۔۔

اس نے بددل ہو کر کاپی اٹھائی اور کالج چلی گئی۔یہ پتی ورتا عورتیں۔۔۔

اس کا سوچا ہوا منہ دیکھ کر سریتا نے پوچھا۔

کیا بات ہے۔چہرہ کیوں اترا ہوا ہے۔

کچھ نہیں بس یونہی۔

کچھ تو ہے۔۔۔

نہیں بابا۔اس نے سریتا کو ٹال دیا۔بتا تیری بات کہاں تک پہنچی۔

سریتا شرما گئی۔اس کی شادی کی بات طے ہو چکی تھی۔بس اگلے ہی مہینے وہ اور سریش شادی کے بندھنوں میں بندھ جائیں گے۔

سریش دیکھنے میں کیسا ہے؟

گورا رنگ۔اونچا قد۔بڑی بڑی پرکشش آنکھیں۔

کیا کرتا ہے۔؟

میکینکل انجینیر ہے۔سارا گھرانہ پڑھا لکھا ہے۔بہن اسٹیٹس میں رہتی ہے۔چھوٹا بھائی ڈاکٹر ہے۔سریش کی ماں اپنا بیوٹی پارلر چلاتی ہے۔باپ ریٹائرڈ جج ہیں۔مالی طور پر بھی کافی خوش حال لوگ ہیں۔

شادی کے بعد کچھ دنوں تک سریتا کی آنکھوں میں ستارے جھلملاتے رہے۔وہ بات کرتے کرتے سریش کی یادوں میں کھو جایا کرتی تھی۔بات بے بات اس کے ہونٹ مسکرا اٹھتے تھے۔اس نے اپنی ساری سہیلیوں کو شادی کرنے کے مشورے دے ڈالے۔اس کے لئے شادی دنیا کا سب سے انمول بندھن تھا۔عورت مرد کے بنا ادھوری ہے۔

وہ اچانک بول اٹھتی اور ساری سہیلیاں کھل کھلا پڑتیں۔

لیکن بہت جلد سریتا کی جگمگاتی آنکھیں ماند پڑنے لگیں۔اس کے ہونٹوں کے مسکراتے گلاب مرجھانے لگے۔اس کی بیخودی اک طرح کی یاسیت میں تبدیل ہونے لگی۔وہ بات کرتے کرتے چپ ہو جاتی اور ٹھیک اسی طرح زمین گھورنے لگتی جس طرح اس کی ماں گھورتی رہتی تھی۔

سب ٹھیک ہے نا!۔وہ اس سے بار بار پوچھا کرتی۔

ہاں بابا۔

لیکن جب اسے راکھی نے بتایا کہ سرؔیتا سرکاری ہسپتال کے برن وارڈ میں بھرتی ہے تو اس کا سر گھوم گیا۔

تو تو کہتی تھی سب ٹھیک ہے،سب ٹھیک ہے۔

اس نے اپنے آنسو سریتا سے چھپاتے ہوئے کہا۔

سریتا نے نہایت نحیف آواز میں جواب دیا۔

سب ٹھیک ہی تو ہے۔

یہ آگ آخر کیسے لگی۔؟

میں سریش کے لئے چائے بنا رہی تھی کہ اچانک اسٹو۔۔۔۔

جھوٹ بکتی ہے تو۔اس نے روتے ہوئے کہا۔میں نہیں چھوڑوں گی ان لوگوں کو۔

مجھے سب پتہ ہے۔تیرے سسرال والے نقدی نہ لانے کی وجہ سے تجھ پر ناراض تھے۔چاچا جی نے جہیز تو بہت سا دیا

تھا لیکن سریش کو نقدی چاہئے تھی۔ اسے بھی اسٹیٹس جانے کی دھن سوار تھی۔ اس نے شادی کے کچھ دنوں بعد ہی تجھ پر ظلم کرنا شروع کر دیا تھا۔ کبھی دیر سے سو کر اٹھنے کو وجہ بناتا اور کبھی سویرے سو جانے کو۔ اس کی نظر تیرے پاپا کے اس مکان پر بھی تھی جسے وہ آدیش کے نام کر چکے تھے۔ جب تو نے

اپنے پاپا سے روپے مانگنے سے انکار کر دیا تو ایک دن اس نے موقعہ دیکھ کر تجھ پر۔۔۔۔

سریتا نے آنکھیں موندلیں۔

یہ کس کا قصہ سنا رہی ہے تو۔

تیرا اور کس کا۔

لیکن یہ سچ نہیں ہے۔

تجھے پتہ ہے سریش کتنا ذہین طالبِ عالم تھا۔ پوری ریاست میں وہ دوسری پوزیشن پر تھا۔ اسے اچھی اچھی کمپنیوں سے آفر آئے تھے کہ وہ انہیں جوائن کرے لیکن سریش کو اپنی صلاحیتیں ثابت کرنے کا مناسب موقعہ نہیں مل رہا تھا۔

اگر اس نے اسٹیٹس جانے کی سوچی تو کیا برا کیا۔

ہر شام وہ میرے لئے بیلے کے ہار لایا کرتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ مجھے بیلے کی خوشبو بہت پسند ہے۔ میں اس سے ایک پل الگ رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی لیکن دنیا میں کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ اگر اچھی ملازمت کی خاطر اسے پردیس۔۔۔۔

تو کیا پردیس جانے کے لئے وہ تیرا خون کر دے گا۔۔۔؟

کون کہتا ہے۔۔۔۔

میں کہتی ہوں۔۔۔۔ وہ ظالم ہے، خونی ہے، مجرم ہے۔۔۔۔

یہ حقیقت نہیں ہے۔۔۔

تو پھر حقیقت کیا ہے۔۔۔۔۔

جو ہم نہیں دیکھ پاتے۔۔۔ تو زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔۔۔ تیری حقیقت میں، میں کہاں ہوں۔۔؟

اس نے ہسٹریائی انداز میں سریتا کی طرف دیکھا۔

میں کہاں ہوں۔؟ ماں اور بابا کے بیچ۔۔؟ سریتا اور سریش کے بیچ۔۔؟ یا ماں سے قریب، بابا سے دور۔ یا پھر جگہ بدلتے ہوئے۔۔؟ نقل مکانی کرتے ہوئے۔۔۔ میں ان کرداروں کو کہاں سے دیکھوں۔۔۔؟ دور سے۔۔؟ قریب سے۔۔۔؟ آنکھیں موند کر۔۔۔ آنکھیں کھول کر۔۔۔ کیا میں انہیں دیکھوں، سنوں، یا صرف محسوس کروں۔؟ میرے اور قاری کے بیچ کی دیوار کون ہے؟ اس کہانی میں میں کہاں کہاں نہیں ہوں، کہاں کہاں ہوں؟

طاہر نقوی (کراچی)

چوکیدار

آج نوری نے اس سے غیر متوقع بات پوچھی۔

اس وقت وہ اپنے کام پر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اس دوران نوری کا رویہ حسب معمول بے دلی کا رہا۔

’’رات کی ڈیوٹی کب تک کرو گے؟‘‘

یہ سن کر وہ چونک پڑا۔ وہ نوری کے جذبات سے بخوبی واقف تھا۔ اس سے زیادہ اسے اپنے فرض اور ذمہ داری کا احساس تھا۔

’’میرا کام ہی ایسا ہے‘‘

’’دن کی ڈیوٹی لگوا لو۔‘‘

’’بے وقوف۔ چوکیداری رات کو ہوتی ہے۔ دن میں اس کی ضرورت نہیں۔‘‘

’’رات کو میں اکیلی ڈرتی ہوں۔‘‘

’’فضلو کی بیوی ہوتے ہوئے ڈرتی ہو‘‘ اس نے قہقہہ لگایا۔

نوری نے برا سا منہ بنایا تو فضلو نے اپنائیت سے کہا۔

’’علاقے کے سارے چور اُچکے میرے نام سے کانپتے ہیں۔‘‘

اس جواب سے بھی نوری مطمئن نہیں ہوئی اور بے بسی سے بولی۔

’’کبھی غیر حاضری کر لیا کرو۔‘‘

’’میں نہیں گیا تو کسی کا گھر لُٹ سکتا ہے، کسی کی عزت۔‘‘

’’تم رات بھر جاگتے ہو، یوں کب تک چلے گا؟۔‘‘

’’میں جاگتا ہوں، تب ہی علاقے کے لوگ چین کی نیند سوتے ہیں۔‘‘

جانے سے پہلے وہ نوری کو روزانہ اسی طرح سمجھایا کرتا تھا مگر اس کی ایسی باتوں سے نوری کو کبھی تسلی نہ ہوتی اور کچھ کہتے کہتے رُک جاتی۔ فضلو اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا تو کہتی۔

’’کوئی بات خود بھی سمجھ لیا کرو۔‘‘

فضلو کو پڑھنے لکھنے کا شوق کبھی نہیں تھا۔ چند ابتدائی جماعتیں پڑھ کر ہی تعلیم کی طرف سے اس کا جی اچاٹ ہو گیا۔ وہ کسی چھوٹی موٹی نوکری کی تلاش میں گھومتا رہا مگر کوئی بات نہیں بنی۔ اس کی مایوسی بڑھتی رہی۔ تب اس کے باپ نے اسے اپنی جگہ اسی علاقے میں چوکیدار رکھوا دیا۔ اس کا باپ طویل عرصے سے اس علاقے میں اسی کام پر لگا ہوا تھا۔ اب بوڑھاپے کی وجہ سے اس کے قویٰ جواب دے چکے تھے۔ اسی نے فضلو کو اس کام کی اہمیت اور عزت کا سبق پڑھایا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ کام جاں نثاری کا ہے۔ اسے انجام دیتے ہوئے دل میں کبھی بدنیتی یا بے ایمانی کی کھوٹ نہیں آنی چاہیے۔ اپنے باپ کے انہی اصولوں سے متاثر ہو کر فضلو نے یہ بات اپنی گرہ میں باندھ لی تھی کہ چوکیدار چوکس ہو تو مکین سکون کی نیند سوتے ہیں۔ نوری سے اس کی شادی اس کے باپ نے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے کر دی تھی۔ پھر وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا۔ فضلو نے اپنی ایمانداری اور ذمہ داری کے سبب وہاں کے رہنے والوں کے دل جلد جیت لئے۔ انہیں اس پر اپنے گھر کے فرد کا سا اعتماد ہو گیا تھا۔ وہ اکثر ان کے ذاتی کام کر دیتا۔ اس لئے وہ لوگ اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آتے اور بہانے سے اسے رقم دینا چاہتے۔ وہ اسے اپنی خودداری کے خلاف سمجھتا اور لینے سے صاف انکار کر دیتا۔ رقم سے زیادہ وہ اپنے کام کی تعریف سے خوش ہوتا۔ اس کے کہنے سے پہلے ہی اسے سائیکل بھی دلوا دی گئی۔ البتہ عید اور بقر عید کے تہواروں پر وہ لوگ فضلو اور اس کی بیوی کو نئے جوڑے اور عیدی اصرار کر کے دیتے تھے۔ اس کے باوجود نوری، فضلو کی موجودہ نوکری سے خوش نہ ہوتی اور اٹھتے بیٹھتے دن کے وقت کی کوئی ملازمت حاصل کرنے کو کہتی رہتی۔ وہ اسے سمجھاتا کہ بھلا اتنے کم پڑھے لکھے کو نوکری کہاں ملے گی۔ اگر ملی بھی تو نہ اس سے زیادہ تنخواہ کی، نہ عزت کی۔ وہ اس کے جواب پر محض جھنجھلاتی رہتی۔

اس علاقے میں فضلو کے چوکیدار کی حیثیت سے آنے کے بعد نہ کوئی چوری چکاری ہوئی تھی اور نہ ایسی ویسی واردات۔ اس لئے اس کا ضمیر مطمئن رہتا تاہم نوری کی بڑھتی ہوئی ضد کے باعث اب وہ پریشان رہنے لگا۔ کوئی دن نہ جاتا جب وہ موجودہ نوکری کو ترک کرنے پر اصرار نہ کرتی۔ اس کے شدید رویے کے باعث فضلو مجبور ہو گیا۔ اس نے وہاں کے دو ایک بااثر افراد سے اس سلسلے میں بات کی۔ وہ محض ہوں ہاں کر کے چپ ہو رہے۔ فضلو کا خیال یہی تھا کہ وہ لوگ اس جیسے مخلص چوکیدار کو کھونا نہیں چاہتے۔ اس نے یہ بات نوری کو اپنی تعریف کے رنگ میں بتائی تو اس نے تائید نہیں کی بلکہ اس کی ہنسی اڑانے لگی فضلو نے نوری کے اس ردعمل کو سادگی اور کم فہمی سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔

سردی کے موسم میں محلّہ جلد سنسان ہو جاتا تھا۔ بجلی کے کھمبوں کی کمزور روشنی دور تک نہ پہنچتی۔ ان دنوں فضلو لمحے بھر کے لئے بھی ایک جگہ نہ ٹکتا ور تیزی سے چکر لگاتا رہتا۔ رات کے سناٹے میں اس کی گرجدار آواز گونجتی تو علاقے کی ساری گلیاں جاگ اٹھتیں۔ ایک رات معمول کے مطابق اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے اچانک اسے

نسوانی چیخ سنائی دی۔ وہ وہیں ٹھہر گیا اور آواز کی سمت متعین کرنے لگا۔ آواز سامنے والے مکان سے آ رہی تھی۔ وہ لپک کر قریب گیا اور سن گن لینے لگا۔ اب نسوانی چیخوں کے ساتھ کسی مرد کی دھمکی آمیز کرخت آواز بھی سنائی دی۔ فضلو معاملے کی نزاکت کو بھانپ گیا۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ دیوار پھاند کر اندر کود گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شخص، نوجوان لڑکی پر جھکا ہوا تھا۔ لڑکی ہاتھ جوڑے روتے ہوئے معافی مانگ رہی تھی۔ فضلو نے جاتے ہی اس درندے پر اپنی لاٹھی سے حملہ کر دیا۔ وہ حواس باختہ ہو گیا۔ اسے فضلو نے آسانی سے قابو کر لیا کیونکہ چور، اُچکے اور غنڈے میں کبھی حوصلہ نہیں ہوتا۔ لڑکی نے اپنے آپ کو سنبھالا، اپنے ماں باپ کے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کھولے اور ان کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا۔ لڑکی کے باپ نے فضلو کی موجودگی میں پولیس اسٹیشن فون کر کے پولیس کو بلوالیا۔ پولیس اس غنڈے کو گرفتار کر کے لے گئی۔ لڑکی اور اس کے ماں باپ، فضلو کے احسان مند تھے۔ ان تینوں کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ وہ ان کی ڈھارس بندھاتا رہا۔ لڑکی کے ماں باپ اس کی مالی مدد کر کے احسان کا بدلہ چکانا چاہتے تھے۔ فضلو کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسے تو بس یہ فخر تھا کہ اس نے کسی شریف لڑکی کی عصمت پر دھبہ نہیں آنے دیا۔ اس سارے معاملے میں سورج نکل آیا۔ تب ان لوگوں سے رخصت لے کر فضلو خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اس کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ آج دیر ہو جانے کی وجہ سے نوری دروازے پر کھڑی اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ جاتے ہی وہ نوری کو سب سے پہلے اپنا آج کا کارنامہ سنانا چاہتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اندر داخل ہوا تو بوکھلا کر رہ گیا۔

نوری بستر پر لُٹی پٹی پڑی تھی۔!!!

’’اسے پھر اپنی بیوی پر غصہ آنے لگا۔۔۔ مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے اتنے لمبے عرصے کے بعد چھٹی کیوں کی ہے؟ کمرے میں اکیلا پڑا خود سے کیوں الجھتا رہتا ہوں۔۔۔ سمجھ رہی ہوگی شہر کی حالت اچھی نہیں ہے۔۔۔ بہت سی بستیوں میں کرفیو دندناتا پھر رہا ہے۔ اسی خوف سے میں گھر میں بیٹھ گیا ہوں۔۔۔ بس اندازے سے ہی سارا کام چل رہا ہے۔ حقیقت معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کسی کو۔۔۔ مگر حقیقت کیا ہے۔۔۔ میں نے چھٹی کیوں کی ہے۔ کیوں اپنے بے چین سوالوں کا جواب مجھے خود معلوم نہیں۔۔۔ وہ بیچاری کیا جانے۔ نہیں اتنا عرصہ ہو گیا ساتھ رہتے ہوئے۔۔۔ میرے مزاج،۔۔ میری طبیعت۔۔۔ میری ضرورت سے واقف تو ہونا چاہئے تھا۔۔ واقف ہونے کی کوشش تو کرنی چاہیے تھی۔۔۔ بس اپنی سنانے آ گئی۔۔۔ پتہ نہیں سورج کہاں کھو گیا ہے۔۔۔؟ سورج کوئی بچہ ہے کہ کھو جائے گا۔۔۔‘‘

سلطان جمیل نسیم کے افسانہ **اندھیرے سے آگے** کا اقتباس

محمد حامد سراج (میانوالی)

تسبیح کے دانے

یہ ایک دیو کی کہانی ہے

اسے بڑی عمر کے لوگ بھی پڑھ سکتے ہیں لیکن کہانی پڑھنے کے دوران آداب ملحوظ خاطر رہیں کیوں کہ اب دادی ماں کہانی نہیں سنایا کرتی ہیں ہم نے بڑی مشکل سے دادی ماں کو اس بات پر رضا مند کیا ہے کہ بچپن میں وہ ہمیں سجو دیو سفید کی کہانی لحاف میں بیٹھ کر سنایا کرتی تھیں اب ہمارے بچوں کو بھی سنائیں۔دادی ماں کا کہنا ہے میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں باتونی بہت ہیں۔ان کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔کہانی سنانے کے دوران یہ اپنی لایعنی باتوں کی اتنی پیوند کاری کرتے ہیں کہ کہانی کا تسلسل برقرار نہیں رہتا۔مجھے کہانی کا گم شدہ سرا تلاش کرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ذہن پر زور دے کر بمشکل سرا پکڑتی ہوں۔دیو سفید میرے قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔

ہم نے دادی ماں سے پوچھا دیو سفید کیسے آپ کے قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔

بیٹا یادداشت کمزور ہو گئی ہے۔ضعیفی نے گرفتار کر رکھا ہے۔

دادی ماں جیسے ایک طاقت ور ملک نے کمزور ممالک کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔

بچے تو بچے تم بڑے بھی بولنے سے باز نہیں آتے۔

سارے بچوں نے فیصلہ کیا کہ آج رات دادی ماں سے دیو سفید کی کہانی سنی جائے۔انہیں دیو سفید سے زیادہ حسن بانو سے دلچسپی تھی جو اس دیو کی قید میں تھی۔کہانی میں ایک بادشاہ تھا۔نام تھا اس کا شاہ بہرام اور وہ تھا کہانی کا مرکزی کردار۔۔

کہا ہے نا۔۔۔ہم نے دادی ماں کو کہانی سنانے پر بڑی مشکل سے رضا مند کیا ہے۔

کہانی سننے سے پہلے بچوں نے کچھ فیصلے کیے۔

ٹیلیویژن بند رہے گا۔کمپیوٹر پر گیم اور کارٹون نہیں چلیں گے۔کہانی کے دوران بولنے پر پابندی کو بنیادی شرط قرار دیا گیا۔اور یہ بھی طے پایا کہ آج بتیاں گل کر کے لالٹین کی روشنی میں کہانی سنی جائے۔

ایک شرارتی بچے نے کہا

دادی ماں امریکہ سے ڈرتی ہیں کہ کہیں وہ ہم پر بھی حملہ نہ کر دے اس لیے بلیک آؤٹ کر کے لالٹین کی روشنی میں کہانی سنائی جائے گی۔۔۔ہی ہی ہی ہی

دادی ماں نے یہ باتیں سن لیں نا۔۔۔تو حسن بانو کی کہانی ادھوری رہ جائے گی۔

لگتا ہے تمہیں حسن بانو سے کچھ زیادہ ہی عشق ہو گیا ہے۔

کیوں نہ ہو۔۔۔اسے دیو کی قید سے آزادی تو دلانی ہے۔۔۔قید آخر قید ہوتی ہے۔

پہلے ہم کون سے آزاد ہیں۔۔۔؟

فلسفہ اور تاریخ نہ جھاڑو۔لالٹین صاف کرانے کا بندوبست کرو۔

اتنے میں دادی ماں کی آواز سنائی دی۔''بہو لالٹین صاف کرا دی ہے۔''

ہو رہی ہے اماں جی۔۔۔ا

گھر میں کوئی طاقچہ نہیں تھا لالٹین صاف کر کے میز پر سجا دی گئی۔وہیں ایک پیتل کا پرانے وقتوں کا مرصع لیمپ بھی رکھا ہوا تھا جس میں مٹی کے تیل کی بجائے اب زیرو کا بلب جلتا تھا۔اسے وقت کی رفتار نے ڈیکوریشن پیس بنا دیا تھا رات کے کھانے پر بھی موضوع دیو سفید ہی تھا۔کھانا کھا کر سب دادی ماں کے گرد جڑ کر بیٹھ گئے

دادی ماں کے چہرے پر نورانی ہالہ تھا۔سفید لباس میں ان کا تقدس اور ابھر آیا تھا۔تسبیح سرہانے رکھ کر ابھی انہوں نے کہانی شروع بھی نہیں کی تھی کہ ان کی پوتی بولی۔

دادی ماں۔۔۔ہوم ورک تو ہم نے سکول سے آتے ہی کر لیا تھا۔آپ نے اسی وقت کہانی سنا دی ہوتی۔

بٹیا۔۔۔دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔

دادی ماں۔۔۔مسافر اب پیدل نہیں بلکہ بسوں کاروں ٹرینوں اور جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔

بس ہو گئی کہانی۔۔۔۔ایک پوتا جھلایا۔

مت ڈانٹو اسے۔۔۔تمہاری چھوٹی بہن ہے۔

اگلے وقتوں کی بات ہے۔ملکِ فارس میں ایک بادشاہ تھا۔نام تھا اس کا شاہ بہرام۔اللہ نے اس پرُحسن انڈیل دیا تھا۔اس کی سلطنت بڑی وسیع و عریض تھی ہر طرف اس کے انصاف اور رحمدلی کا ڈنکا بجتا تھا۔ایک بار بادشاہ اپنے مصاحبین کے ہمراہ سیر کو نکلا' سیر میں شکار بھی شامل تھا۔پہلا پڑاؤ ایک جنگل میں تھا۔جنگل میں اترتے ہی خیمے لگا دیے گئے۔تخت بچھا دیا گیا۔باورچی قناتیں لگا کر انواع واقسام کے کھانے تیار کرنے لگے۔کھانوں کی اشتہا بھوک کو اور سِوا کرتی تھی۔بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا رقص وسرود سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ناگاہ ایک سفید گھوڑا آسمان سے اترا۔نگاہ اس پر ٹھہرتی نہ تھی۔مصاحب اس کی طرف دوڑے وہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔سب نے اپنی سی کوشش کر دیکھی اور تھک ہار کر بیٹھ گئے۔

بادشاہ نے خود گھوڑے کی طرف قدم بڑھائے۔گھوڑے نے گردن جھکا دی۔

تالیوں کے شور میں مصاحبین نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ گھوڑا آپ کے لیے بھیجا ہے

بادشاہ اس پر سوار ہوا۔گھوڑا دلکی چال چلنے لگا۔مسرور بادشاہ اس کی پشت پر کروفر سے بیٹھا تھا۔گھوڑے نے میدان میں دو تین چکر کاٹے تالیوں کی گونج بڑھتی گئی۔تالیوں کی گونج کے ساتھ گھوڑے کی رفتار بھی بڑھنے لگی اچانک ایک چکر میں اس نے فضا میں جست بھری اور اڑا۔مصاحبین دیکھتے رہ گئے اور گھوڑا اسوار سمیت نظروں سے غائب ہو گیا

میرے خیال میں رائٹ برادران نے پرندوں کی بجائے گھوڑوں کی کہانیوں سے ہی ہوائی جہاز بنانے کا آئیڈیا لیا ہوگا۔۔۔دادی ماں کا پوتا بولا

چپ۔۔۔کہانی کے دوران بولنے کی ممانعت ہے۔۔۔دادی ماں کی پوتی بولی

عجیب بات کہی تم نے۔۔۔اتنا بڑا واقعہ ہو گیا گھوڑا ہمارے بادشاہ سلامت کو اغوا کر کے اپنے ملک لے گیا اور تم کہتی ہو بولنے کی ممانعت ہے اب سائینس کا عہد ہے وہ ہمارے بادشاہ سلامت کے دماغ میں کوئی Chip فٹ کر دے پھر کیا ہوگا۔۔۔؟

بڑی مشکل سے بچوں کی ماں نے انہیں چپ کرایا۔بچوں کو دادی ماں کا تو سرے سے ڈر تھا ہی نہیں دادی ماں کا کہنا تھا کہ بلا وجہ جھڑکنے، ٹوکنے اور سزا دینے سے بچوں کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے اور ان کی شخصیت کا تار و پود بکھر جاتا ہے۔

گھوڑا ایک طلسماتی دنیا میں جا اترا۔باغات، نہریں، جھرنے، فوارے، سبزے کی روشیں، پرندوں کے چہچہانے کی سریلی آوازیں، جنتِ ارضی کا نمونہ تھا۔بادشاہ عالمِ تحیر میں تھا۔

گھوڑے نے جون بدلی۔اب بادشاہ کے سامنے ایک دیو ہیکل بلا کھڑی تھی

شاہ بہرام۔۔۔اس کی آواز گونجی، زمین تھرائی۔۔۔میرا نام دیو سفید ہے۔یہ میری سلطنت ہے۔میری طاقت کا اندازہ تمہیں ہو گیا ہوگا۔میں من موجی ہوں۔جس ملک میں چاہوں لمحوں میں جا پہنچتا ہوں جس کو چاہوں اٹھا لاؤں مجھے کوئی روکنے والا نہیں مجھے جو پسند آ جائے اسے اٹھا کر اپنی سلطنت میں شامل کر لیتا ہوں۔تم بھی مجھے پسند آئے اور میں نے تمہیں اٹھانے کا پروگرام ترتیب دے ڈالا اور آج میں بہت خوش ہوں۔تم میرے ہو۔میری سلطنت میں رہو، راج کرو۔میری مانو گے تو ساری عمر سکھی رہو گے۔میں تمہیں مالا مال کر دوں گا۔اپنے خزانوں کے منہ تم پر کھول دوں گا۔

لو۔۔۔یہ لو۔۔۔اس باغ کی کنجیاں۔۔۔اس نے کنجیاں شاہ بہرام کی طرف پھینکیں

تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔آرام سے رہو۔جہاں چاہو گھومو پھرو۔لیکن ایک بات کا خیال رہے۔ہماری دنیا تمہاری دنیا سے مختلف ہے۔تم پسماندہ اقوام میں سے ہو۔ہم دیو ہیں ہمیں حکومت کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔

ہمارے کچھ اصول ہیں۔تم بھی سن لو

ہمارے سامنے سر اٹھانے کی جرات نہ کرنا

ہمارے راز جاننے کی کوشش بھی تمہیں مہنگی پڑے گی

ایک راز ہے، سر بستہ۔۔!اس باغ کے مشرقی سمت ہم نے سونے اور چاندی سے ایک محل تعمیر کیا ہے۔کیوں تعمیر کیا ہے۔۔۔؟ یہ بات تمہارے لئے خارج از بحث ہے۔تم نے اس باغ میں قدم نہیں دھرنا۔۔۔ان چابیوں کے گچھے میں ایک چابی سونے کی ہے۔

یہ کہہ کر دیو سفید نے اڑان پکڑی اور غائب ہو گیا

دادی ماں۔۔۔پھر آگے کیا ہوا۔۔۔؟

مجھے الائچی منہ میں رکھ لینے دو

دادی ماں الائچی منہ میں رکھنے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔؟

منہ خشک نہیں ہوتا۔۔۔تم سوال بہت کرتے ہو۔۔۔دادی ماں نے کہا

گریٹ دادی ماں۔۔۔لائٹ آن کر دوں۔۔۔لالٹین کی روشنی میں دم گھٹ رہا ہے

تم جانتے ہی ہو حالات خراب ہیں ایمرجنسی چل رہی ہے۔کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا ہے۔اندر باہر بلیک آؤٹ ضروری ہے۔۔۔!

خوش بختو۔۔۔یہ اندر کا بلیک آؤٹ کیا ہوتا ہے۔۔۔دادی ماں نے پوچھا

دادی ماں۔۔۔روح کا چراغ بجھ جائے نا تو اندھیرا ہو جاتا ہے۔اور پھر سارے فیصلے اندھے ہوتے ہیں

اگر دراندازی کی رفتار یہی رہی تو کہانی ایک سال میں بھی مکمل نہیں ہوگی

چپ۔۔۔بھئی۔۔۔مکمل چپ۔۔۔اب نہیں بولنا

جی دادی ماں۔۔۔تو آپ کہہ رہی تھیں۔۔۔"بی باون" نے اڑان پکڑی

ہیں ں ں ں ں ں۔۔۔یہ نگوڑا "بی باون" کیا ہوتا ہے

دادی ماں آپ ہی تو کہہ رہی تھیں۔۔۔"دیو سفید نے اڑان پکڑی اور غائب ہو گیا

اچھا۔۔۔اچھا۔۔۔یہ دیو کا انگریزی نام ہے۔چھپن سال گزر گئے ہماری ذہنی غلامی نہ گئی

شاہ بہرام نے وہاں بسرام کیا

ایک دن اس کے من میں تجسس نے انگڑائی لی اور اس نے سونے چاندی کے محل کی سیر کا ارادہ باندھا۔پہلے وہ ہچکچایا۔۔۔ڈرا، لیکن خواہش غالب آ گئی۔جب وہ محل میں داخل ہوا تو تحیر سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں

یا خدا۔۔۔یہ میں زمین پر ہوں یا جنت میں آ نکلا ہوں۔ایسے مناظر تو دیکھے نہ کبھی سنے۔۔۔!

وہ قدم قدم آگے بڑھا۔تالاب میں پانی کی لہریں یوں انگڑائیاں لے رہی تھیں کہ ان سے موسیقی کی مدھر تانیں بہہ کر سماعت میں رس گھولتی تھیں ۔وہ ایک لہر کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔وہ سارے لمس اپنے اندر اتار لینا چاہتا تھا۔وہ ابھی پانی کے لمس میں ہی کھویا تھا کہ اچانک اس نے ایک کشادہ چاندی کی روش پر تین پریاں دیکھیں۔وہ تالاب کی سمت ہی آرہی تھیں ۔وہ اوٹ میں ہو گیا۔دو پریوں نے اودے پیلے رنگ کا اور ایک پری نے سرخ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔وہ سرخ لباس والی اپنے حسن میں یوں یکتا تھی کہ چاند بھی مقابل رکھا جائے تو ماند پڑ جائے۔وہ لباس اتار کر تالاب میں اتر گئیں ۔پانی میں رنگ بھر گئے ۔شاہ بہرام دبے پاؤں آگے بڑھا اور سرخ پری کا لباس چرا لیا۔یہ وہی لباس تھا جو پریوں کو اڑنے میں معاون ہوتا ہے۔

کتنی دیر وہ نہاتی اور ایک دوسرے پر پانی اچھالتی رہیں ۔تالاب سے نکل کر جب انہوں نے لباس دیکھا تو غائب۔۔۔ان کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔انہوں نے باغ کا کونا کونا چھان مارا

اودے پیلے لباس والی لڑکیوں نے تھک کر کہا کہ ہم تو چلیں اور پرواز کر گئیں۔

سرخ پری زیرِ دام آگئی تھی

دادی ماں کی کہانی قدم قدم پر رزلٹ آؤٹ کر رہی ہے۔۔۔ایک پوتے نے انگڑائی لے کر کہا

واہ۔۔۔واہ۔۔۔دادی ماں۔۔۔اس کا مطلب یہ ہے کہ دیو سفید اتنا چالاک تھا کہ اس نے ہر کسی کو پھانسنے کے لیے الگ الگ نیٹ ورک پھیلا رکھا تھا۔گھوڑے کا روپ' کہیں باغات کا جھانسہ' تالاب اور کہیں دھونس دھاندلی۔۔۔!لیکن اصل مقصد صرف انسانوں اور پریوں کو پھانسنا تھا۔

یعنی یہ اس کا مشغلہ تھا۔۔۔دوسرے پوتے نے مونگ پھلی کا خالی شاپر ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے کہا

کہانی میں چائے کا وقفہ۔۔۔۔۔!

دادی ماں نے کہا' بچوں کو اونگھ آرہی ہے۔بہو چائے بنا لاؤ

سرخ پری پریشان تھی۔۔۔۔۔۔

اس نے آواز لگائی۔۔۔تم جِن ہو۔۔۔انسان' بھوت پریت یا کوئی اور مخلوق' میرے سامنے آؤ۔۔۔!

شاہ بہرام نے اوٹ سے انسانی لباس اس کی جانب پھینکا

لباس پہن کر وہ شاہ بہرام کے سامنے تھی۔۔۔شاہ بہرام کبھی آسمان پر بادلوں کی اوٹ میں سے نکلتے چھپتے چاند کو دیکھتا تو کسی لمحے سرخ پری کو اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون زیادہ خوبصورت ہے۔۔۔؟

تم کون ہو۔۔۔؟

میں شاہ بہرام ہوں

میں بدقسمت حسن بانو ہوں

بدقسمت کیوں۔۔۔؟

دیو سفید نے مجھے اسیر کرنے کے لیے یہ سارا جال پھیلایا۔میں اس کے ہاتھ نہ آئی۔ابھی وہ آئے گا۔زندہ تم رہو گے نہ میں۔۔۔!ایک ہی راستہ ہے

کون سا۔۔۔؟

تم مجھے میرا لباس لوٹا دو تا کہ میں شہرِ پرستان کو پرواز کر جاؤں

یہ تو ممکن نہیں۔۔

ضد نہ کرو۔۔۔وہ بہت طاقت ور ہے

دیو سفید مجھ سے محبت کرتا ہے۔وہ میرا دوست ہے

وہ کسی کا دوست نہیں ۔۔۔بس اپنے مفادات کا دوست ہے۔اسے دوست دشمن کی تمیز ہی نہیں وہ اپنے مفادات کے لیے سب کو کچا چبا جاتا ہے۔شاہ بہرام کی ضد کے سامنے حسن بانو نے ہتھیار ڈال دیے اور ایک لائحۂ عمل طے کیا کہ دیو سفید کا سامنا کیسے کرنا ہے۔۔۔!

لحاف' بچے اور دادی ماں ۔۔۔چائے آگئی۔داستان تھوڑی دیر کے لیے سانس لینے کو رُکی اور بچوں کی منطق چل پڑی۔

ہماری دادی ماں کا ارادہ گوانتانا موبے جانے کا ہے

یہ صوبہ بلوچستان کا کوئی علاقہ ہے۔۔۔دادی ماں نے معصومیت سے پوچھا

دادی ماں۔۔۔اچھی اچھی دادی ماں۔۔۔یہ علاقہ بھی دیو سفید کی سلطنت میں آتا ہے

دادی ماں روٹھ گئی اور کہانی سنانے سے انکار کر دیا

تم بس انٹرنیٹ اور کیبل پر بیٹھا کرو۔۔۔وہی تمہارا قبلہ کعبہ ہے۔نماز نہ روزہ۔۔۔میں نے کتنی بار نماز کی تاکید کی تمہارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ پکی حدیث ہے میرے نبی سوہنےﷺ کی۔بالکل پکی۔۔بخاری شریف میں لکھی کھڑی ہے کہ جو صبح کی نماز کے لیے نہیں اٹھتا شیطان اس کے کان میں پیشاب کر جاتا ہے اور سارا دن نحوست چھائی رہتی ہے۔

چپ کیوں ہو گئے ہو۔۔۔؟ دادای ماں نے پوچھا

دادی ماں۔۔۔وہ۔۔بات یہ ہے۔۔۔اس کے ایک پوتے نے ہکلاتے ہوئے کہا

بولو

میں ایک دن مطالعہ کر رہا تھا۔ایک نفسیات دان ہے'' ژونگ''۔۔۔اس نے لکھا تھا کہ جو لوگ صبح سویرے نہیں اٹھتے' سورج نکل آنے پر بھی سوئے رہتے ہیں انہیں کسلمندی ایسا گھیرتی ہے کہ وہ سارا دن اپنے آپ کو تھکا تھکا اور

نڈھال محسوس کرتے ہیں

یہی تو نحوست ہے۔موئے سونگ کی بات تمہاری عقل میں آ گئی

دادی ماں۔۔۔سونگ نہیں ژونگ۔۔۔!

جو بھی نام ہے اس کی باتیں تمہارے دل کو بڑی لگتی ہیں

کہانی بار بار کٹ رہی تھی شہر کے اس گنجان آباد علاقے کی بجلی کی طرح جہاں تاروں کا الجھاؤ مسئلہ پیدا کرتا ہے۔

فیصلہ کیا گیا اب جو بھی دخل اندازی کرے گا اسے نکال باہر کیا جائے گا۔

مونگ پھلی کے بعد اب چلغوزے ان کی زد میں تھے

چائے کی بھاپ سے کہانی اٹھی

میں کہہ رہی تھی۔۔۔شاہ بہرام کی ضد کے سامنے حسن بانو نے ہتھیار ڈال دیے اور ایک لائحۂ عمل طے کیا کہ دیو سفید کا سامنا کیسے کرنا ہے۔۔۔!

آندھی آئی۔۔۔اس میں سے دیو سفید برآمد ہوا

اس نے دیکھا شاہ بہرام بے ہوش ہے تو اس کے اپنے ہوش اڑ گئے

وہ اس کے ارد گرد گھومنے لگا

بول۔۔۔بول میرے دوست۔۔۔تجھے ہوا کیا ہے۔۔۔؟ کس غم نے تجھے آلیا ہے۔۔۔بول میں تیرے لیے کیا کروں۔۔۔؟ تو تو میرا دوست ہے۔۔۔!

بڑی دیر بعد شاہ بہرام نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔۔۔اور دھیرے سے کہا

حسن بانو۔۔۔!

حسن بانو کا نام سن کر دیو سفید چکرایا' دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا

ایکسیلنٹ۔۔۔گویا اس پر MOB گرا۔بہترین موقع تھا شاہ بہرام اور حسن بانو کے پاس انتقام لینے کا افسوس عاقبت نااندیشوں نے گنوادیا۔

دادی ماں نے الائچی منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔۔۔اب بولے تو تھپڑ بھی لگے گا

ہاں دادی ماں۔۔۔بولنے والوں کو تھپڑ لگنے چاہئیں

یہ کہانی ادھوری رہے گی

جن کہانیوں پر مسلسل بمباری کا عمل جاری ہو وہ کیسے مکمل ہو سکتی ہیں۔۔۔؟

تم اپنی رائے زنی کی بمباری بند کرو

بچوں کی ماں نے سب کو چپ کرایا۔۔۔

اب اٹھو۔۔۔سارے۔۔۔وضو کر کے عشاء کی نماز ادا کرو پھر کہانی۔۔۔!

دادی ماں اس دن تو آپ نے کہا تھا عشاء کی نماز کا وقت صبح صادق تک ہوتا ہے

آج اول وقت میں پڑھ لو اس کا اپنا الگ ثواب ہے۔کہانی ختم ہوئی تو تم سب بستروں میں جا سر دو گے

دیو سفید چکرایا' دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا

اب شاہ بہرام اور حسن بانو کے سر بن آئی کہ یہ کیا ہو گیا۔۔۔؟

سو طریقے آزمائے تب کہیں جا کر دیو سفید کو ہوش آیا

اس کا رنگ زرد تھا

نڈھال لہجے میں دیو سفید نے یہ اعتراف کیا کہ حسن بانو کی تلاش اور تمہاری اس خواہش کی تکمیل میرے بس کا روگ نہیں۔یہ سارے جال میں نے اسے پھانسنے کو بچھائے ہیں۔لیکن وہ زیرِ دام نہیں آئی۔

حسن بانو دہشت گرد ہے اس لیے ہاتھ نہیں آ رہی۔دیو سفید بیچارے کو اپنا جان کا خطرہ ہے

بہت ہو گئی۔۔۔

کہانی ختم۔۔۔!

گریٹ دادی ماں۔۔۔گریٹ دادی ماں۔۔۔ویری سوری۔۔۔اب پکا وعدہ۔۔۔ہم مسلمان حکمرانوں کی طرح با لکل نہیں بولیں گے۔۔۔آپ کہانی مکمل کریں

حسن بانو زیرِ دام آ گئی ہے۔۔۔شاہ بہرام نے کہا

کیسے۔۔۔؟

دیو نے ساری کتھا سنی اور شاہ بہرام کا اس سے نکاح کر دیا

زندگی پھر جنت ہو گئی

ایک دن حسن بانو نے دیکھا کہ شاہ بہرام کا چہرہ اترا ہوا ہے اور وہ اداس ہے

تم اداس کیوں ہو۔۔۔؟

وطن کی یاد ستا رہی ہے۔بیوی بچے یاد آ رہے ہیں۔عوام کا درد بے چین کر رہا ہے۔میرے بعد وہ لٹیرے وزراء کے رحم و کرم پر ہوں گے۔جانے وہاں زندگی کن عذابوں سے گزر رہی ہو گی

دیو سفید کے سامنے درخواست رکھی گئی

اے باشاہوں کے بادشاہ۔۔۔ہمیں وطن لوٹنے کی اجازت دی جائے

ایک عرصہ غور و خوض میں گزر گیا۔حسن بانو کی ضد تھی کہ پہلے شہرِ پرستان جایا جائے۔وہاں سے پھر شاہ بہرام کی سلطنت کی طرف رختِ سفر باندھا جائے۔پریشانی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کسی کو بھی پرستان کا

رستہ معلوم نہ تھا۔ اپنی تمام تر طاقت کے باوجود دیوسفید بھی اس شہر کی تلاش میں ناکام رہا تھا۔ حالاں کہ وہاں کے خزینوں کے قصے سن سن کر وہ ہمیشہ چڑھائی کے منصوبے ترتیب دیتا رہتا تھا۔

دیوسفید نے اپنے چاروں بھائیوں کو مدعو کیا

دیوسفید کے کہنے پر پانچوں بھائی سر جوڑ بیٹھے۔ ان میں دیو زرد گرد' دیو جرموس' دیو فرموس اور دیو روپرس شامل تھے۔ سب سے کہا گیا کہ وہ اپنی سلطنت میں ڈھنڈورچی سے اعلان کا کہیں کہ کہیں کوئی ایسا شخص ہو جسے شہرِ پرستان کا رستہ معلوم ہو۔۔۔

ڈھنڈورچیوں نے گلی گلی صدا لگائی

ایک ضعیف العمر دانشور نے عندیہ دیا کہ اسے رستہ معلوم ہے لیکن پہلے اسے شاہ بہرام کی زیارت کرائی جائے۔ کیوں کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک نجات دہندہ آئے گا۔ دانشور اتنا ضعیف تھا کہ پلکیں لٹک کر بینائی میں حائل تھیں۔ اس بوڑھے دانشور' دیو کی پلکیں کھولنے کے لیے بڑے بڑے درخت گرا کر شہتیر بنائے گئے۔ پلکوں کے نیچے شہتیر لگا کر انہیں اوپر اٹھایا گیا۔ بینائی کچھ بحال ہوئی اس نے شاہ بہرام کی زیارت کی اور کہا

شہرِ فارس کی مغربی سمت ایک کالا پہاڑ ہے اس میں ایک سرنگ رستہ بناتی ہے۔ سرنگ کا سفر تاریک اور تھکا دینے والا ہے۔ میں شاہ بہرام کو ایک چراغ دوں گا۔ جس سے نہ صرف تاریکی چھٹ جائے گی بلکہ ہر قدم اور ہر مشکل گھڑی میں وہ شاہ بہرام کے کام آئے گا۔

پانچوں دیو دانشور کی باتیں انہماک سے سن رہے تھے

بچے اونگھنے لگے تھے

شاید انہیں نیند نے آلیا تھا۔۔۔؟

کیا وہ جاگ رہے تھے۔۔؟

یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔۔۔

کیوں کہ دادی ماں کے ہاتھ میں جو تسبیح تھی اس کا تاگہ ٹوٹ گیا تھا اور دانے گود میں بکھر گئے تھے

بہو نے کہا۔۔۔ ماں جی۔۔۔ بچے سو گئے ہیں انہیں مت جگائیں

لیکن بہو کیوں۔۔۔؟

جاگ بھی گئے تو کون سے ان کے بھاگ جاگ جائیں گے۔ جاگنے پر بھی انہوں نے اودھم مچانا ہے

پانچوں دیوٗ دانشور کی باتیں انہماک سے سن رہے تھے

اور دادی ماں کے ہاتھ میں جو تسبیح تھی اس کا تاگہ ٹوٹ گیا تھا اور دانے گود میں بکھر گئے تھے۔۔۔!

☆☆☆

افریقی افسانہ (Original Story: " **LEAVING**" by M. G. Vessanji)

اردو ترجمہ: **خورشید اقبال** (۲۴ پرگنہ، مغربی بنگال)

اُڑان

کِشو یلے اسٹریٹ کا نام اب اُوہُورُو اسٹریٹ ہوگیا تھا۔ میری دونوں بہنیں اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شادی کر کے اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں اور میری ماں اکثر انہیں یاد کر کے اداس ہو جایا کرتی تھی۔ مہرُن نے شادی کے کئی خواہش مندوں میں سے آخر کار ہمارے اسکول کی کرکٹ ٹیم کے سابق سلامی بلّے باز کو چن لیا تھا اور اب وہ اس کے ساتھ اسی شہر میں رہتی تھی جبکہ رضیہ دارالسّلام کے شمالی ساحلی قصبے ٹانگا کی ایک متمول خاتون خانہ تھی۔ میرے بھائی فیروز نے اپنے آخری تعلیمی سال میں اسکول کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کا اتنا پڑھ لینا ہی کچھ کم حیرت کی بات نہیں۔ اور اب وہ 'اورینٹل امپوریم' میں منشی تھا جہاں سے وہ کبھی کبھی اسٹیشنری کی چیزیں چرا کر گھر لے آیا کرتا تھا۔

ماں نے اپنی ساری امیدیں ہم دونوں چھوٹے بیٹوں یعنی مجھ سے اور اَلو سے لگا رکھی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہم اسٹور کے کاموں میں الجھ کر تعلیم سے اپنی توجہ ہٹائیں۔ اس لئے اس نے ایک شام آخری بار اسٹور کے مضبوط چوبی تختوں والے دروازوں پر نصف درجن تالے لگائے اور اسٹور کو فروخت کر دیا۔ یہ رضیہ کی شادی کے ٹھیک ایک ہفتے بعد کا واقعہ ہے۔ رضیہ پُر اشک آنکھوں کے ساتھ رخصت ہو چکی تھی اور اپنے پیچھے اُوہُورُو اسٹریٹ کے چکر کھاتے غبار کے درمیان کھڑی پریشان حال ماں کو چھوڑ گئی تھی۔

پھر ہم لوگ اُپانگا کے رہائشی علاقے میں منتقل ہو گئے۔ اُوہُورُو اسٹریٹ کی ہماہمی کے مقابلے یہاں کا ماحول بے حد پرسکون تھا۔ سڑک پر بسوں، سائیکلوں اور کاروں کے شور کی بجائے ہم اب مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ اور جھینگروں کی آوازیں سنا کرتے تھے۔ راتیں ڈراؤنی، سنسان اور ویران ہوا کرتی تھیں جن کی عادت ڈالنے میں ہمیں ایک عرصہ لگا تھا۔ اوپانگا روڈ شام کے سات بجتے ہی سنسان ہو جایا کرتا تھا اور بغلی گلیاں تاریکی میں ڈوب جاتی تھیں کیونکہ روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ زیادہ تر علاقہ اب تک غیر آباد تھا اور جہاں تک مکانات بن چکے تھے اسکے بعد کا پورا علاقہ گھنی جھاڑیوں، دیو پیکر اور ہیبت ناک 'باؤباب' کے درختوں اور آموں اور ناریل کے جھنڈ سے بھرا پڑا تھا۔

کبھی کبھی شام کو جب ماں بہت اداس ہوتی تھی تو اَلو اور میں ماں کے ساتھ دو۔ تین۔ پانچ کھیلتے تھے

جوتاش کی، تین لوگوں کے درمیان کھیلی جانے والی ایک قسم ہے۔ میں اب یونیورسٹی میں داخل ہو چکا تھا اور اکثر سنیچر کو ہی گھر آیا کرتا تھا۔ اَلو اسکول میں اپنے آخری سال میں تھا۔ وہ پڑھائی میں بے حد تیز تھا...ہماری امیدوں سے کہیں زیادہ۔ اسی سال مسٹر داتو، ہمارے اسکول کے ایک سابق ٹیچر، جو اسی اسکول کے طالب علم بھی رہ چکے تھے، امریکہ سے چند دنوں کے لئے لوٹے۔ مسٹر داتو طلبا میں کافی مقبول تھے۔ وطن واپسی پر انہیں ایک زبر دست استقبالیہ دیا گیا۔ اس کے بعد کے چند دن انہوں نے کسی مقبول رہنما کی طرح پورے قصبے کا دورہ کیا۔ وہ جہاں جاتے ان کے پیچھے ان کے مداح طلبا کا ایک جم غفیر بھی ساتھ ہوتا۔ انہیں میں سے ایک اَلو بھی تھا۔

اس پر جوش واقعے نے اَلو کے دل میں بھی امیدوں کے چراغ روشن کر دئے تھے کہ اسے بھی کسی امریکن یونیورسٹی میں نہ صرف داخلہ مل سکتا ہے بلکہ اسے جانے کے لئے اسکالرشپ بھی مل سکتی ہے۔ باقی پورے سال کے دوران اس نے بے شمار یونیورسیٹیوں کو خطوط لکھے جن کے نام اس نے USIS میں موجود کتابوں سے حاصل کئے تھے۔ یونیورسیٹیوں کے ناموں کا انتخاب وہ اکثر یونہی بلا سوچے سمجھے یا پھر ناموں کے صوتی آہنگ کی بنیاد پر کیا کرتا تھا۔ ماں اس کی ان کاوشوں کو ہنسی میں اڑا دیتی تھی۔ وہ اکثر مسکرا کر کہتی ''وہاں امریکہ میں تمہارے ماموں بیٹھے ہیں جو تمہیں کالج میں داخلہ دلانے کے لئے ہزاروں شیلنگ ادا کریں گے؟'' اسکی نظر میں یہ سب تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں تھا اور اَلو بیچارہ اس سے کبھی یہ نہیں کہہ پاتا تھا کہ اسے جو مدد ماں سے مل سکتی ہے وہ کسی اور سے کبھی نہیں مل پائے گی۔

چند ہفتوں میں ہی اس کی اس خط و کتابت کے نتائج ظاہر ہونے لگے جن میں سے زیادہ تر امید افزا تھے۔ آہستہ آہستہ اَلو کو پتہ چلنے لگا کہ ان میں سے بہتر جگہیں کون سی ہیں اور ان میں سے کون صحیح معنوں میں اہم اور مشہور ہیں۔ جلد ہی چند مختلف یونیورسیٹیوں کے معلوماتی کتابچے بھی موصول ہوئے جو کافی دل کش تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ خط و کتابت میں جتنا زیادہ محنت کر رہا تھا، کسی امریکن یونیورسٹی میں اس کے داخلے کے امکانات اتنے ہی روشن ہوتے جا رہے تھے، یہاں تک کہ مشہور ترین یونیورسیٹیوں سے بھی اسے مایوس نہیں ہونا پڑ رہا تھا۔ اب اسے ان مضامین کے بارے میں پتہ چل رہا تھا جن کے بارے میں اس نے پہلے کبھی سنا تک نہیں تھا : جینیٹکس، کاسمولوجی، آرٹی فیشیل انٹیلیجنس : ایک بالکل ہی نئی کائنات وہاں اس کی منتظر تھی......شرط بس اتنی تھی کہ وہ ایک بار کسی طرح وہاں تک پہونچ جائے۔ لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ وہ وہاں تک کبھی پہونچ سکے گا۔ پتہ نہیں وہ اس قابل تھا بھی یا نہیں۔ اس کا وجود امید اور نا امیدی کے درمیان جھولتا رہتا تھا۔

بے شک اَلو مقامی یونیورسٹی میں جگہ پانے کے قابل تھا۔ سال کے آخر میں جب اخبارات میں منتخب امیدواروں کے نام شائع ہوئے تو اس کا بھی نام اس میں شامل تھا۔ لیکن شاید کسی بد قماش افسر نے، جو شاید رشوت خور بھی تھا، اس کی قسمت کا ایسا فیصلہ کیا تھا جو اس کے لئے ایک صدمے سے کم نہیں تھا۔ اس نے میڈیسن میں

داخلے کے لئے درخواست دی تھی لیکن اسے ایگری کلچر میں جگہ دی گئی تھی۔ وطن پرستی اپنی جگہ لیکن کسی دیہات میں ایگری کلچرل آفیسر کے طور پر کام کرنا اس کی زندگی کا مقصد نہیں تھا۔ وہ کبھی شہر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ صرف ایک بار اسکول کی جانب سے جنگل کی سیر کرنے گیا تھا......بس!

جب اَلو کو کیلیفورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کی جانب سے ایک خط ملا جس میں اسے داخلے اور اسکالرشپ کی پیش کش کی گئی تھی تو وہ بالکل ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے خط کو بار بار پڑھا۔ اس میں جو کچھ درج تھا اس پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کہیں اس نے پڑھنے میں کوئی غلطی نہ کی ہو۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں وہ خط پڑھ کر اسے سناؤں۔ اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہے تو وہ خوشی سے جیسے پاگل ہو اٹھا۔

''جہنم میں گیا ایگری کلچر'' اس نے زہر خند کے ساتھ کہا۔

لیکن اسے سب سے پہلے ماں کو رام کرنا تھا۔

ماں کو اس کی بات پر یقین ہی نہیں آیا۔ ''جاؤ...جاؤ! .....میرا دماغ مت چاٹو....مجھے تنگ مت کرو''

''لیکن یہ سچ ہے'' اَلو نے احتجاج کیا ''وہ لوگ مجھے اسکالرشپ دے رہے ہیں''

ہم لوگ میز پر تھے....ہم تینوں .....اور تھرماس سے ابھی ابھی چائے انڈیلی گئی تھی۔ ماں میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی طشتری پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''کیا یہ سچ ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں یہ سچ ہے'' میں نے کہا ''بس اسے اپنے ساتھ صرف ۴۰۰ ڈالر جیب خرچ کے طور پر لے جانے ہیں۔''

''یہ کتنے شیلنگ کے برابر ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''تقریباً تین ہزار''

''اور ہم لوگ یہ تین ہزار شیلنگ کس طرح پیدا کریں گے؟......کیا تمہاری لاٹری لگی ہے؟....اور ٹکٹ کا کیا ہوگا؟.....کیا وہ لوگ ہمیں ٹکٹ بھی بھیج رہے ہیں؟''

اس نے جیسے ہی یہ کہا اَلو کو اپنے سارے منصوبے خاک میں ملتے دکھائی دینے لگے۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ اَلو کو جتنے روپیوں کی ضرورت تھی وہ ہمارے لئے ایک خطیر رقم تھی۔

''کیا ہم قرض نہیں لے سکتے؟'' اس نے پوچھا ''میں وہاں کام بھی کروں گا.... ہاں میں وہاں ویٹر کا کام کروں گا......ایک ویٹر کا.........میں جانتا ہوں تم پیسوں کا انتظام کر سکتی ہو ماں.......میں پیسے واپس بھیج دوں گا''۔

''امریکہ میں تمہارے ماموں ہو سکتے ہیں جو تمہاری مدد کریں گے'' ماں نے اس سے کہا ''لیکن یہاں کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا''۔

اَلو کے کندھے جھک گئے اور وہ وہاں بیٹھا اپنے کپ کو گھما تا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بھی پل رو پڑے گا۔ ماں بیٹھی اپنی طشتری میں چائے انڈیل کر پیتی رہی۔ اس کی پیشانی شکن آلود تھی۔ میری پشت کی جانب واقع کھڑکی سے شام کی روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی، جس میں اس کا چشمہ چمک رہا تھا۔ آخر کار اس نے اپنی طشتری میز پر رکھ دی۔ وہ غصے میں تھی۔

''اور آخر ہم سے اتنی دور وہاں جانا ہی کیوں چاہتے ہو؟ کیا میں نے تمہیں اسی دن کے لئے پال پوس کر بڑا کیا تھا کہ تم مجھے چھوڑ کر دور دیس چلے جاؤ؟ جہاں تم جانا چاہتے ہو کیا وہاں تمہیں ہماری یاد نہیں آئے گی؟ کیا ہم تمہارے لئے اتنے غیر اہم ہو گئے ہیں؟ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو.........''

اَلو رو رہا تھا۔ اس کی کپ میں آنسو کا ایک قطرہ گرا، اس کی ناک بھی بہہ رہی تھی۔ ''کتنے ہی بچے جاتے ہیں اور واپس آ جاتے ہیں...انہیں کچھ بھی نہیں ہوتا.......اگر یہی کرنا تھا تو پھر مجھے پہلے ہی کیوں نہیں روک دیا؟........ جب مجھے جانے نہیں دینا چاہتی تھیں تو پھر مجھے درخواستیں بھیجنے سے کیوں نہیں روکا؟.....اگر میری امیدوں کو یوں چکنا چور ہی کرنا تھا تو پھر انہیں پروان کیوں چڑھنے دیا؟'' وہ بہت تیز آواز میں بولے جا رہا تھا....میں نے پہلی بار اسے ایسا کرتے دیکھا تھا۔ جذبات کی شدت سے وہ کانپ رہا تھا۔

پھر اس دن کے بعد اس نے یہ سوال پھر کبھی نہیں اٹھایا۔ اس نے ایگری کلچر کالج میں داخلے کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا اور کلاسز شروع ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ گھر پر وہ صوفے پر پڑا ناول پڑھتا رہتا......روزانہ ایک ناول! اگر وزارت تعلیم کے اس نامعلوم افسر نے اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کی ہوتی تو اَلو کو اتنا غم نہیں ہوتا اور ماں کو مجبور ہو کر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔

چند دنوں کے بعد، اتوار کی صبح کو، ماں نے اپنی سلائی مشین سے نظریں اٹھائیں اور ہم دونوں سے مخاطب ہوئی ''ہم لوگوں کو چل کر یہ خط مسٹر ویلیجی کو دکھانا چاہئے۔ وہ ان معاملات کے ماہر ہیں، ہمیں ان سے مشورہ کرنا چاہئے''

مسٹر ویلیجی ہمارے اسکول کے سابق ایڈمنسٹریٹر تھے۔ ان کا سر کافی بڑا، انڈے جیسا اور جسم چھوٹا اور گٹھا ہوا تھا۔ اپنی چوڑی پیشانی اور سیاہ چشمے کے ساتھ وہ کسی روایتی دانشور کی مضحک تصویر نظر آتے تھے۔ ہم تینوں ان کے نشست کے کمرے میں کرسیوں پر بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور انتظار کر رہے تھے تبھی وہ اکڑے ہوئے سے، کسی کھلونے سپاہی کی طرح چلتے ہوئے، کمرے میں داخل ہوئے اور ہمیں خوش آمدید کہا۔

''تم کیسی ہو بہن؟'' انہوں نے کہا ''میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟''

ان کے بیٹھنے تک اَلو اور میں ادب سے کھڑے رہے۔

''ہم آپ کے پاس مشورے کے لئے آئے ہیں'' ماں نے کہنا شروع کیا۔

''ٹھیک ہے....بولو'' انہوں نے اطمنان سے بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو اپنے سر کے پیچھے باندھتے ہوئے کہا۔

ماں نے انہیں اپنے بارے میں بتایا کہ وہ کس خاندان میں پیدا ہوئی، کس خاندان میں اس کی شادی ہوئی، میرے والد کے مرنے کے بعد اس نے کیسے اپنے بچوں کی پرورش کی۔ اس نے تو ہمارے خاندانوں کے درمیان مشترکہ رشتے بھی تلاش کر لئے۔ ''اب یہ ......'' ماں نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''یونیورسٹی میں پڑھتا ہے یہ لڑکا....امریکہ جانا چاہتا ہے ....اپنے کاغذات انہیں دکھاؤ'' ماں نے اَلو کو حکم دیا۔

یوں لگا جیسے اَلو نے بڑی مشکلوں سے خود کو صوفے سے اٹھایا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر کاغذات مسٹر ویلیجی کے ہاتھوں میں دے دیئے۔ کاغذات دیکھنے سے قبل مسٹر ویلیجی نے اَلو سے اس کے فائنل امتحان کے رزلٹ کے بارے میں پوچھا۔

اَلو کے جواب سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں ''ہیں؟...'' انہوں نے کہا ''سارے کے سارے A گریڈ؟''

''جی ہاں'' اَلو نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

مسٹر ویلیجی نے پہلے پہل یوں ہی بے دلی کے ساتھ ایک کے بعد ایک کاغذات پلٹے۔ لیکن پھر وہ انہیں نہایت توجہ سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے طویل ویزا فارم کو دیکھا جس میں ایک اصل فارم کے نیچے کئی کاربن کاپیاں سلیقے سے پِن کی ہوئی تھیں۔ انہوں نے فارن سٹوڈنٹ ایڈوائزر کا دوستانہ انداز میں لکھا خط پڑھا۔ انڈر گریجویٹ کلب کے ممبران کے دعوتی خطوط پڑھ کر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ آخر کار انہوں نے منکسرانہ انداز میں سر اٹھایا۔

''یہ لڑکا ٹھیک کہتا ہے'' وہ بولے ''یونیورسٹی اچھی ہے اور وہ لوگ اسے وظیفہ بھی دے رہے ہیں۔ میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں''۔

''لیکن اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟'' ماں نے پریشانی کے ساتھ پوچھا ''آپ کا کیا مشورہ ہے؟ ہمیں بتائیے کہ ہم کیا کریں۔''

''ٹھیک ہے'' مسٹر ویلجی بولے ''یہ اس کی تعلیم کے لئے بہتر ہوگا'' انہوں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر گلا صاف کیا اور پھر دھیرے سے بولے ''لیکن تم اگر اسے جانے دو گی تو اپنے بیٹے کو کھو دو گی''۔

''وہ بہت دور دیس ہے۔۔۔ امریکہ'' انہوں نے بات کو گویا ختم کرتے ہوئے پوچھا ''اب بتاؤ تم کیا لوگی؟۔۔۔چائے؟۔۔۔نارنگی کا جوس؟''

اور آرڈر لینے کے لئے ان کی بیوی کسی جن کی طرح اچانک نمودار ہو گئی۔

''تمام امیر لڑکے ہر سال جاتے ہیں اور وہ نہیں کھوتے'' گھر لوٹتے ہوئے اَلو تلخ لہجے میں بدبدایا۔

ماں خاموش رہی۔

اس رات وہ سلائی مشین پر تھی اور اَلو صوفے پر لیٹا پڑھ رہا تھا۔ ریڈیو دھیمی آواز میں بج رہا تھا اور سامنے کے کھلے دروازے سے ہوا کے خوشگوار جھونکے آ کر سٹنگ روم کے ماحول کو سرد کر رہے تھے۔ میں دروازے پر کھڑا تھا۔ باہر کیلے کے درخت ہوا میں لہرا رہے تھے۔ سڑک پر ایک کار تیزی سے گزرتے ہوئے پڑوس کے مکانات پر پرچھائیاں ڈال رہی تھی۔ ایک جوڑا جو شاید سیر کو نکلا تھا، آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے ناہموار باڑھ کے پاس سے گزر رہا تھا۔ لڑکے لڑکیوں کے جھنڈ اپنے اپنے مکانوں کو لوٹنے سے قبل گپیں مار رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ماں کی سلائی مشین میں لگے ہوئے موٹر کی گھر گھراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ کمرے میں وہ ہم سے دور دوسرے کونے میں بیٹھی تھی جہاں اندھیرا کچھ زیادہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد، اس نے ہماری طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولی ’’ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ یہ یونیورسٹی آخر ہے کیسی۔۔۔۔وہ کتاب لاؤ۔۔۔لاؤ گے؟‘‘

ماں نے یونیورسٹی کا معلوماتی کتابچہ کبھی نہیں دیکھا تھا اور ہمیشہ اسے نظر انداز کیا تھا۔ اس نے اس مقام کے بارے میں جاننے کی کبھی ہلکی سی بھی خواہش ظاہر نہیں کی تھی جہاں جانے کے لئے اَلو اس قدر بے قرار تھا۔

اب ہم تینوں کتابچے کے چمکدار صفحات پر جھکے جدید کلاسکی انداز کی عمارتوں، گنبدوں اور انسانوں سے کئی گنا بلند ستونوں کی تصاویر دیکھ رہے تھے۔ طلبا و طالبات مختلف قسم کے کاموں میں مصروف تھے۔ وسیع لانوں میں گھنے سایوں کے نیچے کلاسز ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ حیرت انگیز بھی تھا اور دلفریب بھی۔

’’غضب کی جگہ ہے۔۔ہے نا؟‘‘ اَلو نے دھیرے سے کہا۔ وہ اپنا جوش چھپا نہیں پا رہا تھا ’’وہاں سیکڑوں طرح کے کورسز کرائے جاتے ہیں۔۔وہ لوگ خلا میں راکٹ بھیج رہے ہیں۔۔دوسری دنیاؤں میں۔۔چاند پر‘‘

’’میرے بیٹے! اگر تم چاند پر چلے گئے تو میرا کیا ہوگا؟‘‘ ماں نے بڑی خوش مزاجی سے کہا۔ وہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اَلو واپس اپنی کتاب لے کر بیٹھ گیا اور ماں پھر سے سلائی کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور جیسا کہ وہ عموماً ایسے موقعوں پر کیا کرتی تھی، وہ بے خیالی میں اپنی تھوڑی کو کھجا رہی تھی۔ شاید میں پہلی بار اسے ہماری ماں کی بجائے ایک عورت کے طور پر دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ اسوقت اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ وہ ہماری پرورش و پرداخت کے لئے کتنی مشکلات سے گزری تھی۔ جب ہمارے والد کا انتقال ہوا وہ صرف ۳۳ سال کی تھی۔ لیکن اس نے شادی کے لئے آنے والی کئی درخواستوں کو ٹھکرا دیا تھا کیوں کہ شادی کی صورت میں ہمیں یتیم خانے بھیجنا پڑتا۔ والد کے انتقال سے قبل کی تصویروں میں ماں بے حد خوبصورت اور مسرور دکھائی دیتی تھی۔ وہ صحت مند تو تھی لیکن اسے موٹی بالکل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بال فیشن ایبل انداز میں سنوارے ہوئے ہوتے تھے۔ پیروں میں اونچی ایڑی کے سینڈل اور چہرے پر میک اپ بھی نظر آتا تھا۔ ان میں سے ایک تصویر، جو کسی اسٹوڈیو میں لی گئی تھی

اور اسے ٹچ اپ کر کے نکھارا بھی گیا تھا، اب والد کی تصویر کی بغل میں لٹکی ہوئی تھی۔ اس تصویر میں وہ سیاہ پس منظر کے سامنے، بڑی ادا سے ایک کتاب ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ نائیلون کے لباس کو ہلکے سبز رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا جس کا گھیرا بڑے پروقار انداز میں نیچے تک پھیلا ہوا تھا اور کناروں پر سکے نما زیورات ٹنکے ہوئے تھے۔ میں نے اسے اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے تو میں نے ہمیشہ کھردرے چہرے کے ساتھ دیکھا تھا جو عمر کے ساتھ ساتھ مزید کھردرا ہوتا چلا گیا کیونکہ جھریوں کی لکیریں مستقل ہوتی چلی گئیں۔ بال کم ہو گئے تھے، جسم موٹا ہو گیا تھا اور آواز بھی بھاری ہو گئی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ بچپن میں اَلو اور میں کیسے رات میں اس کے بڑے بستر پر اس کے ساتھ سونے کے لئے اپنی اپنی باریوں کا انتظار کرتے تھے؛ کیسے وہ مجھے اپنے گداز بازؤں میں سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیتی تھی یہاں تک کہ مجھے سانس لینے میں دشواری ہونے لگتی تھی اور میں سوچتا تھا کہ وہ مجھے جلد چھوڑ دے تا کہ میں سانس لے سکوں۔

اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا اور بولی۔۔۔۔مجھ سے نہیں، اَلو سے۔۔۔۔’’وعدہ کرو۔۔۔وعدہ کرو کہ اگر میں تمہیں وہاں جانے دوں گی تو تم کسی سفید فام عورت سے شادی نہیں کرو گے۔‘‘

’’اوہ! ماں!۔۔۔تم جانتی ہو کہ میں ایسا نہیں کروں گا‘‘ اَلو نے کہا۔

’’اور وعدہ کرو کہ تم سگریٹ اور شراب نہیں پیو گے‘‘

’’تمہیں پتہ ہے۔۔۔میں وعدہ کرتا ہوں‘‘ وہ روہانسا ہو کر بولا۔

●

اَلو کا پہلا خط اس کے جانے کے ایک ہفتے بعد لندن سے آیا۔ یہاں وہ اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے کے لئے رکا تھا۔ اس خط میں جذبات کا ایک سیلاب بند تھا۔

’’میں کیسے بیان کروں‘‘ اس نے لکھا تھا ’’ہوائی جہاز سے نظر آنے والا منظر۔۔۔میلوں میل تک پھیلے سلیقے سے سجے کھیت۔۔۔جیسے زمین کو خوبصورت سبز مربعوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔۔۔۔یہاں تک کہ پہاڑ بھی صاف اور مہذب۔ اور لندن۔۔۔۔اوہ لندن۔۔۔۔ایسا لگتا ہے جیسے اس شہر کا کوئی آخری سرا ہے ہی نہیں۔۔۔مکانات کے ان گنت بلاک، چوراہے، پارک، یادگاریں۔۔۔۔کیا کوئی شہر اس سے بھی بڑا ہو سکتا ہے۔۔۔اس ایک بڑے شہر میں ہمارے شہر دارالسلام جیسے کتنے ہی شہر سما جائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘

●

ایک پرندہ اپنے پروں کو پھڑپھڑا رہا تھا۔۔۔۔۔ مسٹر ویلجی اپنی کرسی پر بیٹھے دانش مندانہ انداز میں سر ہلا رہے تھے۔۔۔۔۔۔ اور ماں کی آنکھیں دور کہیں تک رہی تھیں۔

جان عالم (مانسہرہ)

دف، درانتی اور شانو

دف اُس کے اٹھے ہوئے بائیں شانے اور ٹھوڑی کو ہاتھ بنا کر اُس کے دائیں ہاتھ کی تھاپ پر ناچ رہا تھا۔اُس کی آنکھیں شانو کی آنکھوں میں پیوست تھیں۔اور شانو اُس کی آنکھوں کے پار کسی باغ میں پھولوں کا بستر لگائے پتی پتی ہو رہی تھی۔

وہ اکثر کہا کرتی ''بالے! اپنا دایاں ہاتھ مجھے دے دے.......تُو جا۔تیرے جیسے بہت ہیں گاؤں میں ۔پر تیرے جیسا ہاتھ نہیں ہے کسی کا۔میں تیرے بچوں کی ماں بنی تو بھی تجھ سے دف سنا کروں گی اور جب دادی بن گئی تب بھی مجھے سنانا۔ بالے تیرے جیسے بہت ہیں۔پر تیرے جیسا ہاتھ نہیں ہے کسی کا۔وہ سلطان ....مجھ پہ مرتا ہے......اور تیرا دشمن بنا ہوا ہے......مگر میں تجھ پہ مرتی ہوں۔اب تُو میری قدر نہ کر تو یہ تیری قسمت۔''

بالے کی ساری خوبصورتی اُس کے دائیں ہاتھ میں تھی۔اُس کا دف شانو کی روح کو رقص کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔شانو گاؤں کی ایک شوخ سی لڑکی تھی۔بچپنا اُس کی جوانی میں بھی اُس کے ساتھ ہی رہا۔وہ اچانک بچپن سے بڑھاپے میں بھی چھلانگ لگا دیتی۔نجانے اُس کو اتنی سمجھداری کی باتیں کون سکھا گیا تھا۔بالے کو کبھی کبھی تو بہت حیرت ہوتی جب شانو اچانک اُس سے اتنی بڑی بات کہہ دیتی کہ بالے کو چوپال کے بوڑھے بھی چھوٹے نظر آنے لگتے۔

سلطان چودھری کے کاردار کا بیٹا تھا۔وہ شانو پہ مرتا تھا اور اسی لئے وہ بالے سے شانو کی محبت بھی گوارہ نہ کرتا تھا۔لیکن شانو کی محبت پر اُس کا زور نہ چلتا۔گاؤں میں یہ خبر بھی پھیلی تھی کہ شانو بالے کو مروا دے گی۔لیکن بالے کو نہ گاؤں والوں کی پرواہ تھی نہ سلطان کا خوف۔وہ شانو کی محبت اور دف کی تھاپ سے باہر کبھی نکلا ہی نہیں۔

''چل !تُیرے جیسی گاؤں کی سو لڑکیاں میری دف پر ناچتی ہیں۔میرا احسان مان کہ میں نے صرف تجھے اپنا دایاں ہاتھ دیا ہے۔'' وہ اُس کی آنکھوں سے نکل آئی؛

''چل چل!'' تُو ہے ہی ناقدرا۔میں گئی۔''

''ٹھہر شانو!'' بالے نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔دف اداس ہو گیا۔

''بالے!'' وہ اچانک بوڑھی ہو گئی۔اُس کے چہرے پر سالوں کا تجربہ اور دانشمندی چھا گئی۔

''فصل کی کٹائی کا دن آ گیا ہے۔سارا گاؤں چودھری کے کھیت میں ہو گا۔تجھے پتا ہے کہ فصل کاٹنے میں جو جیتے گا چودھری اُس کو انعام بھی دیتا ہے اور گاؤں میں اُس کی عزت بھی ہوتی ہے۔''

''ہاں شانو! میں فصل کٹائی میں سب سے جیتوں گا۔بس تُو میرے سامنے رہنا۔''

''بالے! سلطان کا ہاتھ درانتی پر تمہارے دف سے زیادہ تیز چلتا ہے۔اور کٹائی میں دو ہاتھوں کی تیزی چاہیے تیرا دف تو دائیں ہاتھ پر مجھے کاٹتا ہے۔فصل کاٹنا زندگی کاٹنا ہے۔میری عزت رکھنا بالے!''

وہ بڑھاپے سے اچانک اپنی عمر میں لوٹ آئی؛

''چل اٹھا اپنا دف اور بجا!'' وہ عرب کے کسی صحرا میں الاؤ کے گرد رقص کرتے قبیلے میں اتر گئے۔بالے کی آنکھیں اُس کی آنکھوں میں پیوست ہو گئیں اور وہ آنکھوں کے پار پھولوں کا بستر سجا کر پتی پتی ہونے لگی۔

....

کٹائی کا دن کسی ریس کے مقابلے کا دن سمجھا جاتا تھا۔گاؤں کے سب مرد ایک قطار میں بیٹھتے ....جب چودھری کا بندہ ہوائی فائر کرتا تو کٹائی شروع ہو جاتی۔ہر ایک نے اپنے سامنے سے فصل کاٹ کر آگے راستہ بنانا ہوتا۔جو کھیت کے دوسرے کنارے تک اپنا راستہ بنا کر پہلے پہنچتا وہ جیت جاتا۔

....

کھیت میں لہلہاتی فصل سمندر کی لہروں کی طرح تھی۔بڑے برگد تلے گاؤں موجود تھا۔چارپائی پہ چودھری اپنے خاص آدمیوں کے ساتھ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے حقے سے آگ کھینچ رہا تھا۔ڈھولک بجانے والے ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔اور دوسری طرف گاؤں کی عورتوں کی بھنبھناہٹ بیٹھی تھی۔کھیت کے آغاز میں چونے کی لکیر پر گاؤں کے ساٹھ ستر جوان اپنی درانتیوں کو ہاتھ میں تھامے سپاہیوں کی طرح سالارِ سپاہ کے حکم کے انتظار میں تھے۔بالے اور سلطان کی آنکھیں ایک دوسرے کو شانو کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔سلطان کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ میں بالے کو ہرانے کا عزم بھی تھا اور نفرت بھی۔وہ دونوں ساتھ ساتھ تھے۔

فائر.....................برگد سے چڑیاں فضا میں چھوڑے جانے والے غباروں کی طرح اُڑیں اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ایک ساتھ کئی ڈھولک جنگ کے نقاروں کی طرح بجنے لگے۔

برگد سے آنے والی آوازیں اور عورتوں کی بھنبھناہٹ اُن کے ہاتھوں میں تیزی بھر رہی تھی۔بالے نے فصل پر سولہ ماترے کا تھاپ شروع کر دیا۔وہ قطار سے دو ہاتھ آگے اپنا راستہ بنا چکا تھا۔سلطان نے جب شانو کی محبت میں بالے کو آگے نکلتے دیکھا تو وہ درانتی بن گیا۔اب وہ بالے کے شانے کے ساتھ شانہ ٹکرائے آگے بڑھ رہا تھا۔دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کو کاٹ رہی تھیں اور ہاتھ فصل کو۔

''بالے! آج مجھ سے فیصلہ کرلے.....!!'' سلطان نے بالے کو معنی خیز انداز میں کہا۔ دونوں کے ہاتھ درانتی پر تیز ہو گئے۔

''فیصلہ تو ہو چکا۔ تُو دونوں بازیاں ہار گیا۔''

''میں ہارنے والوں میں سے نہیں۔''

''تو لگا بازی.....!! جو جیتا وہ جیتا۔''

''تُو اُس کے لئے کیا کرسکتا ہے؟ میں اُسے تجھ سے زیادہ خوش رکھوں گا۔ تیرے پاس ہے کیا؟ دف سے پیٹ نہیں بھرتا۔'' سلطان نے اُسے طعنہ دیا۔

''میں اُس کے لئے جان دے سکتا ہوں۔'' بالے نے اپنی بازی لگا دی۔

''اور اگر میں بھی جان دے دوں تو.....؟'' سلطان کسی جواری کی طرح اپنے اعصاب پُرسکون رکھتے ہوئے بولا۔

''پھر میں کسی کی جان لے بھی سکتا ہوں۔'' بالے نے پوری قوت سے فصل پر درانتی چلائی اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بھی کاٹ دیا۔

سلطان مسکراتا ہوا اُس سے آگے بڑھ گیا۔ قطار بالے سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کھیت کے سمندر میں بالے کی کشتی اپنے بھنور میں پھنس گئی۔ دُور کھیت کے ساحل پر شانو نے ایکدم سے اپنے بچپن کو اُتارا اور بڑھاپا اوڑھ لیا۔

سلطان مقابلہ جیت چکا تھا۔ بالے کو چارپائی پر لٹایا گیا۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی چاروں انگلیاں اُس کی اپنی درانتی نے کاٹ دی تھیں۔ اُس کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ شانو بھی کھڑی تھی۔ لیکن وہ بولی نہیں۔

....

دف بالے کے اُٹھے ہوئے بائیں شانے اور ٹھوڑی کو ہاتھ بنا کر اُس کے دائیں ہاتھ کی تھاپ پر ناچ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں شانو کی آنکھوں میں پیوست تھیں۔ آج شانو اُس کی آنکھوں کے پار نہیں دیکھ رہی تھی۔ دف اداس ہو گیا۔

''شانو! کیا ہوا رے!'' تیرا ہاتھ'' تو سلامت ہے۔ دیکھ میں دف بجا رہا ہوں۔''

''بالے!! تُو دف تو اب بھی بجا سکتا ہے لیکن اب درانتی نہیں چلا سکتا۔ اور تجھے پتا ہے فصل کاٹنا زندگی کاٹنا ہے۔ زندگی کیسے کٹے گی۔''

وہ اٹھ کر چلی گئی۔ شانو کا بچپنا آج اُس کے ساتھ آیا ہی نہیں تھا۔

بالے نے اپنے اُٹھے ہوئے شانے اور اپنی ٹھوڑی کو بایاں ہاتھ بنایا اور اُس کا دایاں ہاتھ کوچ کا نقارہ بجانے لگا۔۔۔۔۔۔عرب کے کسی صحرا میں قافلے کی کوچ کا نقارہ۔ الاؤ بجھ چکا تھا۔ اور بالے کے پاس دف کی تھاپ پر ہوا رقص کر رہی تھی۔

☆☆☆

حیدر قریشی

اپنے وقت سے تھوڑا پہلے

خواہش تھی کہ اک بار کبھی خود سے بھی ملتے
فرصت کبھی اے گردشِ حالات عطا کر

جرمنی کی مصروف ترین زندگی میں معمولاتِ زندگی مشینی انداز سے گزر رہے ہیں۔ مجھے نہ صرف بہت سارے عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات نہ ہوسکنے کی حسرت رہتی ہے بلکہ کبھی کبھار تو خود سے ملنے کی بھی شدید خواہش ہوتی ہے۔ لیکن یہاں مکروہاتِ دنیا سے یا معمولاتِ زندگی سے مہلت ہی نہیں مل رہی۔ مجھے اتنا اندازہ ہے کہ میرے اندر میرے باہر سے زیادہ بہتر، کچھ ہے۔ لیکن جہاں بدن کے تقاضوں سے ہی جان نہ چھوٹ رہی ہو وہاں اندر کی طرف دھیان کہاں جاسکتا ہے۔ ڈیوٹی پر آنے جانے سمیت دس گھنٹوں کی مشقت کے بعد ساڑھے نو بجے شب کو گھر پہنچتے ہی پہلے لباس تبدیل کرتا ہوں، باتھ روم سے فارغ ہوتا ہوں۔ پھر انٹرنیٹ پر آئی ہوئی ای میلز دیکھتا ہوں اور ان کے جواب لکھتا ہوں۔ دس بجے شب ٹیلی کاسٹ ہونے والے جیو ٹی وی کے خبرنامہ کے پہلے پندرہ بیس منٹ کی خبریں دیکھنا میرا معمول ہے اور اسی دوران ہی رات کا کھانا کھاتا ہوں۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لئے باہر سیر کرنے کے لئے نکل جاتا ہوں۔ دس منٹ کی سیر کے بعد واپس آ کر مغرب اور عشا کی نمازیں جمع کر کے پڑھتا ہوں۔ گیارہ بجے کسی اہم ٹاک شو کو دیکھتا ہوں اور دیکھتے دیکھتے ہی صوفے پر سو جاتا ہوں۔ صبح فجر کی نماز کے وقت پر جاگ جاتا ہوں۔ حوائجاتِ ضروریہ کے بعد نماز، قرآن کی بچپن کی پڑی ہوئی عادت پوری کرتا ہوں۔ اس دوران بیوی بچے بھی جاگ جاتے ہیں۔ سب اپنے اپنے کام پر جانے کی تیاریوں میں مشغول ہوتے ہیں۔ بیوی ناشتہ تیار کرتی ہے تو ہم دونوں مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ پھر میں کچھ دیر کے لئے سو جاتا ہوں۔

دس بجے کے لگ بھگ جاگ کر تازہ دَم ہوتا ہوں۔ کچھ وقت انٹرنیٹ پر گزارتا ہوں۔ پھر ملازمت پر جانے کی تیاری کرتا ہوں۔ سوا بارہ بجے والی بس مجھے میرے گھر کے پاس سے مل جاتی ہے۔ بس پر بیٹھ کر اپنے شہر

ہیٹرس ہائم کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچتا ہوں۔ وہاں سے مجھے فرینکفرٹ شہر تک جانا ہوتا ہے۔ پلیٹ فارم نمبر ا پر فرینکفرٹ جانے والی ٹرین آتی ہے جبکہ پلیٹ فارم نمبر ۲ پر فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آتی ہے۔ میں سیڑھیوں کے قریب اپنی ٹرین کا انتظار کرتا ہوں۔ میری ٹرین سے تین منٹ پہلے فرینکفرٹ سے ٹرین آجاتی ہے اور اس کے آگے جانے تک میری اپنی ٹرین پہنچ جاتی ہے۔ میں اپنی ٹرین کے آگے والے ڈبے میں بیٹھا کرتا ہوں کہ وہاں سے مجھے اپنی اگلی منزل کی طرف جانے میں چند قدموں کے چلنے کی بچت ہو جاتی ہے۔ اس حساب سے چونکہ میں فرینکفرٹ جانے والی ٹرین کے پہلے ڈبے کے مقام پر کھڑا ہوتا ہوں، اس لئے فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کا آخری ڈبہ میرے قریب آ کر رُکتا ہے۔ یوں میں تین منٹ کے عرصہ میں اس ٹرین سے اترنے والی سواریوں کو سرسری سا دیکھ لیا کرتا ہوں۔ ہم سب آنے اور جانے والے مزدور اور دفتر پیشہ لوگ ہوتے ہیں۔ اس لئے تقریباً سارے چہرے عام طور پر جانے پہچانے سے ہوتے ہیں۔ ایک دن میں نے معمول کے مطابق فرینکفرٹ کی طرف سے آنے والی سواریوں کو دیکھنے کی بجائے ویسے ہی اپنے پلیٹ فارم پر اپنی ٹرین کی آمد کا انتظار شروع کر دیا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میرے کندھوں کو تھپتھپایا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو میرا چھوٹا بیٹا تھا جو طبیعت تھوڑی سی خراب ہونے کی وجہ سے دفتر سے جلدی آ گیا تھا۔ اس کو ڈاکٹر سے فوری رجوع کرنے کی ہدایت کرنے کے باوجود مجھے اپنے بیٹے سے اس طرح کی اچانک ملاقات خوشگوار سی لگی۔ اور پھر عجیب سا معاملہ ہوا۔ تب سے جب بھی میں فرینکفرٹ کی طرف جانے والی ٹرین کے لئے جاتا ہوں، فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کو صرف اس وجہ سے دیکھتا ہوں کہ شاید میرا چھوٹا بیٹا پھر اس ٹرین سے اترے۔ ایک بار سنیچر کا دن تھا۔ آفس میں چھٹی کے باعث بیٹا گھر پر ہی تھا لیکن مجھے اپنے اولڈ ہوم میں معمول کے مطابق کام پر جانا تھا۔ میں گھر کے دوسرے افراد کی طرح بیٹے سے بھی ہاتھ ملا کر اور خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکلا۔ لیکن شہر ہیٹرس ہائم کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر جیسے ہی فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آئی، میں اس طرح اسے دیکھنے لگا جیسے ابھی اس میں سے میرا بیٹا اُترے گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بیٹا تو گھر پر ہے، میں کس کا انتظار کر رہا ہوں! اب بیٹے نے اپنی کار لے لی ہے اور وہ کار پر ہی آفس آتا جاتا ہے لیکن میں پھر بھی ہر بار فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین کو ایسے دیکھتا ہوں جیسے میرا چھوٹا بیٹا اس میں سے اترے گا اور میں اس سے ہونے والی ہلکی سی ملاقات کی خوشگواری کو محسوس کروں گا۔ جاب پر جا کر سب سے پہلا کام یہ کرتا ہوں کہ ظہر اور عصر کی نمازیں جمع کر کے پڑھ لیتا ہوں۔

پچھلے دنوں جرمنی کی سب سے زیادہ مالیت ۳۵ ملین یورو کی لاٹری کے بخار نے پورے جرمنی کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ لاٹریوں کے چکر میں نہ پڑنے کے باوجود ۳۵ ملین اتنی بڑی رقم تھی کہ میں نے بھی اسے کھیلنے کا ارادہ کر لیا۔ کچھ خاص دعائیں پڑھ کر حصہ لے لیا۔ ۳۵ ملین یورو کا مطلب ہے ساڑھے تین کروڑ یورو۔ اور اس رقم کو پاکستانی مالیت میں تبدیل کیا جائے تو پونے تین ارب روپے بنتے ہیں۔

لاٹری کھیلنے کے بعد میں نے اس کا فیصلہ ہونے سے پہلے بہت سارے منصوبے بنا لئے تھے۔ جرمنی میں ہی ایک بڑا رہائشی منصوبہ، جس میں میرے سارے بچے اپنے اپنے گھروں میں ایک ساتھ ہوں گے۔ جرمنی میں ایک کمپنی کا قیام اور پاکستان اور انڈیا میں اس کمپنی کی طرف سے انویسٹمنٹ کے پروجیکٹس۔ بچوں کے لئے ان کے ذہنی میلانات کے مطابق جرمنی میں مناسب کاروبار۔ پاکستان میں اپنے پرانے گاؤں کے آس پاس ایک بڑی حویلی کی تعمیر۔ پھر بہت سارے قریبی عزیزوں اور دوستوں کے لئے بعض منصوبے، جن کے مطابق انہیں مالی امداد دینے کی بجائے اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑا کرنے کے منصوبے شامل تھے۔ اسی طرح بعض فلاحی پروگرام شروع کرنے کے خاکے۔ بہت ساری باتیں میرے ذہن میں آ گئی تھیں اور میں نے خود کو ذہنی طور پر ان ساری ذمہ داریوں کے لئے تیار کر لیا تھا۔ جس دن شام کو قرعہ اندازی ہونا تھی اس دن میری معمول کی تلاوت کے دوران سورۃ انفال کی آیت **انما اموالکم واولاد کم فتنة** نے مجھے ہلکا سا جھٹکا لگایا۔ یہ آیت آج کے دن ہی کیوں پڑھنے میں آئی اور پڑھتے وقت اتنی توجہ کیوں کھینچ گئی؟۔ لیکن پھر میں نے اسے ایک اتفاق سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔

قرعہ اندازی کا شفاف عمل ٹی وی پر میں نے اور میرے بیٹے نے براہِ راست ایک ساتھ دیکھا۔ میرا بیٹا کافی جذباتی ہو رہا تھا۔ تب میں نے اسے سمجھایا کہ اگر انعام نکل آئے تو تب بھی اپنی حیثیت سے باہر نہیں ہونا۔ انعام نہیں نکلتا تو غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دونوں صورتوں میں خود کو نارمل رکھنا ہے۔ قرعہ اندازی ہوئی تو ہمارا انعام نہیں نکلا۔ ۳۵ ملین کا انعام کسی اور کو مل گیا۔ بیٹا میرے سمجھانے کے باوجود کافی افسردہ ہوا۔ میں اسے تسلی دیتا رہا۔ مجھے لاٹری کا بڑا انعام حاصل نہ کر پانے کا افسوس نہیں تھا لیکن اپنے کئی منصوبوں کے ادھورے رہ جانے کی تھوڑی سی حسرت دل میں ضرور ہونے لگی تھی۔ انعام نکل آنے کی صورت میں اگلے دن میں نے اپنی مزدوری والی جاب پر نہ جانے کا طے کر لیا تھا۔ انعام نہیں نکلا تو اگلے دن میں معمول کے مطابق اپنی جاب پر چلا گیا۔ جاب سے واپسی پر روز کے معمولات سے گزرتا ہوا، رات کا کھانا کھا کر چند منٹ کی سیر کے لئے نکلا۔

اپنے گھر کے قریب کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے عجیب سی روشنی محسوس ہوئی، سٹریٹ لائٹس سے بالکل مختلف، جیسے مستقبل کے کسی دَور کی کوئی روشنی ہو۔ اسی روشنی میں یکا یک ایک نوجوان دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے ایک بریف کیس مجھے تھماتے ہوئے کہا اس میں ۳۵ ملین یورو مالیت کے قیمتی ہیرے اور سونے کے بسکٹ ہیں۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ آپ اسے لے لیں، میری طرف سے آپ کے لئے تحفہ ہوا۔ اور پھر وہ نوجوان آناً فاناً غائب ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے میرے سارے منصوبے پورے کرنے کے لئے خدا نے کوئی آسمانی مدد بھیج دی ہے لیکن اس خیال کے ساتھ ہی پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دَم تیز ہو گئی۔ میں اپنی سیر کو ادھورا چھوڑ کر گھر کی طرف واپس پلٹا لیکن ابھی میں اپنی بلڈنگ کے

قریب ہی پہنچا تھا کہ سائرن بجاتی ایک پولیس کار میرے قریب آ کر رُک گئی۔ پولیس والے مجھ سے اُسی نوجوان کی بابت پوچھ رہے تھےلیکن میرے جواب دینے سے پہلے ہی اُن کی نظر میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس پر پڑگئی۔تب مجھے بائبل کی ایک آیت یاد آئی: ''ہم سونے کو آگ سے اور انسان کو سونے سے آزماتے ہیں''

پولیس مجھے گرفتار کر رہی تھی،اسی لمحے مستقبل کے کسی دَور جیسی عجیب سی روشنی غائب ہوگئی اور میں نے سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں دیکھا کہ سڑک کے دوسری طرف پولیس نے ایک نوجوان کو گرفتار کیا ہوا ہے۔اس کا بریف کیس پولیس کی تحویل میں ہے۔وہ نوجوان بالکل وہی تھا جو کچھ دیر پہلے مجھے اپنا بریف کیس دے گیا تھا۔لیکن اب نہ تو میرے پاس کوئی بریف کیس تھا اور نہ ہی پولیس نے مجھے کوئی ہتھکڑی لگائی ہوئی تھی۔تو پھر جو کچھ مجھ پر گزرا، یا میں نے محسوس کیا وہ سب کیا تھا؟ کیا میں نے کوئی کشفی نظارہ سا دیکھا تھا یا کسی روشنی نے مجھے اپنے وقت سے چند منٹ پہلے کا سفر کرا کے پھر واپس اپنے مقام پر چھوڑ دیا تھا؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔لیکن کچھ سمجھ آ بھی رہی تھی۔

کل رات والے نظارے یا تجربے کے بعد ساری رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آسکی تھی اور آج جب میں جاب پر جانے لگا ہوں تو طبیعت کافی بوجھل ہے۔گھر سے باہر نکلا تو گہرے بادل اور دھند ایک دوسرے میں مدغم دکھائی دیئے۔ہیٹرس ہائم ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو ریلوے کے عملہ کی طرف سے اعلان ہو رہا تھا کہ ویزبادن سے فرینکفرٹ جانے والی ٹرین دس منٹ لیٹ آ رہی ہے۔دھندلی فضا نے ریلوے اسٹیشن کی روشنیوں کو بھی مدھم کر رکھا ہے۔اس دوران فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین اپنے ٹھیک وقت پر آ گئی اور میں اپنی عجیب سی عادت کے مطابق دیکھنے لگتا ہوں کہ شاید میرا بیٹا اس میں سے اُتر کر آ رہا ہو۔فضا کی دھندلاہٹ کے باوجود واقعی میرا چھوٹا بیٹا انجن کے ساتھ والے ڈبے سے نیچے اُترا ہے اور میری طرف آ رہا ہے۔میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔لیکن جیسے جیسے میرا بیٹا قریب آتا جا رہا ہے، میری مسکراہٹ، حیرت آمیز ہوتی جا رہی ہے۔کیونکہ اب وہ میرا بیٹا نہیں لگ رہا بلکہ صاف طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ میرے ابا جی میری طرف آ رہے ہیں۔میں ابا جی کا استقبال کرنے کے لئے ان کی طرف آگے بڑھ کر جاتا ہوں۔لیکن جب ان کے قریب پہنچتا ہوں تو میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔یہ تو میں خود ہوں!

میں اپنے آپ سے گلے مل رہا ہوں اور ایسے لگ رہا ہے کہ میں خود سے نہیں بلکہ اپنے سارے آباواجداد اور اپنی ساری موجودہ اور آنے والی نسلوں کو گلے مل رہا ہوں۔اسی حالت میں دیکھتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی ٹرین آ رہی ہے۔دور سے اس کی ہیڈ لائٹ کی چمک اسٹیشن کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔

مجھے رات والا واقعہ یاد آ جاتا ہے اور میں مزید کسی حیرت میں پڑے بغیر یقین کر لیتا ہوں کہ فرینکفرٹ سے آنے والی جو ٹرین کچھ دیر پہلے آ چکی تھی، وہ دراصل اب آ رہی ہے، ٹرین اسٹیشن پر رُک رہی ہے اور میں اس کے سب سے اگلے ڈبے میں سے اپنے اترنے کا انتظار کرنے لگتا ہوں!

☆☆☆

اپنے وقت سے تھوڑا پہلے

اس افسانے کے حوالے سے

دو ای میلز کا مختصر مکالمہ

Kurze Dialog aus 2 E mails

Michael Graber-Dünow & Haider Qureshi

میشائل گرابر، حیدر قریشی

نوٹ: میں جرمنی میں جہاں مزدوری کرتا ہوں، میشائل گرابر وہاں کے (افسرِ اعلیٰ) منیجر ہیں۔جب انہیں علم ہوا کہ میں ادب سے کچھ تعلق رکھتا ہوں تو غیر معمولی طور پر خوش ہوئے۔میری چند نظموں کے انگریزی ترجمے ہوئے تو انہوں نے بعض کے جرمن ترجمے کر کے انہیں اپنے ادارہ کے میگزین میں توصیفی کلمات کے ساتھ شائع کیا۔اب میری شعری و نثری تخلیقات کے انگریزی (اور جزوی طور پر جرمن، ترکی اور عربی) ترجمے کی ایک ویب سائٹ بنی ہے تو اس پر بھی انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔اپنے تازہ ترین افسانہ کا انگریزی ترجمہ میں نے انہیں بھیجا تو انہوں نے مجھے ایک عمدہ ای میل بھیجی، میں نے اس کا جواب لکھا۔دونوں ای میلز کو یہاں اردو ترجمہ سمیت پیش کر رہا ہوں۔ ترجمہ کچا پکا سا ہے تاہم مافی الضمیر پوری طرح بیان کر دیا گیا ہے۔یہ اردو اور جرمن ربط کی ایک چھوٹی سی لیکن ادب اور قاری کے ربط کی ایک اچھی مثال بھی ہے اور اہم عالمی اشوز پر ملتی جلتی سوچ رکھنے والوں کی فکر مندی کا اظہار بھی۔**حیدر قریشی**)

Lieber Herr Haider,

gerade habe ich Ihre Kurzgeschichte gelesen. Ich hoffe, dass ich sie verstanden habe, denn mein Englisch ist nicht ganz so gut, sodass ich einige Ausdrücke im Wörterbuch nachschlagen musste.

Ich habe aus Ihrer Geschichte gelesen, dass der Mensch auf der Suche nach sich selbst ist, dass er sich selbst begegnen möchte und dass dies auch möglich ist. Reichtum und Besitz führt aber nicht zur Selbsterkenntnis Sie haben hier ein Zitat aus dem Koran gebraucht: "the property as well as the offspring contain the evil". In der Bibel steht sinngemäß: Eher geht ein Kamel durch ein Nadelöhr, als dass ein Reicher in den Himmel kommt. Ich finde es sehr interessant, dass bei allen Gegensätzen der Religionen, die zur Zeit die Schlagzeilen beherrschen, es offenbar auch viele Gemeinsamkeiten gibt. Und ich denke, es ist wichtig,

auf diese Gemeinsamkeiten zu achten.
Man soll zwar den Künstler nie nach der Interpretation seines Werks fragen, aber ich bin doch sehr gespannt, ob Sie meiner Interpretation zustimmen oder ob ich den Sinn Ihrer Geschichte bisher nicht erfassen konnte.
Wenn Sie morgen Dienst haben, sehen wir uns morgen Nachmittag, ansonsten sicherlich Anfang nächster Woche. herzliche Grüße
Michael Graber-Dünow
9.12.06

....

محترم حیدر صاحب!

میں نے ابھی آپ کا افسانہ پڑھا ہے،اور میرا خیال ہے کہ میں نے اسے ٹھیک سے سمجھا ہے۔چونکہ میری انگریزی زیادہ اچھی نہیں ہے،اس لئے مجھے کئی بار ڈکشنری کا سہارا لینا پڑا ہے۔

آپ کی کہانی سے میں نے یہ سمجھا کہ انسان خود اپنی ہی تلاش میں ہے،وہ اپنا سامنا کرنا چاہتا ہے،اور یہ کہ ایسا ہونا ممکن بھی ہے۔دولت اور جائیداد کے ذریعے خود شناسی حاصل نہیں ہوتی۔آپ نے قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیا ہے’’مال اور اولاد فتنہ ہیں‘‘۔بائبل میں بھی اسی قسم کی بات لکھی ہوئی ہے کہ’’سوئی کے ناکے میں سے ایک اونٹ گزر سکتا ہے لیکن ایک دولتمند جنت میں داخل نہیں ہوسکتا‘‘۔مجھے یہ بات دلچسپ لگی۔تمام مذاہب میں جہاں بہت سے اختلافات ہیں اور ان کے خراب اثرات بھی ان دنوں میں سامنے آرہے ہیں۔،وہیں پر ان میں بہت سی مشترکہ باتیں بھی موجود ہیں۔اور میرا خیال ہے کہ ان مشترکہ باتوں پر ہمیں غور کرنا چاہئے۔

ویسے تو ایک فنکار سے اس کے فن پارے کی تشریح کے لئے نہیں کہنا چاہئے،لیکن مجھے یہ جاننے کا اشتیاق رہے گا کہ کیا آپ اپنی کہانی کے سلسلے میں میری تفہیم سے اتفاق کرتے ہیں؟یا پھر یہ کہ کیا میں آپ کی کہانی کا مطلب نہیں سمجھ سکا؟ نیک خوہشات کے ساتھ **میشائل گرابر**

Lieber Herr Graber,
erst mal möchte ich mich bei ihnen für ihre Kommentare über meine Kurzgeschichte bedanken. Sie haben die Thema in der Geschichte hauptsächlich richtig verstanden.
Ich möchte über einige dinge noch äußern:
1- Der Koran bestätigt den Alten und den neuen Testament zu.
2- Koran sagt, in dem Koran stehen viele sachen über die alten Religionsbücher (Heiligebücher).
3- Koran lädt speziell alle Christen und Juden ein, so das alles was die Relegionen gemeinsam haben, sollten wir dann auch zustimmen.

Da die Fanatiker von alle Religionen (von diesen drei Religionen) zur Zeit die Mächtigsten sind, wegen solchen Leuten gibt es so viel Probleme auf der Welt.
Ich bin froh, dass es auch solchen Leute wie sie und mich auf der Welt geben, die sich wünschen das es auf der Welt nur Liebe und Frieden gibt, obwohl wir keine Macht besitzen, aber wir könnten doch Beten, dass es auf der Welt Liebe und Frieden sich verbreitet.
Zum schluss möchte ich mich wieder bei ihnen bedanken, dass sie meine Geschichten nicht nur lesen, sondern auch gut verstehen und auch Interpretieren.
Nur zur ihre Information, dieses E-Mail hat mein Sohn geschrieben, ich habe ihm nur auf meiner Sprache den Brief diktiert, dass ist der selbe Sohn, von dem ich in der Geschichte schon erwähnt habe.
Mit freundlchen Grüßen.
Haider Qureshi

9.12.06

....

محترم گرابر صاحب

سب سے پہلے تو میرے افسانہ پر آپ کے تاثرات کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔آپ نے افسانے کے بنیادی خیال کو ٹھیک سمجھا ہے۔تاہم میں یہاں چند وضاحتیں کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

۱۔قرآن توریت اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔

۲۔قرآن میں خود مذکور ہے کہ اس میں سابقہ آسمانی کتب اور صحیفوں میں سے بہت کچھ موجود ہے۔

۳۔قرآن خاص طور پر مسیحی اور یہودی مسالک کو دعوت دیتا ہے کہ جن بنیادی معاملات پر ہمارا عقیدہ ایک ہے،ہم اس پر اتفاق کر لیں۔

اس وقت دنیا میں بیشتر مذاہب کے انتہا پسند،(خاص طور پر مذکورہ تین مذاہب کے انتہا پسند) لوگ دنیا کے لئے مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔مجھے خوشی ہے میرے جیسے اور آپ جیسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو دنیا میں محبت اور امن کے ساتھ جینا چاہتے ہیں۔اگرچہ ہم جیسے لوگوں کے پاس وہ طاقت نہیں ہے جس سے ہم امن لاسکیں لیکن ہم دنیا میں امن اور محبت کے فروغ کے لئے دعا تو کر سکتے ہیں۔آخر میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے نہ صرف یہ کہ میری کہانی کو پڑھا بلکہ اس کی تہہ تک پہنچے اور اس کا ٹھیک حوالہ دیا۔

آپ کی اطلاع کے لئے لکھ رہا ہوں کہ میں یہ ای میل لکھوا رہا ہوں اور میرا بیٹا اسے لکھ رہا ہے۔یہ وہی بیٹا ہے جس کا اس کہانی میں ذکر آیا ہے۔ آپ کا مخلص **حیدر قریشی**

ستیہ پال آنند (کینیڈا)

قربِ کعبہ چہ؟

دگر از ایمنی راہ و قربِ کعبہ چہ؟
مرا کہ ناقہ زرفتار ماند و پا بشکست
(غالبؔ)*

رات بھر برف گرتی رہی ہر طرف
میں کہ بیمار تھا
بار بستر تھا اس گھر کے اندر، جہاں
روشنی تھی ابھی، کچھ حرارت بھی تھی
ایک مدھم سی لو ٹمٹماتی ہوئی
جل رہی تھی کہیں جسم کے غار میں
اور باہر سے یلغار کرتی ہوئی
جسم کی کھڑکیاں کھٹکھٹاتی ہوئی
برف تھی، موت تھی!

فون کی بیل بجی
دوسری سمت، دنیا کی الٹی طرف
ممبئی شہر میں
دوستی خیر خواہی کا مارا ہوا
ایک شاعر تھا، گلزارِ شیریں بیاں
پیار سے رکھ رکھاؤ سے اس نے کہا
''اس علالت سے گھبرایئے گا نہیں!
آپ شاعر ہیں فن میں اماں ڈھونڈیئے
از سرِ نو بحالی کی خاطر، میاں
شاعری کی ہی مالا جپیں ہر گھڑی
رات دن بس یہی ورد کرتے رہیں
شاعری، شاعری، شاعری، شاعری!!''

بات کرنے کی ہمت نہیں تھی، مگر
کھڑکیوں میں سے یلغار کرتی ہوئی
برف کی سمت دیکھا، کہا، مہرباں
شعر سنیئے اسد اللہ خاں کا، کہ یہ
ترجمانی کرے گا مرے حال کی
شعر پڑھ کر سنایا تحمل سے، اور
فون کو ساتھ کے میز پر رکھ دیا!

---

*اب مجھے راستے کے تحفظ اور کعبہ کے قریب پہنچ جانے کا کیا فائدہ؟ جبکہ تھکاوٹ سے میری اونٹنی کی رفتار بھی ماند پڑ چکی ہے اور میرا پاؤں بھی سو گیا ہے۔ (آزاد ترجمہ)

ستیہ پال آنند

اثرِ گرمیِ رفتار

خار ازاثرِ گرمیِ رفتارم سوخت
منتے برقدمِ راہ روانست مرا
(غالبؔ)*

کوئی مجھ سے یہ کہتا ہے
''یہاں بیٹھو، ذرا آرام کر لو، تھک گئے ہو
ہزاروں کوس تو اب چل چکے ہو
یہ رستہ اب یہیں پر ختم ہوتا ہے، سمجھ لو
یہ پتھر کچھ ذرا ہموار سا ہے، بیٹھ جاؤ!''

میں اپنے دائیں بائیں دیکھتا ہوں
مگر کوئی نہیں باہر۔۔۔ مرے اندر ہی کوئی بولتا ہے
ذرا جھک کر دریدہ پاؤں اپنے دیکھتا ہوں
تپکتے آبلوں میں نبض چلتی ہے
دھکا دھک دھک، دھکا دھک!

یہ کیسا راستہ دشتِ سخن کا تھا، جو میں نے طے کیا ہے؟
کہ آغازِ سفر میں تو یہ کانٹوں سے بھرا تھا
نکیلے تیز تر خارِ مغیلاں چبھ رہے تھے
کوئی سایہ نہیں تھا، بس فقط اک خارزارِ بے اماں تھا

میں اب پیچھے کی جانب دیکھتا ہوں
وہاں حدِ نظر تک۔۔۔
جس پڑاؤ سے کسی دن میں چلا تھا
عجب منظر ہے پیچھے، دیکھتا ہوں، آنکھیں ملتا ہوں
فقط اک ٹیڑھا میڑھا راستہ ہے
کہاں خارِ مغیلاں ہیں؟ سبھی تو جل چکے ہیں
کہیں کچھ راکھ اب بھی اُڑ رہی ہے!

یہ میری گرمیِ رفتار تھی، میں جانتا ہوں
کہ جس نے خار و خس کو پھونک ڈالا ہے
یہ رستہ تو بہت ہموار سا لگنے لگا ہے!

تسلی سے (ذرا کچھ دل لگی سے) خود سے کہتا ہوں
مری نظموں کے نقشِ پا
مرے تلووں سے ٹپکے خون کے قطرے
مرے پیچھے جو آئیں گے، انہیں رستہ دکھائیں گے!

---

* مری تیز روی کی حدت نے راہ میں بکھرے ہوئے کانٹوں کو جلا کر راکھ کر دیا ہے، اس لیے اب (میرے پیچھے آنے والے) رہ نوردوں کے لیے یہ راستہ آرام دہ ہو گیا ہے۔ (آزاد ترجمہ)

ستیہ پال آنند

بجوکا

رسیدن ہائے منقار ہما بر استخوان غالبؔ
پس از عمرے بیادم دادِ رسم وراہ پیکاں را*

آدمی شاید کبھی ہوگا، مگر اب
ایک دھڑ تھا، ایک سر تھا
بانس کی ٹانگوں پہ سرکنڈے بندھے تھے
ڈھیلے ڈھالے
دھڑ تھا پھر بھی، سر تھا پھر بھی/ر آدمی کا!
الٹی ہانڈی بانس کی گردن پہ لٹکائی گئی تھی
زندہ ڈھانچہ، اک بجوکا
جو پرندوں کو ڈرانے کے لئے گاڑا گیا تھا
ہڈیاں تو ہڈیاں تھیں، چرچراتی تھیں، مگر۔۔۔۔
پھر بھی شکستہ جسم کے اعضا کو جیسے
باندھ کر رکھے ہوئے تھیں
یہ تمسخر خوب تھا۔۔۔ سارے پرندے
اس سے ڈرنے کے بجائے
پاس آ کر اپنی منقاروں سے اس کو چھیدتے تھے
اشک افشاں، خس بدنداں، چیختا رہتا تھا، لیکن
کون سنتا؟
ڈھیٹ تھے سارے پرندے
اڑتے اڑتے پاس آ کر
اپنی منقاروں سے اس پر وار کر کے لوٹ جاتے
جیسے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو
زندہ ڈھانچہ، اک بجوکا/ آبدیدہ اپنے سر کو دھنتا رہتا!
اور پھر اک دن کسی طائر کی بھاری ٹھونگ سے وہ
الٹی ہانڈی کا سا چہرہ گر گیا، نیچے زمیں پر
اور بجوکا بظاہر/ تو مر گیا۔۔۔
لیکن نہیں! وہ دھڑ ابھی اعضا کو اپنے
باندھ کر رکھے ہوئے ہے/ اور ویسے ہی کھڑا ہے
ہاں مگر سارے پرندے
اک غلط انداز سے ترچھی نظر سے
دیکھ کر، تیزی سے اپنا رُخ بدل کر
دور اُڑ جاتے ہیں اس سے/ سوچتا ہوں، میں یہیں ہوں
میں وہی ہوں/ طائروں کو کیا ہوا ہے؟
کیا مجھے اب یکہ و تنہا، اکیلا
کنج تنہائی میں اپنے آپ ہی رہنا پڑے گا؟
یاد کرتا ہے، سنہرے دن پرندوں سے بقائے باہمی کے
ہائے کیا لذت تھی، کیسی چاشنی تھی
بے کلی میں بھی خوشی، آسودگی تھی!
اب وہ ''رسم وراہِ پیکاں'' کیا ہوئی ہے؟
کاش وہ دن لوٹ آئیں!

---

*غالبؔ کی نیک روح سے معذرت کے ساتھ۔ شعر کا آزاد ترجمہ کچھ یوں ہے ''غالب کے اسخوان پر ہما نے کچھ اس طرح چونچ سے ٹھونگیں لگائی ہیں کہ ایک عمر گزرنے کے بعد بھی مجھے نیزوں کی پیکان سے زخمی ہونے کی رسم وراہ یاد ہے۔''

فرحت نواز (رحیم یار خان)

بچھڑتے لمحوں میں

مجھے خبر ہے
ہمارے جیون کے سنگ سانسیں کشید کرتی
تمام گھڑیوں کا وقتِ آخر قریب تر ہے
بچھڑتے لمحے دعائیں کیا دوں!
کہ اب تلک کی دعاؤں نے جو اثر کیا
اس کا زہر اب تک رگوں میں رقصاں ہے
سوچتی ہوں
تمہارے ماتھے پہ اپنے ہونٹوں سے کیا میں لکھوں
کہ جو بھی مالک نے لکھ دیا ہے وہی امر ہے
بچھڑتے لمحے
ملن کے سب موسموں کے جذبے میں تم کو دے دوں
تو کیا انہیں تم بہار آمیز رکھ سکو گے؟
میں اپنی ساری محبتیں تم کو دوں تو بولو
انہیں بھلانے میں
عمرِ فانی میں کتنی صدیوں تلک جیو گے
دعائیں۔۔۔ جذبے۔۔۔ محبتیں
یہ تمام دکھ ہیں
بچھڑتے لمحوں میں دکھ نہ مانگو!

پروین شیر (کینڈا)

جھوٹ کی مٹی کی اک بے آہنی بنیاد پر وہ
خوبصورت اور عالیشان گھر جب
سچ کی اینٹوں سے بنایا جا رہا تھا
اک سنہرے خواب کا در وا ہوا تھا
روشنی کی کھڑکیاں کھلنے لگی تھیں
آرزو کے خوشنما رنگیں گلابوں کی کیاری
گھر کے پائیں باغ میں بننے لگی تھی
صحن میں امید کے پودے لگے تھے
آس کی شبنم سے جو سینچے گئے تھے
آسماں چھونے لگا وہ خوبصورت خواب سا گھر!
پایۂ تکمیل تک جیسے ہی پہنچا
جھوٹ کی کمزور مٹی سہہ نہ پائی
سچ کی اینٹوں کا بہت نا قابلِ برداشت بھاری بوجھ
اور وہ آسماں چھوتا ہوا پیارا سا گھر اب
ڈھے گیا ہے
اُس کے ملبے جھوٹ کی مٹی کا ماتم کر رہے ہیں!

عذرا پروین (لکھنؤ)

اس برس بھی

سدا کی مانند اس برس بھی تمام کوّوں کے جھنڈ
کوئل مکٹ پہ قابض خوشی سے پاگل پھدک رہے ہیں
فتح پہ اپنی اچھل رہے ہیں
اداس کوئل کہ جس کے سینے میں ہوک بن کے
نراش کوئل کہ جس کی شہ رگ پہ کوک بن کے
ہزار نغمے دھڑک رہیں
وہ آشیانے میں بن کے گونگی
سپاٹ نیلے فلک کو چپ چپ نہارتی ہے
جو کہہ رہا ہے
خموش رہنا، کبھی نہ کہنا
کہ جب بھی کوئل کی کوک گونجی
یہ آپ اپنا مکٹ سیانوں سے چھین لے گی
کہ جیتے جی کیا تری چہک کو ترا گھروندہ
وہی گھروندہ تو جس کی محور بنی ہوئی ہے
تو جس میں زندہ چُنی ہوئی ہے
وہی گھروندہ ہے جس کی چھت اور فرش تو ہی
ہے جس کی دیوار و در بھی تو ہی
تو ہی ہے جس گھر کا رنگ، روغن
وہی گھروندہ تجھے یا تیری نوا کو زندہ رہا کرے گا
رہا ہوئی بھی تو یہ گھر، گھروندہ
یہ تب بھی کیا یوں سجا رہے گا
جو ہو رہا ہے وہی رہے گا
تری صدا اس برس بھی شاید
فلک ادھر تک نہ جا سکے گی!

عذرا پروین

مگر شاعرہ

جو اندر کی عورت ہے معصوم سادہ
وہ کم مانگتی ہے
مگر شاعرہ اپنے پتھر سے پورا صنم مانگتی ہے
ہیں اس کی کئی اور مجبوریاں
کچھ تجسس، ارادے، تمنا الگ ہے
اس کی جادوئی تجسس بھری سحر
عشاق آنکھوں کی لمبی مسافت
کہاں ختم ہو گی
اگر سادہ عورت اسے یہ بتا دے
تو یہ شاعرہ
یہ جہاں سارا زندہ جلا دے!

جان عالم (مانسہرہ)

ڈر

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا
مرے اجداد نے ورثے میں مجھ کو ڈر دیا ہے
گزرتے پل کو ڈر اور آنے والے کل کا ڈر
خدا کا ڈر.....
خدا کے ضابطوں کے چھوٹنے اور..
رابطوں کے ٹوٹنے کا ڈر
تواتر نے مری پشتوں کی پشتوں سے
اُبلتے دودھ میں یہ ڈر ملایا ہے

(یہ ڈر اب کس طرح جائے...یہ ڈر اب جا نہیں سکتا)

مرے بیٹے نے کل مجھ کو جگا کر جب کہا بّپا!
تم آنکھیں کھول کر سونا، مجھے ڈر لگ رہا ہے
تو میں اُس وقت بیٹے سے زیادہ ڈر گیا تھا

جان عالم

اَن کہی

ہوا کے ہاتھوں سے
پیالیوں کی کھنک گری تو سکوت ٹوٹا
میں اپنے لفظوں کی کرچیوں کو اُٹھا کے
اُس کی سماعتوں کی طرف بڑھا تو
وہ جا چکا تھا
پیالیوں کے لبوں پہ جالے سے تن گئے تھے
اور عنکبوتِ ملال.............................
.............................کمرے کو کھا رہا تھا

اقبال نوید (برطانیہ)

روایتیں بھی وراثتیں ہیں

روایتیں بھی وراثتیں ہیں
کہ عہدِ موجود سے نکل کر ہم اپنے ماضی میں جی رہے
ہیں
کہانیاں اپنی زندگی ہیں
ہمارے خوابوں کے پیڑ ایسے پھلوں کی آمد کے منتظر ہیں
کہ جو شکستہ گئے زمانے کی آندھیوں میں بکھر گئے تھے
اگرچہ ہر شے رواں دواں ہے
کہیں پہ کچھ منجمد نہیں ہے
مگر وہ مضبوط فکر کہرے میں سو رہی ہے
کہ جس کی دستک
ہمارے ذہنوں کے حبس موسم کی تازگی ہے
تمام دنیا۔۔۔۔۔۔
نئے زمانے کی جستجو کے سفر کی دنیا
مگر ہم اب تک عقیدتوں کے اسیر۔۔۔۔۔
تاریک جنگلوں میں گھرے ہوئے ہیں
نظر نہ آتے ہوئے زمانے میں جی رہے ہیں
یقیں کی وادی کے ہم مسافر
جو معجزوں کی طلب میں مفلوج ہو چکے ہیں
روایتیں ہیں، عقیدتیں ہیں
کہ واہموں کے سراب آنکھوں میں بہہ رہے ہیں
ہماری خواہش
کہ آتی نسلیں اسی روایت کا ہاتھ تھامے قدم اٹھائیں
کہ جس کی انگلی پکڑ کے اب تک بھٹک رہے ہیں
ہم اپنی ناکامیوں کو مشعل سمجھ رہے ہیں
مگر میں آتے دنوں میں
ہر اک زباں پہ انکار دیکھتا ہوں
نگار خانۂ دل کے سارے بتوں کو مسمار دیکھتا ہوں

ناظم خلیلی (رائچور)

ٹھنڈے میٹھے لفظ!

(اک ادیب دوست کی شادی پر)

مہندی، مسّی، نتھ اور گھونگھٹ
گجرا، مصری، خوشبو، فرحت
یہ سب لفظ بہت اچھے ہیں
لوگوں کی نظروں کے آگے
اک رنگین سا منظر کھینچ کے رکھ دیتے ہیں
میں شاعر ہوں
تم شاعر ہو
تم بھی لفظوں کی دنیا کے جادوگر ہو
لفظ کی قیمت سے واقف ہو
اچھے لفظ کہاں ملتے ہیں
سچے لفظ کہاں ملتے ہیں
شادی، وصل، محبت، چاہت
شہد اور چاند، مسرت، راحت
ان لفظوں سے
پھولوں کی خوشبو آتی ہے
پھول اور خوشبو
یہ دو لفظ میں آج تمہارے نام کے آگے لکھ دیتا ہوں
تم ان لفظوں کی قیمت سے واقف ہی ہو۔۔۔!

اکمل شاکر (پسنی)

مجھے پانا نہ پانا ایک جیسا ہے

مجھے پانا ہوا کے ساتھ رہنا ہے
میں غائب ہوں
مجھے ڈھونڈو
مجھے پانا
دُکھوں پر ہاتھ رکھنے کی تمنا ہے
یہ خواہش چند لمحوں تک تمہارے دل میں
زندہ ہو کے مرتی ہے
مجھے چھونا خلا کے پار جانا ہے
جہاں دکھ کے جزیرے برف باری سے سلگتے ہیں
جہاں کچھ سال پہلے موسمی خوابوں کی وادی تھی
ابھی تک میری آنکھوں نے
اسی تصویر کو محفوظ رکھا ہے
مجھے پانا ہمیشہ زندگی کو پا کے کھونا ہے
دلوں میں درد بونا ہے
سمندر کی طرح دن رات رونا ہے
مجھے پانا، ہمیشہ زندگی سے ہاتھ دھونا ہے
مجھے پانا
نہ پانا
ایک جیسا ہے

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

درد

درد چھوٹا تو یہ محسوس ہوا ہے مجھ کو
جیسے اک شمع شبستان جلی
جس کی کرنیں مرے اس خاک نگر میں آئیں
نور پھیلا نہ سکیں
روشنی لا نہ سکیں
قریہءِ جاں کو محیطِ غم دوراں کر کے
میری پلکوں پہ رکیں
کرب میں تحلیل ہوئیں
ان کی آغوش میں ہے
درد مرا__ ایک مجسم آنسو!

ڈاکٹر انور سدید

کھڑکی

مجھے احساس ہے میں نے
ابھی کچھ کام کرنے ہیں
ستارے جو مری پلکوں پہ آنسو بن کے چمکے تھے
انہیں میں نے نئے منکوں کی مالا میں پرونا ہے
نئے مفہوم کے میں نے ابھی اشعار کہنے ہیں
اور ان اشعار کو لوگوں کے دل میں
جاگزیں کرنا بھی، اک دیرینہ خواہش ہے
جوانی میں جو میں نے شاعری کی تھی
وہ اب مجھ کو ادھوری شاعری لگتی ہے
ناپختہ خیالوں__ اور ناآسودہ جذبوں کی
اگرچہ زندگی کا ساتواں عشرہ سرکتا جا رہا ہے
مگر اب ایک کھڑکی دل میں اپنے کھول دی میں نے
خیالوں کی جو تازہ آکسیجن سے
مجھے سیراب کرتی ہے
یہ کھڑکی میرا داخل ہے
یہ کھڑکی میرا خارج ہے!

ڈاکٹر انور سدید

پناہ گاہ

میں اپنے دل کے اک تاریک گوشے میں
چھپا بیٹھا ہوں
فرغل میں لپیٹے اپنی یادوں کو
کہ یہ جگنو نہ چمکیں
اور نہ شب خوں میری تنہائی پہ ماریں
روشنی کی جلتی بجھتی تیز کرنوں سے
میں اپنے دل کے اک تاریک گوشے میں
چھپا بیٹھا ہوں

ڈاکٹر انور سدید

آواز کی آلودگی

مری آواز کی دنیا میں
کتنی دیر سے گھمبیر سناٹا
بلاتا ہے مجھے__ کہتا ہے
آؤ دونوں مل کر
اپنی تنہائی کا غم بانٹیں
مجھے تم دیکھ کر روؤ
تمہیں میں دیکھ کر روؤں
اور ان اشکوں میں
اپنے دہر کی آلودہ آوازوں کو
سارے شور و غل کے زہر کو
اک لمبا گہرا سانس لے کر
آکسیجن میں ڈبو ڈالیں

شہناز نبی (کلکتہ)

ٹوٹ رہی ہیں سب دیواریں

اب
میرے اس کے بیچ کوئی دیوار کہاں
میں نے اس کو جی بھر دیکھا
اس نے بھی یوں مجھ کو بھینچا
میرے سینے کی سب آہیں/اک دم سے باہر آنکلیں
میرے آنسو دریا بن گئے
خاموشی صحرا در صحرا/تنہائی پاتال تلک ہے
میرے اندر میرا کیا تھا/میرے باہر بھی میرا کیا
جس سے میرے زخم ہرے تھے
اس نے میرے درد ہرے ہیں
میری ٹوٹی پیالی میں اک جرعہ اس کی مدرا کا
میرے جھوٹے باسن میں/اک لقمہ اس کے درشن کا
اس سے پوچھو/کب کب کیا کیا اور گذرنے والا ہے
میں تو بس اتنا ہی جانوں
میرے ٹوٹے سپنے وہ پلکوں سے چننے والا ہے
میری تنہائی پہ
صدیوں تک وہ جگنے والا ہے
میری خاموشی کو لفظوں کے معنی پہنائے گا
اک نہ اک دن مجھ سا بن کر وہ کتنا اترائے گا

شہناز نبی

مرا دل نہ روئے

سفر میں یونہی
بادلوں سے جدا ہو کے بکھری ہے بارش
بن کھلے پھول مرجھا کے
گرتے رہے ہیں زمیں پر
ہوائیں بنا دستکوں کے گذرتی رہی ہیں
کہاسے میں لپٹے ہوئے آنگنوں سے
چاند/پچھلے پہر
یونہی مدقوق سی اک ہنسی پھینکتا ہے
خوابگاہوں کے عریاں دریچے تلک
قطرہ قطرہ ٹپکتی ہے شبنم/چٹانوں کی بے حس سطح پر
گرد میں اٹ کے بھی/کوئی پتہ
شعاعوں کو بانہوں میں لینے سے
ہرگز جھجکتا نہیں ہے
سفر میں عجب حادثے پیش آتے ہیں
لیکن کوئی کتنا سوچے
یہ مانا گذرتے چلے جا رہے ہیں سبھی
منظروں کی طرح/اک صدی ایک لمحہ بنے
یا کہ لمحہ صدی/یا اکارت ہی جائے
یہ ہستی
مگر دل سے کہہ دو نہ روئے

شہناز نبی

خموشی

خیال اس کے/زبان اس کی
نگاہوں پر بھی لگے تھے پہرے
اگر کھلو تو حرم کے اندر/جئو مرو تو زنانیوں میں
زبان اس کی/خیال میرے (مگر ادھورے)
حدوں کے اندر ہو گفتگو سب
نپے تلے ہوں تمام جملے
اک ایک مصرعہ حجاب آگیں
زبان میری خیال میرے
مگر ابھی تک وہی اندھیرے
علامتوں کو زوال نہ ہو
نہ بدلے جائیں گے استعارے
کہ بحر و بر ہیں نگین اس کے
کہ صرف و نحو پہ اجارہ اس کا
وہی سناتا ہے فیصلے سب
اسی نے سانچے بنائے سارے
وہ حرفِ اول/وہ حرفِ آخر
چلو کچھ ایسا کریں
قفس کی اک ایک تیلی بکھر ڈالیں
بے چارہ آدم/
اسیر نطق و زباں ہے کب سے
اسے خموشی کے گر سکھائیں

شہناز نبی

بگولہ

رمادِ زیست کا انجام اور کیا ہوتا
اڑی دیار سے تو کوئے یار جا پہنچی
بدل بدل کے بہت روپ ہم نے جانا ہے
نہ خاک ہو تو گلِ تر کہاں سے آئے گا
کہ کون لپٹے گا قدموں سے رہ نوازی میں
کہ کون دامنِ صد چاک کو بسائے گا
جبیں پہ کون تلک بن کے جگمگائے گا
مسافرت میں تیمّم کے کام آئے گی
کبھی سلیقۂ عشقِ دروں سکھائے گی
کہ دور بیٹھے گی معشوق سے براہِ ادب
کبھی جنوں میں یہ صحراؤں کو تھکائے گی
ہمیں خلش ہے یہی کیوں نہ آگ سے جنمے
کہ آب و باد بھی ایسے برے نہیں تھے مگر
ہمیں اٹھانا ملانا تھا خاک میں اس کو
یہ زندگی کو بگولہ بنانا
چہ معنی؟

شہناز نبی

کچھ ایسی راتیں

یہ سچ نہیں ہے کہ رات بھر ہم
تمہاری یادوں کی کہکشاں سے گذر رہے ہیں
تمہارا لہجہ تو گونجتا ہے سماعتوں میں
تمہاری سانسیں بھٹکتی رہتی ہیں چار جانب
تمہاری آنکھوں کی گرمیاں ہیں نسوں میں رقصاں
مگر نہ جانے
یہ کس کی چیخیں تمہارے لہجے کی نرمیوں پر
ہوئی ہیں حاوی
یہ کس کی آہیں تمہاری سانسوں کے زیر و بم سے
الجھ رہی ہیں
یہ خوف و دہشت بھری نگاہیں
یہ خاک و خوں کا عجیب میلہ
یہ سر سے چھنتی ہوئی ردائیں
یہ پارۂ دل
یہ جسم ریزہ
ہر ایک لیلیٰ سے اب یہ کہہ دو
کہ لام پر جا چکا ہے مجنوں
ہر ایک شیریں کو یہ بتا دو
کہ بیستوں سے چھلکتا ہے خوں
ہمارے گھر کے سنہرے نقشے نگل رہے
ہیں کٹھور صحرا
ہمارے سجدے مٹا رہا ہے سمندروں کا سیاہ پانی
شکست و ذلت
نہ فتح و نصرت
ہاں، رزم اول
کہ، رزم آخر
تمہاری یادوں کے درمیاں اب
کچھ ایسی راتیں بھی آ گئی ہیں
جو سوچتی ہیں سوا تمہارے

چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان (مرحوم)

میری والدہ

بچوں کی وفات پر والدہ کا صبر

(**نوٹ**: اردو ادب میں والدہ کے بارے میں خاکہ یا مضمون لکھنے کے حوالے سے عام طور پر قدرت اللہ شہاب کے خاکہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان نے ۱۹۳۸ء میں اپنی والدہ محترمہ کے بارے میں ایک کتابچہ ''میری والدہ'' کے نام سے شائع کیا تھا۔اسے طویل خاکہ بھی کہا جا سکتا ہے۔اس کا ایک حصہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔اردو ادب کا غیر متعصّبانہ مطالعہ کرنے والے قارئین کے لئے ماں کے بارے میں لکھی گئی چنی نثری تحریروں میں سے یہ ایک نایاب تحریر ہے۔**حیدر قریشی**)

میری پیدائش سے قبل میرے والدین کے پانچ بچے فوت ہو چکے تھے۔ان میں سے پہلے تین کی پیدائش اور وفات اس زمانہ ہوئی جب میرے والد صاحب ابھی طالب علم ہی تھے اور آخری دو کی ان کی مختاری اور وکالت کے زمانہ میں۔ان میں سے ہر ایک بچہ کی وفات میری والدہ صاحبہ کے لئے ایک امتحان بن گئی۔جن میں ان کے ایمان کی پوری پوری آزمائش کی گئی۔لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم سے ہر موقعہ پر ثابت قدم رہیں اور کسی وقت بھی ان کے قدم جادۂ صدق سے ادھر ادھر نہیں بھٹکے۔تفصیل تو ان واقعات کی بہت لمبی ہے۔اختصار کے ساتھ دو تین واقعات مثال کے طور پر بیان کر دیتا ہوں۔جن سے اس امتحان کی نوعیت اور والدہ صاحبہ کے صدق اور ایمان کی وضاحت ہو جائے گی۔

ہمارے سب سے بڑے بھائی کا نام بھی ظفر ہی تھا۔والدہ صاحبہ ان سب بچوں میں سے ظفر اور رفیق کا نہایت محبت سے ذکر فرمایا کرتی تھیں اور اُن کی خوش شکلی کی بہت تعریف کیا کرتی تھیں۔ظفر ابھی چند ماہ کا ہی تھا کہ والدہ صاحب کا داتا زید کا جانے کا اتفاق ہوا۔اُن کے گاؤں میں ایک بیوہ عورت جے دیوی نام کی تھی۔جسے لوگوں نے چڑیل یا ڈائن مشہور کر رکھا تھا اور وہ بھی اس شہرت یا بدنامی کا فائدہ اُٹھا لیا کرتی تھی۔اس موقعہ پر وہ والدہ صاحبہ کے پاس آئی اور اُن سے کچھ پارچات اور کچھ رسد اس رنگ میں طلب کی،جس سے مترشح ہوتا تھا کہ گویا یہ چیزیں ظفر سے بلا ٹالنے کے لئے ہیں۔

والدہ صاحبہ نے جواب دیا کہ تم ایک مسکین عورت ہو،اگر تم صدقہ یا خیرات کے طور پر کچھ طلب کرو۔تو میں خوشی سے اپنی توفیق کے مطابق تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں۔لیکن میں چڑیلوں اور ڈائنوں کو ماننے والی

نہیں۔میں صرف اللہ تعالیٰ کو موت اور حیات کا مالک مانتی ہوں اور کسی اور کا ان معاملات میں اختیار تسلیم نہیں کرتی۔ایسی باتوں کو میں شرک سمجھتی ہوں اور ان سے نفرت کرتی ہوں۔اس لئے اس بنا پر میں تمہیں کچھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

جے دیوی نے کہا''اچھا تم سوچ لو۔اگر بچے کی زندگی چاہتی ہو۔تو میرا سوال تمہیں پورا کرنا ہی پڑے گا۔''

چند دن بعد والدہ صاحبہ ظفر کو غسل دے رہی تھیں کہ جے دیوی پھر آ گئی اور بچے کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا:'' اچھا یہی ساہی راجہ ہے؟''

والدہ نے جواب دیا''ہاں یہی ہے''

جے دیوی نے پھر وہی اشیاء طلب کیں۔والدہ نے پھر وہی جواب دیا جو پہلے موقعہ پر دیا تھا۔اس پر جے دیوی نے کچھ برہم ہو کر کہا:''اچھا اگر بچے کو زندہ لے کر گھر لوٹیں۔تو سمجھ لینا کہ میں جھوٹ کہتی تھی''

والدہ صاحبہ نے کہا''جیسے خدا تعالیٰ کی مرضی ہوگی وہی ہوگا۔''

والدہ صاحبہ فرمایا کرتی تھیں کہ ابھی جے دیوی مکان کی ڈیوڑھی تک بھی نہ پہنچی ہوگی غسل کے درمیان ہی ظفر کو خون کی قے ہوئی اور خون کی ہی اجابت ہوگئی۔چند منٹوں میں بچے کی حالت دگرگوں ہوگئی اور چند گھنٹوں کے بعد وہ فوت ہو گیا۔والدہ صاحبہ نے خدا تعالیٰ کے حضور عرض کی۔یا اللہ تو نے ہی دیا تھا اور تو نے ہی لے لیا۔میں تیری رضاء پر شاکر ہوں۔اب تو ہی مجھے صبر عطا کیجیو۔اس کے بعد خالی گود ڈسکہ واپس آ گئیں۔پھر کچھ عرصہ بعد رفیق پیدا ہوا۔ظفر سے بھی زیادہ پیارا اور خوش شکل۔میرے دادا صاحب نے والدہ صاحبہ سے فرمایا کہ جب تک بچہ چلنے پھرنے نہ لگے اور آپ سے الگ رہنے کے قابل نہ ہو جائے آپ کو داتا زید کا جانے نہ دیں گے۔

رفیق دو سال کا ہو گیا اور والدہ صاحبہ اس عرصہ میں ڈسکہ میں ہی مقیم رہیں۔پھر ان کے خاندان میں کوئی وفات ہوگئی اور مجبوراً اُنہیں داتا زید کا جانا پڑا۔میرے دادا صاحب نے صرف ایک ہفتہ یا دس دن وہاں ٹھہرنے کی اجازت دی۔بلکہ پہلے تو فرمایا کہ رفیق کو ڈسکہ ہی چھوڑ دیں،لیکن یہ والدہ صاحبہ کو منظور نہ ہوا۔

داتا زید کا پہنچنے کے ایک آدھ دن بعد پھر جے دیوی آئی اور اپنا پرانا مطالبہ پیش کیا اور والدہ صاحبہ نے پھر وہی جواب دیا۔اس موقعہ پر میرے نانا صاحب نے بھی اصرار کیا کہ آخر اتنی کونسی بڑی بات ہے۔چند روپوں کا معاملہ ہے۔جو یہ مانگتی ہے۔اسے دے دو اور اگر تمہیں کوئی عذر ہے۔تو ہم دے دیتے ہیں۔والدہ صاحبہ نے جواب دیا کہ یہ چند روپوں کا معاملہ نہیں۔یہ میرے ایمان کا امتحان ہے۔کیا میں یہ تسلیم کر لوں کہ میرے بچے کی زندگی اس عورت کے اختیار میں ہے؟ یہ تو کھلا شرک ہے۔اگر میرے بچے کو اللہ تعالیٰ زندگی دے گا تو یہ زندہ رہے گا اور اگر وہ اسے زندگی عطا نہیں کرے گا۔تو کوئی اور ہستی اسے زندہ نہیں رکھ سکتی۔میں تو اپنے ایمان کو شک میں ہرگز نہ ڈالوں گی۔بچہ زندہ رہے یا نہ رہے۔

دو چار روز بعد والدہ صاحبہ نے خواب میں دیکھا کہ اُن کے گاؤں کی ایک عورت شکایت کر رہی ہے کہ اس کے بچے کا کلیجہ جے دیوی نے نکال لیا ہے اور کسی نے اُس سے باز پُرس نہیں کی۔اگر کسی صاحبِ اقتدار کے ساتھ

ایسا ہوتا تو وہ جے دیوی کو ذلیل کر کے گاؤں سے نکال دیتے۔ والدہ صاحبہ نے خواب میں ہی جواب دیا کہ موت اور حیات تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، جے دیوی کا اس میں کچھ واسطہ نہیں۔ میرے بچہ کے ساتھ بھی بظاہر ایسا ہی واقعہ ہوا تھا۔ لیکن ہم نے تو جے دیوی کو کچھ نہیں کہا۔

والدہ صاحبہ فرمایا کرتی تھیں کہ میرا یہ کہنا ہی تھا کہ خواب میں میں نے دیکھا کہ گویا ایک طرف کوئی کھڑکی کھولی گئی ہے اور اُس میں جے دیوی کا چہرہ نظر آیا اور مجھے مخاطب کر کے جے دیوی نے کہا۔ ''اچھا اب کی بار اگر بچے کو زندہ واپس لے گئیں۔ تو مجھے کھتری کی بیٹی نہ کہنا۔ چوہڑے کی بیٹی کہنا۔''

والدہ صاحبہ کی دہشت سے آنکھ کھل گئی دیکھا کہ چراغ گل ہو چکا ہے۔ والدہ صاحبہ کی عادت تھی کہ وہ اپنے سونے کے کمرے میں ضرور روشنی رکھا کرتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کہ جب بھی خواب میں جے دیوی نظر آیا کرتی تھی۔ تو آنکھ کھلنے پر ہمیشہ کمرہ اندھیرا ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ والدہ صاحبہ نے میری نانی کو آواز دی۔ جو اُسی کمرے میں سو رہی تھیں۔ انہوں نے چراغ روشن کیا اور روشنی ہونے پر والدہ صاحبہ نے دیکھا کہ رفیق نے خون کی قے کی ہے اور ساتھ ہی اُسے خون کی اجابت بھی ہوئی ہے اور نیم مردہ سا ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ بہت گھبرائیں۔ اس خیال سے اس کے دادا تو آنے ہی نہیں دیتے تھے اور اب اگر ظفر کی طرح یہ بھی یہیں فوت ہو گیا۔ تو میرا ڈسکہ میں کوئی ٹھکانہ نہیں۔

چنانچہ انہوں نے اصرار کیا کہ ابھی سواری کا انتظام کیا جائے۔ میں فوراً بچہ کو لے کر ڈسکہ جاتی ہوں۔ سحری کا وقت تھا، فوراً دو سواریوں کا انتظام کیا گیا اور والدہ صاحبہ اور نانی صاحبہ دو خادموں کے ساتھ رفیق کو اُسی حالت میں لے کر دا تا زید کا سے روانہ ہو گئیں۔ جب روشنی ہونی شروع ہوئی تو والدہ صاحبہ نے دیکھا کہ رفیق بالکل مردہ سا ہو رہا ہے اور بظاہر زندگی کے آثار باقی نہیں ہیں۔ فرمایا کرتی تھیں کہ میں نے سمجھ لیا کہ اُس کی موت کا وقت آ چکا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ قضا کو ٹال دینے پر قادر ہے۔ چنانچہ میں نے گھوڑے کی باگ اس کی گردن پر ڈال دی اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر دعا شروع کی کہ یا اللہ تو جانتا ہے کہ مجھے اس بچے کی جان کی فکر نہیں اگر تیری رضا اس کو بلانے میں ہی ہے تو میں تیری رضا کو خوشی سے قبول کرتی ہوں۔ لیکن مجھے اپنی آبرو کی فکر ہے۔ اگر یہ بچہ آج فوت ہو گیا تو میرا ڈسکہ میں کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اے ارحم الراحمین تو ہی زندگی اور موت کا مالک ہے۔ تو میری زاری کو سن اور اس بچہ کو دس دن کی اور مہلت عطا فرما۔ تا اس کے دادا اس کو ہنستا کھیلتا دیکھ لیں۔ دس دن بعد پھر تو اسے بلا لیجیو، میں اس کی وفات پر اُف بھی نہ کروں گی۔ فرمایا کرتی تھیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ کتنا عرصہ میں نے یوں دعا کی۔ لیکن میں ابھی دعا کر ہی رہی تھی کہ رفیق نے میرے دوپٹے کو کھینچا اور تندرستی کی آواز میں پکارا ''بے بے'' اور میں نے دیکھا کہ وہ بالکل تندرست حالت میں میری گود میں کھیل رہا ہے۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ میرے مولیٰ نے میری دعا سن لی اور میرا دل اس کے شکر سے معمور ہو گیا۔

ڈسکہ پہنچے تو میرے دادا بہت خوش ہوئے کہ یہ لوگ وعدہ سے پہلے ہی واپس آ گئے۔ پوتے کو گود میں لیا اور پیار کیا اور ہنسی ہنسی اس سے باتیں کرتے رہے اور اسی طرح دن گزرتے گئے۔

والدہ فرمایا کرتی تھیں کہ میں داد پوتے کو خوش خوش دیکھ کر مسکرایا کرتی تھی کہ رفیق تو نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت

ہنس رہی ہے۔ رفیق تو خدا تعالیٰ کی نذر ہو چکا ہوا ہے۔ چنانچہ پورے دس دن گزرنے پر رفیق پر کھیلتے کھیلتے وہی حالت وارد ہو گئی۔ جو دا تا زید کا میں ہوئی تھی۔ اُسی طرح خون آیا اور چند گھنٹوں میں وہ اپنے مولیٰ کے پاس چلا گیا۔ میری والدہ کی گود پھر خالی ہو گئی۔ لیکن انھوں نے خوشی خوشی اللہ تعالیٰ کی رضا کو قبول کیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ تو نے ایک عاجز انسان کی زاری پر اس کے حال پر رحم فرمایا اور اُس کی آبرو کی حفاظت کی۔

میری پیدائش

میری پیدائش ۶/ فروری ۱۸۹۳ء کو بمقام سیالکوٹ ہوئی۔ اس سے پہلی رات والدہ صاحبہ نے پھر جے دیوی کو خواب میں دیکھا۔ اُس نے انہیں بتایا کہ فلاں وقت لڑکا پیدا ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی کہا کہ بعض احتیاطیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ پیدا ہوتے ہی لڑکے کی ناک چھید دینا اور اونٹ کا بال چھید میں ڈال دینا۔ دوسرے ایک چراغ آٹے اور گھی اور ہلدی کا بنا کر کل رات اپنے مکان کی سب سے اوپر کی منزل کی چھت کے اُس کونے پر جہاں چیل بیٹھا کرتی ہے، جلا دینا۔

یہ خواب والدہ صاحبہ نے والد صاحب کو سنا دی۔ عین اُس وقت جو خواب میں بتایا گیا تھا۔ میری پیدائش ہوئی اور والدہ صاحبہ فرمایا کرتی تھیں کہ میں نے دیکھا کہ تمہاری پھوپھی مبارک بی بی نے ایک چھوٹی سی پیالی میں ایک سوئی تیار کر کے رکھی ہوئی ہے۔ جس میں دھاگے کے بجائے ایک بال ڈالا ہوا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ یہ آپ کے خواب کے مطابق اونٹ کا بال منگوایا گیا ہے۔ تا کہ بچے کی ناک اس سے چھید دی جائے۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ میں تو ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔ پھوپھی صاحبہ نے کہا کہ بھائی جان (میرے والد صاحب) فرماتے تھے کہ کوئی ہرج نہیں ہے۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ یہ سب مشرکانہ باتیں ہیں۔ میں ایسا کرنے کی ہرگز اجازت نہ دوں گی۔ میرے بچے کو اگر اللہ تعالیٰ زندگی دیگا۔ تو بچ رہے گا۔ میں اپنا ایمان ہرگز ضائع نہیں کروں گی۔ چنانچہ اونٹ کا بال اور چراغ دونوں پھینک دیئے گئے اور میری والدہ نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے اپنا ایمان پھر محفوظ رکھا۔

جے دیوی نے کافی لمبی عمر پائی۔ لیکن بیچاری کی زندگی مصیبت میں ہی گزری۔ لوگوں نے چڑیل مشہور کر رکھا تھا۔ اس لیے اکثر لوگ اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جب وہ ضعیف ہو گئی۔ تو کھانے پینے کو بھی محتاج ہو گئی اور کوئی شخص حتی الوسع اُس کے نزدیک نہیں جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اُس کی آخری بیماری میں اُسے پانی پلانے والا بھی کوئی نہیں ملتا تھا اور وہ کچھ دن بہت تکلیف اور کرب کی حالت میں پڑی رہی۔ آخر تنگ آ کر اُس نے اپنی چارپائی کو آگ لگا دی اور اُسی آگ میں جل کر مرگئی۔

یہ ساری روشنی حیدرؔ ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جو نور خاک میں ہے

رباعیات امیر خسرو اور صبا اکبر آبادی

نوٹ: صبا اکبر آبادی کلاسیکی غزل کی روایت کا ایک اہم نام ہے۔غزل کے علاوہ صبا صاحب کا شمار جدید مرثیہ کے بانی شعراء میں بھی ہوتا ہے۔انہوں نے اپنی بہتر (۷۲) برس کی ادبی زندگی لفظوں کے مکانوں میں گزاری ہے اور کوئی صنفِ ادب ایسی نہیں ہے جہاں اُن کے قلم نے فکر وخیال کی رنگینیوں کے نقوش نہ چھوڑے ہوں۔غالب کے مکمل دیوان کی تضمین اور تمام فارسی رباعیات کے اردو رباعی میں ترجمہ کے تذکرے کے ساتھ ''جدید ادب'' شمارہ ۸ میں اپنے قارئین کو یہ بھی بتا چکے ہیں کہ صبا صاحب کو یہ اولیت بھی حاصل ہے کہ انہوں نے عمر خیام کی بارہ سو رباعیات کا رباعی میں ترجمہ کیا ہے اور غالباً امیر خسروؒ کی بھی تمام فارسی رباعیات کو اردو رباعی میں منتقل کرنے والے وہ پہلے شاعر ہیں، اِس مرتبہ ہم امیر خسروؒ کی چند فارسی رباعیات کے ساتھ صبا صاحب کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔۔۔(**نذر خلیق**)

یارب کہ امان نہ آب وگل دہ مارا   توبہ زنگاران چگل دہ مارا
درعالم بیدلی نما رہ وانگاہ   چون دل برود ز دست دل دہ مارا   **امیر خسرو**

توفیقِ پناہِ آب وگل دے یارب   یا حسن کا قربِ مستقل دے یارب
مایوسی میں اک راہ دکھا، اس کے بعد   قابو میں رہے دل وہ دل دے یارب   **صبا اکبر آبادی**

اے آنکہ شدہ طفیلت آدم پیدا   گشت از سببِ تو چرخِ اعظم پیدا
نور تو نگنجید چو در یک عالم   بہر تو خدا، کرد دو عالم پیدا   **امیر خسرو**

صدقے میں ترے ہوئے تھے آدم پیدا   ہے تیرے سبب سے چرخِ اعظم پیدا
جب نور سمایا نہ ترا عالم میں   اِس واسطے کردیئے دو عالم پیدا   **صبا اکبر آبادی**

شیخی بحق نظام الدین شد مارا   گنجور خداست عالم بالا را
صاحبِ قدمیست ہر مریدش کہ کند   بر کشتیءکفش عبرہ نہ دریا را   **امیر خسرو**

جب شیخ نظام دین خدا نے بخشا   پھر ہوگیا کونین پہ قبضہ اپنا
ہے اِن کے مریدوں کو یہ طاقت حاصل   صحرا کی طرح سے پار کرلیں دریا   **صبا اکبر آبادی**

ڈاکٹر جمیل جالبی (کراچی)

غالبؔ اور صباؔ ہم کلام

اب تو ہواؤں کا رخ بدل گیا ہے۔ایک زمانہ تھا جب فارسی زبان ہمارا اوڑھنا بچھونا تھی۔بچوں کی تعلیم کا آغاز، جیک اینڈ جل وینٹ اپ ٹو دی ہل، کے بجائے گلستان، بوستان سے ہوتا تھا۔لوگ شوق سے فارسی پڑھتے تھے۔فارسی اشعار اور فارسی ضرب المثال چشمۂ شیریں کی طرح زبان پر رواں تھیں۔برصغیر پاک و ہند کی مسلم تاریخ اور کم وبیش ساری علمی وادبی میراث اِسی زبان میں محفوظ تھی اور آج بھی محفوظ ہے۔لیکن فارسی زبان کے عدم رواج نے اِس میراث کو ہمارے لئے بے معنی بنا دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم آج اپنی تاریخ کی صحیح ترجمانی سے قاصر ہیں۔جو انگریزوں نے لکھ دیا ہمارے لئے مُستند ہو گیا اور آج اُنہیں حوالوں سے ہم اپنی تاریخ کو پہچانتے ہیں اور اُسے بے مایہ وحقیر جانتے ہیں۔اِسی وجہ سے ہمیں اپنی چیزیں کم تر اور اپنی میراث بے وقعت نظر آتی ہے۔غور کیجئے کہ اٹھارہویں عیسوی تک ہمارا جو کچھ ادبی، علمی، تہذیبی وتاریخی سرمایہ تھا وہ زیادہ تر فارسی میں تھا اور آج ہم فارسی زبان سے کم وبیش ناواقف ہیں ماضی سے ہمارا رشتہ کمزور ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے ہماری جڑیں کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہیں۔یہی صورتحال رہی تو مجھے یقین ہے کہ ہم اسی طرح تیسرے بلکہ چوتھے درجے کی قوم بن کر رہِ حیات کو طے کرتے رہیں گے۔بہرحال جب میری قوم نے طے کرلیا ہے کہ اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی میراث کو ترک کر کے بیرونی تہذیب کو اپنائے گی تو پھر میں اور آپ کیا کر سکتے ہیں۔ہم تو زیادہ سے زیادہ بقول اکبؔر......

نیک وبد حصور کو سمجھائے جاتے ہیں۔

حضرت صباؔ اکبر آبادی کو بھی میری طرح یہی خلش تھی اور اسی لئے انہوں نے غالبؔ کی فارسی رُباعیوں کا اردو ترجمہ کیا تاکہ بند چشمے کا منہ کھول دیں اور اہلِ ذوق کی تشنگی دور کرنے کا سامان مہیا کر دیں۔غالبؔ ہمارا عظیم شاعر ہے۔ایک ایسا شاعر جو مسلم تہذیب کی علامت بن گیا ہے وہ آج بھی ہمارا ایسا شاعر ہے جو مختلف موڑوں پر، زندگی کے مختلف تجربات کے دوراہوں پر ہمارے جذبات واحساسات کی ترجمانی کر کے ہمیں تازہ دم کر دیتا ہے۔غالبؔ کا اردو کلام بلاشبہ لافانی ہے لیکن اُس کا فارسی کلام بھی اردو کی طرح لافانی اور بے مثل ہے۔اُس کا اپنا لہجہ اور اُس کا اپنا رس ہے لیکن ہم فارسی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر اس سے لطف اٹھانے کی اہلیت ہی گنوا بیٹھے ہیں۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے علمی، ادبی، تہذیبی وتاریخی سرمائے کو اردو میں منتقل کریں تاکہ بند قلعے کا

دروازہ کھل جائے اور ہم اپنے ماضی کی میراث سے اپنا حقیقی تہذیبی رشتہ قائم کر سکیں۔ حضرت صباؔ اکبر آبادی نے کئی سال پہلے عمر خیامؔ کی رباعیات کا اردو ترجمہ کیا تھا اور ایسا کیا تھا کہ ترجمہ سُن کر روح کی کلی کھل اٹھتی تھی اور اب غالبؔ کی رباعیات کا اردو ترجمہ کر کے ایک اہم اور وقیع کام کیا ہے۔ ترجموں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ صباؔ صرف غالبؔ کے غالبؔ کی شاعری کے رس، غالبؔ کی فکری لطافتوں کے راز داں ہی نہیں ہیں بلکہ انہیں اُردو زبان، اُس کے اسالیب اس کے مختلف لہجوں اور اظہار و بیان پر پوری قدرت بھی حاصل ہے۔ یہ کام ہمارے دور میں حضرت صباؔ اکبر آبادی ہی کر سکتے تھے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ کام انہوں نے ہی کیا ہے۔ صباؔ اکبر آبادی صاحب نے غالبؔ کی فارسی رباعیات اور اپنے ترجموں کو ساتھ ساتھ شائع کیا ہے اور اہلِ نظر دیکھ سکتے ہیں کہ ان ترجموں میں وہ تخلیقی شان موجود ہے جو غالبؔ کی فارسی رباعیوں میں نظر آتی ہے۔ یہ کام کر کے انہوں نے فارسی کے غالب کو ہماری تہذیب کے آنگن میں لا کھڑا کیا ہے اور اس موقع پر اگر میں حضرت صباؔ سے یہ فرمائش بھی کر بیٹھوں تو بے جا نہ ہوگا۔

حضرت صباؔ کے بعد فارسی کا چلن ہمارے دور میں بہت کم ہو گیا ہے۔ آنے والے زمانوں میں یہ چلن اور کم ہو جائے گا۔ اس لئے اگر آپ غالبؔ کی فارسی غزلوں کا اردو میں ترجمہ کر دیں تو نہ صرف اردو زبان پر احسان ہوگا بلکہ ہماری تہذیب کے چمن میں بہار آ جائے گی۔

یہ بہت بڑا کام ہے لیکن ہمارے ملک میں اس کام کو صباؔ صاحب ہی کر سکتے ہیں۔ غالبؔ نے خود کہا تھا۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

آپ خود سوچئے کہ جب غالبؔ کا اردو کلام جسے اس نے ''بے رنگِ من است'' کہا ہے اتنا بول رہا ہے تو وہ فارسی کلام جسے غالبؔ نے ''نقش ہائے رنگ رنگ'' کہا ہے ہماری تہذیبی زندگی میں کیسے کیسے نئے رنگ کھولے گا۔

حضرت غالبؔ بھی جناب صباؔ سے اس رباعی میں شاید یہی کہہ رہے ہیں۔

مائل بہ کرم عالم ایجاد رہے
شاید مرا غم خانہ بھی آباد رہے
مجھ سے تو وہی مطربِ خوش خو اچھا
جو دوسروں کے گیت پہ دل شاد رہے

اب دو چار رباعیاں اور سن لیجئے اور اندازہ کیجئے کہ حضرت صباؔ نے کیسا خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔

شب کیا ہے سویدائے دل اہلِ کمال
بڑھ جاتا ہے اور حُسنِ زلف و خط و خال
معراجِ رسول ﷺ بھی ہوئی تھی شب میں
اس سے بہتر نہیں تھا کوئی ہنگام وصال

اِک روز شراب چھوڑنا ہے غالبؔ
پھر ساقی کے ہاتھ جوڑنا ہے غالبؔ
کیا فائدہ یہ ہوائی توبہ کرکے
رُخ دونوں طرف جو موڑنا ہے غالبؔ

کیا موت سے خوف جاں ستانی ہے مجھے
یہ موت حیاتِ جاودانی ہے مجھے
خود سوزِ حیات سے پھُنکا جاتا ہوں
خود موت سے تلخ زندگانی ہے مجھے
افلاس کے عالم میں ہوئی تلخ حیات
طاعت بھی نہیں ہوتی بہ اُمیدِ نجات
اے کاش نماز اور روزہ ہوتے
مشروط بہ مال جیسے حج اور زکواۃ

غالبؔ تیرا سخن میں ہمسر تو نہیں
پھر بھی تو حدِ ہوش سے باہر تو نہیں
مے چاہتا ہے نفیس اور بے حد
یہ پیر مغاں ساقیِ کوثر تو نہیں

شادی جو کرے گا ہوگا دانا کیسے
افکار سے پھر جان بچانا کیسے
گھر ساری خدائی میں ہے، گھر والی نہیں
پھر میرا خدا ہو نہ توانا کیسے

ان رباعیات کو پڑھنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اگر غالبؔ بھی اپنی رباعیات کا ترجمہ کرتے تو ویسا ہی کرتے جیسا صباؔ صاحب نے کیا ہے۔

احمد ہمیش (کراچی)

سنا فسانۂ ہستی تو......

بہار کے دنوں کی ایک شام تھی
گلی کے موڑ سے گزر رہی تھی زندگی
تو کیا دیکھتے ہیں کہ گل مہر کے جھرمٹ میں
نصف جھلک دیتی اور نصف چھپ جاتی
ایک حُسن بخش وتاب ناک لڑکی
گرد و پیش سے بے نیاز
ہاتھوں میں کوئی کتاب تھامے پڑھتی ہوئی
محبتوں کے شعلہ رنگ خواب میں رچی بسی
اور ابھی دمک رہی تھی جھٹ پٹے کی روشنی
یعنی گزرتے ہوئے دن کی دھوپ رنگ روشنی باقی تھی
اور عجیب بات کہ شاعری کی اس گزرگاہ پر
میرے سوا کوئی نہیں گزر رہا تھا
چہل پہل تو سرے سے تھی ہی نہیں
تبھی میری نظر اس مکان پر پڑی
جس کے طویل صحن کی باڑ کو
گُل مہر کی شعلہ رنگی نے
نصف ڈھانپ رکھا تھا
گویا دو آتشہ سماں ایک عجیب منظر بنا رہا تھا
اور درونِ منظر وہ لڑکی
صحن کے سبزہ پر خراماں قدم تھی
ایسے میں صرف ایک پل اس نے مجھے اور میں نے
اسے
دھیان کے کسی نامعلوم حصہ میں دیکھا
مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گہری ہوتی ہوئی شام کا حصہ
بننے
شائد مکان کے بھیتر چلی گئی
اور شام تھی کہ حسرتوں کے موڑ پر ہی ڈھل گئی
طلب کی جانکنی لئے اندھیری رات آ گئی
اندھیری رات نے مجھ سے پوچھا
کون ہو تم
میں نے کہا......میں
اُس نے کہا......مت کہو کہ......میں
اس ''میں'' نے ہی تمہیں غالب کی طرح ڈبو دیا
''ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا''
اور غالب سے پہلے شیکسپیر نے کہا تھا
To be or not to be
that is the question
پھر یوں ہوا کہ عورت کے اعضا سے شائد
زمین پر
موسموں کے ماہ و سال اور
رات و دن کے کارواں گزرتے رہے
اور ان کے درمیان زلزلے آئے تو
آدمی سے کہنے لگے کہ یہ تم ہی ہو اور تمہاری فتنہ
سامانیاں
سیلاب آئے تو آدمی سے کہنے لگے

کہ یہ تم ہی ہو
یا ہزاروں سال سے بہتے آئے مظلومین کی آنکھوں
کے آنسو ہیں
کون کس پر الزام رکھے کون کسے دوشی ٹھہرائے!
کس نے کہا، کس سے کہا، کس نے سنا!
آواز نے آواز کو پکارا
یا آواز تھی ہی نہیں
کوئی سماعت تھی ہی نہیں
آخر میر صاحب اور ان کے آئینہ خانہ دل پر کیا گزری!
منہ کہاں تھا اور دیواریں کہاں تھیں!
پھر کبھی زمین پر
بہار کے دنوں کی شام تو ہوئی نہیں

احمد ہمیش

شائد یہ نظم ہے

زندگی دروازہ پر کھڑی ہونے والی امید
مگر کس کی راہ دیکھ رہی ہے!
اس ابھاگن زندگی میں
جسے آنا تھا یا جو آ سکتا تھا
وہ آیا بھی یا نہیں! یہ معلوم نہیں
معلوم ہوا کہ ہوا میں پھیلتے دھوئیں نے
میرے خلاف ایک تحریر لکھی ہے کہ ہمیش کو مٹا دو
معلوم ہوا کہ محبت سے بنا ہوا کچھ بھی تو مجھے راس نہیں
آیا
اور نفرت نے میرے خلاف آگ جلانے کے سوا کچھ
بھی نہیں کیا
گویا اتنی زندگی گزر گئی
مگر نیند اور بے داری کے درمیان
اندھیرے سے رونے کا ڈھنگ سیکھا جا سکتا تھا
سمندر چاہتا تو پانیوں پر چلنے کا ڈھنگ سکھا سکتا تھا
اور پاگلوں سے ہنسنے کا ڈھنگ سیکھا جا سکتا تھا
تو اب کیا کِیا جا سکتا ہے!
ٹھہرو ہمیش
رات اگر دن کے خلاف بول رہی ہو تو اسے بولنے دو
شائد اس طرح زمین بھر کا غلط موسم بدل جائے

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

خاورِ مشرق۔۔خاور اعجاز

مَیں کب سے خاور کو جانتا ہوں مجھے پتہ نہیں۔کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے گلاب کا پھول پہلی مرتبہ کب دیکھا تھا؟ اگر آپ بتا دیں تو میں بھی بتا دوں گا کہ خاور اعجاز کو مَیں کس روز سے یا کب سے جانتا ہوں۔ مجھے تو اتنا یاد ہے کہ میری کسی کتاب کی تقریب میں اس نے میرے لیے ایک خوبصورت نظم لکھی تھی ویسی ہی خوبصورت نظم جیسا خوبصورت وہ خود ہے۔تب مجھے محسوس ہوا وہ میرا کچھ لگتا ہے۔تب میں نے اسے پہلی مرتبہ غور سے دیکھا اور اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں دوستی کی روشنی مجھے اپنے اندر کہیں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔شاید یہ آج سے کوئی بیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ہاں میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کا میرا تعلق براہِ راست ہوا کسی اور دوست کے وسیلے سے نہیں۔ پھر کبھی کبھی ہم ایک دوسرے سے ٹیلیفون پر لمبی لمبی باتیں کرنے لگے۔ابھی کچھ عرصہ پہلے مجھے محسوس ہوا کہ خاور اعجاز میرا بہت قریبی اور قابلِ اعتماد دوست ہے حالانکہ وہ میرے ادبی نظریات اور اعتقادی اختلافات کو بھی جانتا ہے، حالانکہ اس دوران اس نے داڑھی بھی بڑھالی ہے جو مجھے اس کے چہرے پر سجتی ہوئی نظر آتی ہے۔ پھر بھی میں اسے اتنا جان گیا ہوں کہ وہ میری سب آوارہ خرامیوں کے باوجود میرا قابلِ اعتماد دوست ہے۔میں سمجھتا ہوں قابلِ اعتماد ہونا اس کی اخلاقیات کا حصہ ہے۔معقولیت اس کے مزاج میں داخل ہے۔ مجھے نہیں معلوم وہ معروف معنوں میں کوئی نیک آدمی ہے یا نہیں اور نہ مجھے اس کی کبھی خواہش ہوئی ہے کہ خاور اعجاز یا میرا کوئی دوست نیک آدمی ہو، میرے لیے بس اس کا شریف آدمی ہونا بہت کافی ہے سو خاور اعجاز شریف آدمی ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مگر خاور اعجاز ایسا آدمی ہے جس کو انسان ہونا ہی نہیں ایک اچھا انسان ہونا بھی میسر ہے اور ایں سعادت بزورِ بازو نیست کہ اس میں عنایتِ الٰہی کا دخل زیادہ ہے۔سو میں خاور اعجاز کے بارے میں یہ جانتا ہوں کہ وہ اسلام کی شاندار تعلیمات کا پیروکار ہے اس لیے اچھا انسان ہے۔بحیثیت دوست وہ کیسا ہے؟ قابلِ اعتماد، راز دار، لحاظ دار، گفتگو اور برتاووں کی سمجھ رکھنے والا ، دوستوں کے کام آنے والا ، عمر اور منصب کا لحاظ رکھنے والا ، اپنے آپے میں رہنے والا ، دوستوں کو غور سے سننے والا اور ان کی خامیوں کو برداشت کرنے والا ، دوستیاں نبھانے والا ، صبر و سکون سے رہنے والا ، اپنی اور دوسروں کی شخصیت کا خیال رکھنے والا، متحمل مزاج مگر گرم جوش، فعال مگر دھیما، بہت متوجہ مگر سنبھلا ہوا۔بحیثیت مجموعی اس میں دوست بننے کی سب صلاحیتیں موجود ہیں۔میں نے اچھا انسان ہونے کو اچھا دوست بننے کے لائق قرار دیا تھا، ذاتی طور پر میرے دو معیار اور بھی ہیں کہ اچھا شاعر ہو، اچھا ادیب ہو یا اچھی گفتگو کرنے کی سمجھ رکھتا ہو۔خاور اعجاز میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔

اس کی دوستی اگرچہ پکی ہے مگر شاید ابھی مجلسی ہے اور مجلسوں میں تو آدمی سوٹ اور ٹائی کے ساتھ آتا ہے اور بڑے رکھ رکھاؤ بگھارتا ہے، سو ہم دونوں ابھی تک ایک دوسرے سے بڑے رکھ رکھاؤ، بڑی محبت بلکہ شفقت سے پیش آ رہے ہیں۔وہ بھی محتاط ہے میں بھی محتاط۔وہ بھی مجھے جی جناب کہنے پر تُلا ہوا ہے میں بھی اسے پیار پوچہ دینے والا۔وہ میری طرف متوجہ میں اس کی طرف ہمہ تن گوش۔وہ میری طرف خوش اخلاق میں اس کی طرف۔لیکن میں یہ جان گیا ہوں کہ یہ سب باتیں اس کی عادتیں ہیں اور ابھی میں اس کی عادتوں کے خول توڑ کر اس کے اندر داخل نہیں ہو سکا، یہ میری کوتاہی ہے حالانکہ ان معاملات میں مَیں بہت جلد باز ہوں، یقین نہ آئے تو منشا یاد سے پوچھ لیں پھر بھی اعتبار نہ آئے تو آغا جی سے معلوم کر لیں۔اصل میں خاور اعجاز عادتوں کا اتنا سفید پوش ہے کہ میں ابھی تک اسے اپنے گندے مندے ہاتھ نہیں لگا سکا۔اب آپ نے یاد دلایا تو یاد آیا کہ مجھے اس پر کیچڑ بھرا پانی نہ سہی تھوڑا سا پانی پھینک کر تو دیکھنا چاہیے کہ وہ آگے سے کیا کرتا ہے لیکن میرا اندازہ ہے وہ اپنی عادت کے مطابق اپنی گول گول آنکھیں پوری کی پوری کھول کر مجھے دیکھے گا اور زیادہ سے زیادہ یہ کہے گا ''حمیدی صاحب یہ کیا۔۔اب میں دفتر کیسے جاؤں گا'' مَیں نے ابھی تک اسے غصے میں نہیں دیکھا۔ مجھے لگتا ہے کسی نے شاید ہی دیکھا ہو۔جس نے مرحوم ڈاکٹر بشیر سیفی سے دوستی پوری کی پوری نبھا دی ہو وہ بھلا غصے میں کب آیا ہو گا۔ مجھے ایسا لگتا ہے اس کا حلقہ احباب تو کس قدر وسیع ہے مگر وہ جو دوستی کا رشتہ ہوتا ہے وہ کہیں کہیں ہے اور میرا خیال ہے ایسا اس نے دانستہ کر رکھا ہے ورنہ جو شخص پیارے بشیر سیفی سے دوستی نبھا سکتا ہے اس میں نبھانے کی قوت کم کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ صلاحیت بلکہ یہ کارنامہ ہم دونوں نے کر رکھا ہے۔ڈاکٹر بشیر سیفی شوگر کوٹڈ دوائیوں کے برعکس تھا۔اس کے اوپر کڑواہٹ تھی اور نیچے مٹھاس ہی مٹھاس۔بس اوپر کی کڑواہٹ کو جو کوئی برداشت کر لیتا وہ اس بحرِ شیریں تک پہنچ سکتا تھا جو دوسرے کو اپنے آپ میں جذب کر لینے کی مقناطیسی قوت رکھتا تھا۔ یہ کام خاور اعجاز نے اور میں نے دونوں نے کر لیا تھا۔مجھ سے زیادہ خاور اعجاز نے جس سے ظاہر ہوتا ہے خاور اعجاز میں تلخیاں برداشت کرنے کی قوت عام لوگوں سے کہیں زیادہ ہے یا پھر اس میں زندگی کی شیرینیوں تک پہنچنے کی حوصلہ مندی زیادہ ہے۔

اب تک اس کی جو عادتیں میں نے دیکھی ہیں وہ ہیں محتاط، حوصلہ مند، سکیمیں بنانے والا، متواضع، گفتگو میں احتیاط کے باوجود اختلاف کرنے والا مگر اس پر اڑ جانے والا نہیں، دوستوں کے حلقے کو وسیع رکھے والا، نظریات کو سر نہ چڑھانے والا بلکہ انسان کو سر آنکھوں پر بٹھانے والا۔ میں اپنا اور اس کا موازنہ کرتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ میری اس کی عادتیں تقریباً نہیں ملتیں مگر پھر بھی اس نے مجھ پر محبت اور دوستی کی کمند ڈال رکھی ہے جس میں بخوشی گرفتار ہوں۔اصل میں اسے دوست بنانے کی عادت ہے اور میں تو ایسے لوگوں کو ڈھونڈتا ہوں جو مجھے کمند ڈال کر پکڑ لیں اور اپنا گرفتار کر لیں، سو خاور اعجاز نے مجھے کمند پھینک کر گرفتار کر رکھا ہے۔ پتہ نہیں سوچ کر یا بلا سوچے، اگر سوچتا تو مجھ ایسے پر کمند کیوں ڈالتا۔خاور اعجاز ! کیا تمہیں پتہ ہے کہ تم نے کمند کس پر ڈال رکھی ہے؟؟ شاید نہیں۔۔مگر شاید ہاں!! ہاں اس لیے کہ وہ آنکھیں بند کر کے کوئی کام نہیں کرتا۔یقیناً یہ کمند بھی اس نے آنکھیں کھول کر ڈال رکھی ہے اور اس سے مجھے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ایک خوبصورت، دوستوں کو اور خصوصاً مجھ ایسے کو برداشت کر لینے والے، ذہین شاعر اور قابلِ اعتماد ہاتھوں نے مجھ پر کمند ڈالی ہے۔میں اس کمند کو اپنا زیور سمجھتا ہوں اور وجہِ عزت۔

کسی نے کہا تھا کہ جب کوئی چیز آنکھوں سے ذرا دور ہوتی ہے تو اس کی کشش کا اصل اندازہ ہوتا ہے۔ گذشتہ تین برس سے وہ دفتری تبادلے میں بڑا بینک افسر بن کر پنڈی سے ملتان چلا گیا ہے۔ تب سے مجھے کہیں اندر سے کسی خلا کا احساس ہونے لگا ہے۔ کسی کمی کا احساس جیسے میری کوئی قیمتی چیز مجھ سے دور ہو گئی ہے جو میری رسائی میں تو ہے مگر ذرا مشکل رسائی میں۔ وہ پنڈی میں تھا تو دل کو ڈھارس سی رہتی تھی۔ اب جیسے پنڈی شہر میں بہت بڑا گھاؤ پڑ گیا ہے۔ یوں تو پنڈی میں اور دوست بھی ہیں لیکن خاور اعجاز نہیں ہے جس سے میں دو دو گھنٹے ٹیلیفون پر گپ کر سکوں اور پھر بھی جی سیر نہ ہو۔ گو اب بھی ہمارا ٹیلیفون پر یا ڈاک سے رابطہ بحال ہے مگر پھر بھی جیسے یہ رابطہ، رابطہ سا ہے۔ رابطہ نہیں ہے! خاور اعجاز کیا تم جلد واپس نہیں آ سکتے؟ تمہارے بغیر میں اداس ہو گیا ہوں!!

خاور کی غزل بہتر سے بہتر یعنی خوب سے خوب تر کے مراحل سے گزر رہی ہے، اس کی غزل کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اشعار میں اس کی ذہانت بار بار متوجہ کرتی ہے۔ وہ دل سے زیادہ دماغ سے شعر کہتا ہے مگر تھوڑی سی آنچ دل کی بھی دیتا ہے۔ اس کی غزل پر لطف ہے ایک ذہین شاعر کی تخلیق۔ مجھے معلوم ہے وہ کوفہ و بصرہ یا قرطبہ کا باسی نہیں پاکستان کا شہری ہے اور باشعور شہری ہے اور اس کا اظہار اس کی غزل سے ہوتا ہے۔ وہ اکیسویں صدی کا کمپیوٹر چلانے والا ''آج'' کا آدمی ہے اور اس کا اظہار بھی اس کی غزل میں ہوتا ہے جو لطف دیتا ہے اور اس کی ذہانت کا غماز ہے اور یہ باتیں کچھ کم نہیں ہیں۔ وہ گھر کے صحن میں بیٹھ کر ہی نہیں گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی غزل کہتا ہے۔ اس میں صفِ اول کی غزل کہنے کی پوری صلاحیت ہے۔ آج لکھی جانے والی غزلوں کے ہجوم میں بھی اس کی غزل اپنی پہچان کروا رہی ہے۔ اگر میں اس کی غزل کو ایک لفظ میں بیان کرنا چاہوں تو وہ لفظ ہو گا۔۔۔ ذہانت۔ اور میں سمجھتا ہوں یہی وہ قرینہ ہے جس سے بڑی غزل کا آبِ حیات ٹپکتا ہے۔ اس کی شاعری اس کی شخصیت کی آئینہ دار ہے اور یہ وہ خوبی ہے جو اوریجنل شاعروں میں ہوتی ہے ورنہ اکثر تو محض مضمون آفرینی سے ہی کام چلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک مضمون پیدا کرنا ہی بڑا کام ہے خواہ وہ مضمون ان کی شخصیت، ان کے مزاج، ان کے نظریات سے لگا کھاتا ہو یا نہ کھاتا ہو۔ خاور اعجاز کی شاعری اس کی شخصیت کی تصویریں پیش کرتی ہے اور ہم اس کی شاعری کے آئینے میں خود اسے جلوہ گر دیکھ سکتے ہیں، اس کے خد و خال سمیت۔ میں سمجھتا ہوں یہ معمولی بات نہیں ہے، یہ خوبی بھی فی زمانہ بہت کم ہے جو خاور کی غزل میں موجود ہے۔ شاعری میں غزل، نظم، ہائیکو پر خصوصاً اسے پوری طرح دسترس حاصل ہے۔ ابھی ابھی اس کی غزل کا نیا مجموعہ آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے کائنات کی گھمبیر اسراریت میں ایک بڑی جست لگائی ہے اور اس بے کنار جہانِ اسرار کے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس پراسرار دنیا کی سیاحت کرتے ہوئے بھی اس کی شخصیت اپنے پورے وجود کے ساتھ دکھائی دے رہی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو کائنات کی طلسمی اسراریت میں گم نہیں ہونے دیا بلکہ وہ اپنی روشن، چمکدار آنکھوں اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کی شخصیت اس طلسماتی پراسرا کائنات میں گم ہونے والی نہیں ہے! بڑی چیزیں چھوٹی چیزوں میں مدغم کیسے ہو سکتی ہیں!! میں بھی یہی چاہتا ہوں وہ جہاں بھی ہو مجھے نظر آتا رہے تاکہ میں اسے دیکھ دیکھ کر اپنے دل و دماغ کو روشن رکھ سکوں!!!

انجلاء ہمیش (کراچی)

کربِ آگہی

پھر وہی آواز وہی انداز
جیسے ابھی کوئی کہے گا ''تم میری روشنی ہو''
وہی آواز
جو دل میں اترتی ہے یا سانسوں کو روکتی ہے
وہی آواز
جس نے محبت سے نفرت کرنا سکھایا
جس نے باور کرایا کہ جسم کی تو کوئی حقیقت ہی نہیں
آدمی سے آدمی کا تعلق کبھی بھی بے معانی ہو سکتا ہے
تب کسی بیتے ہوئے بکھرے لمحے میں دی گئی آواز ڈوب جاتی ہے
مگر اب کی بار آواز سے آواز تک کے سفر نے جو نام پکارا
تو معلوم ہوا کہ من میں کہیں ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ٹکڑا رہ گیا تھا
جواب، اُس آواز کی لے پہ بار بار چبھتا ہے

حیدر قریشی (جرمنی)

روح اور جسم

برادرم نذر خلیق نے مجھے ایک الجھن میں ڈال دیا ہے۔انہوں نے میری دوسری تحریروں کے بعض مندرجات سے عمومی طور پراور یادوں کی قسط ''رہے نام اللہ کا!'' سے خصوصی طور پر اخذ کر کے استفسار کیا ہے کہ میں جب روحانیت کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری کیا مراد ہوتی ہے؟اور ان کا اصرار ہے کہ میں اس کا جواب کسی مضمون میں یا پھر یادوں کی کسی قسط میں ہی لکھ دوں ۔ یہ بیک وقت بہت ہی آسان اور بہت ہی مشکل سوال ہے۔سو اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق مختصر ترین عرض کرتا ہوں کہ انسانی روح جب اپنے اصل مالک وخالق کی جستجو کا سفر کرتی ہے تو یہ سفر روحانیت کہلاتا ہے۔خالقِ کائنات روحِ اعظم ہے۔ہم سب اسی کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف ہم سب نے لوٹ کر جانا ہے۔کسی کی وفات پر **انا للہ و انا الیہ راجعون** کہتے ہوئے ہم دراصل اسی حقیقت کا اقرار کر رہے ہوتے ہیں۔

اُسی کے پاس تو جانا ہے لَوٹ کر آخر
سو خوب گھومیئے ، پھریئے ، رجوع سے پہلے

پیغمبرانِ الٰہی کی روحانیت ایک الگ مقام ومرتبہ ہے،اولیا وصوفیا کی روحانیت کے بھی اپنے اپنے مدارج ہیں۔ان سے ہٹ کر کوئی عام انسان اگر سچی لگن کے ساتھ خدا کی جستجو کرتا ہے،تو اس کی یہ جستجو ہی اس کی روحانیت ہے،اس میں وہ جتنی ترقی کرتا جائے گا،اتنا ہی روحانی طور پر آگے بڑھتا جائے گا۔روحانی مدارج طے کرنے کے لئے مختلف مذاہب کے ہاں مختلف طریقے ملتے ہیں۔میرا خیال ہے کہ طریق کار کوئی بھی اختیار کیا جائے،اصل چیز یہ ہے کہ انسان کی جستجو اور لگن سچی ہو۔اگر جستجو اور لگن واقعی سچی ہو تو خدا خود متلاشی کے ظرف کے مطابق اس تک پہنچ جاتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ اس پر منکشف ہو جاتا ہے۔جب کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کا رستہ صرف اسی کے پاس ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اپنی سوجھ بوجھ کے خدا کو اپنی جیب میں ڈال رکھا ہے یا کسی تجوری میں بند کر رکھا ہے اور یوں وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ صرف وہی ہے۔خدا کا عرفان کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔وہ لامحدود ہے اور ہم لوگ اس کی پوری معرفت حاصل کر ہی نہیں سکتے۔جس خدا کا عرفان مکمل طور پر حاصل ہو جائے وہ خدا لامحدود نہیں رہتا۔میری دانست میں تنہائی،یکسوئی وارتکاز کے نتیجہ میں روح بہتر طور پر اپنی اصل منزل کی طرف سفر کر سکتی ہے،اسی لئے بیشتر بڑی روحانی شخصیات نے عمر کے ایک حصہ میں اپنے معاشرے سے

الگ ہو کر تنہائی میں اس سفر کو طے کرنے کی کاوش کی۔اسے آپ چلہ کشی کہہ لیں،ریاضت کہہ لیں،تپسّیا کہہ لیں اور چاہے کوئی اور ملتا جلتا نام دے لیں۔ یہ میرے ذاتی خیالات ہیں،ان کا مقصد کسی کی دلآزاری کرنا نہیں ہے۔ہو سکتا ہے میرے کچے پکے روحانی تجربوں کے نتیجہ میں ایسے خیالات ذہن میں آتے ہوں اور جو لوگ مجھ سے بدرجہا بہتر روحانی تجربات سے گزر چکے ہیں،وہ اس معاملہ میں زیادہ اچھے اور درست خیالات رکھتے ہوں۔

معاشرتی سطح پر رہتے ہوئے انسان کو نہ تو مناسب تنہائی میسر ہوتی ہے اور نہ ہی ذہنی یکسوئی۔۔۔ایسے ماحول میں انفرادی ریاضت ومجاہدہ کی بجائے مذاہب کی عبادات کے طریق احسن طور پر خدا کی طرف رہنمائی کرنے میں ممد ہوتے ہیں۔یوں روحانیت کے سفر میں مذہب کی بڑی اہمیت ہے۔تاہم خدا کی جستجو کے روحانی تجربات کا سلسلہ کسی ایک مذہب تک محدود نہیں ہے۔یہ ہر طالب اور متلاشی کی طلب اور تلاش پر منحصر ہوتا ہے۔ یہاں ایک وضاحت کر دوں۔میرے نزدیک کوئی کسی بھی مذہب سے تعلق رکھے،اپنے طریق عبادت کے مطابق خدائے واحد کی عبادت ضرور کرے۔البتہ اپنے ذاتی تجربے کے حوالے سے یہ بتانا چاہوں گا کہ میں جن دنوں میں اسلام سے کچھ دور ہوا تھا ان دنوں میں بھی میری عادت رہی کہ روزے اسلامی طریق کے مطابق رکھتا تھا اور نمازیں بھی اسلامی طریق والی پڑھتا تھا۔اسے بچپن کی عادت کہہ لیں،ماں باپ کی تربیت کا گہرا اثر کہہ لیں یا کچھ اور کہہ لیں۔ایک عرصہ کے بعد کسی حدیث میں یا کسی بزرگ کے فرمان میں پڑھا کہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں،تباہی کے دہانے پر بھی پہنچ جائیں تو خدا انہیں بچا لیتا ہے۔ہو سکتا ہے میری نمازیں ہی مجھے بچا لائی ہوں۔(پتہ نہیں میں بچا بھی ہوں یا نہیں؟)۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب سلیم آغا کی شادی تھی۔بہت سارے ادیب ڈاکٹر وزیر آغا کے گاؤں وزیر کوٹ میں جمع تھے۔رات کو خانپور اور راولپنڈی،اسلام آباد کے ادیبوں کی چارپائیاں ایک ساتھ حویلی کے صحن میں بچھائی گئی تھیں۔اگلے روز کافی دن چڑھے،جب سارے دوست جاگ گئے تو وزیر آغا ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے:میں اپنے معمول کے مطابق فجر کے وقت جاگا اور باہر آیا تو عجیب منظر دیکھا۔

سارے دوست وزیر آغا صاحب سے کوئی حیران کن بات سننے کے منتظر ہوئے تو انہوں نے کہا:
جب میں باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ سارے مسلمان سوئے ہوئے تھے اور ایک غیر مسلم بڑے خشوع وخضوع سے فجر کی نماز پڑھ رہا تھا۔

میں بہت ہی کھلے ذہن اور دل کا شاعر اور ادیب ہوں۔نماز،روزہ میرے مزاج کا حصہ ہیں۔یقیناً والدین کی تربیت کے سبب ہی ایسا ہوا ہے،وگرنہ نمازی ہونے کا ایسا ذکر کرنا اپنے کسی تقویٰ کے اظہار کے لئے نہیں ہے۔کسی انکساری کے بغیر اور پوری ایمانداری سے لکھ رہا ہوں کہ میں قطعاً کوئی متقی نہیں ہوں،بہت ہی گنہگار بندہ ہوں۔اپنے گناہوں کے سبب خدا سے کئی بار مار بھی کھائی ہے۔سو ان عباداتی معاملات کو بچپن کی عادت سمجھیں اور کچھ نہیں۔اپنی اس عادت کی وجہ سے اپنے گھر میں میری اپنے کسی بچے کے ساتھ تلخی ہوتی ہے تو عام طور پر وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ بچہ نمازوں میں سست ہو رہا ہوتا ہے۔

روحانیت کی بات تو ہوگئی لیکن خود روح کیا ہے؟ اس بارے میں دو تصورات پائے جاتے ہیں۔ایک تصور یا عقیدہ کے مطابق حمل ٹھہر جانے کے کچھ عرصہ کے بعد آسمانِ ارواح سے رُوح بچہ میں داخل ہوتی ہے۔جبکہ دوسرے تصور یا عقیدہ کے مطابق رُوح ایک لطیف نُور ہے، یہ نور نطفہ کے اندر ہی موجود ہوتا ہے اور نطفہ کی نشوونما کے ساتھ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔''اسلامی اصول کی فلاسفی'' میں اس پر سیر حاصل بحث موجود ہے اور میرا یہی عقیدہ ہے کہ جسم اور روح لازم وملزوم ہیں۔ علامہ اقبال بھی فلسفیانہ سطح پر اسی تصور کے قائل تھے۔تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں وہ روح اور مادہ کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے اور انسان کو ایک ایسی وحدت قرار دیتے ہیں جس کے اعمال وافعال کا مشاہدہ عالم خارجی کے حوالے سے کیا جائے تو اسے بدن کہیں گے اور جب ان کی حقیقی غرض و غایت اور نصب العین پر نظر رکھی جائے تو اسے روح کہیں گے۔عقیدہ اور فلسفہ سے ہٹ کر سائنس میں کلوننگ کے تجربہ سے اس عقیدہ اور تصوّر کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔روح ہمارے ہر سیل میں سرایت کئے ہوئے ہے۔اس کا مطلب ہے پانی کی طرح روح کے نور کو بھی توڑا نہیں جا سکتا۔ جتنا اسے توڑا جائے گا ہر قطرہ کی طرح روح کے نور کا ہر قطرہ بھی اپنی اصل کی پوری بنیاد کے ساتھ اپنی جگہ موجزن رہے گا۔اب کلوننگ سے جس بات کی تصدیق ہو رہی ہے، ہمارے صوفیائے کرام تو ایک عرصہ سے صوفیانہ سطح پر اسی بات کو قطرہ میں دجلہ اور دجلہ میں قطرہ دیکھنے کی صورت بیان کر چکے ہیں۔ یوں میرے نزدیک جسم اور روح دونوں لازم وملزوم ہیں، موت کے بعد بھی یہ تعلق کسی نہ کسی سطح پر قائم رہتا ہے اور قیامت کے دن ہمیں ہمارے جسم دوبارہ دے دیئے جائیں گے۔اور انہیں جسموں کو ہی جزا، سزا سے گزرنا ہوگا، ظاہر ہے یہ جسم اپنی اپنی روح سمیت ہوں گے۔کلوننگ کے تجربے کا گہرا جائزہ لیا جائے تو قیامت کے دن انہیں جسموں کے ساتھ دوبارہ زندہ کئے جانے کا عقیدہ، عقلی لحاظ سے بھی مزید واضح اور روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔

ان دنوں میں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میری مختلف اصنافِ ادب میں تخلیق کاری کا عمل ایک دوسری اصناف میں کچھ کچھ مدغم ہونے لگا ہے۔مثلاً یادوں کی گزشتہ اور موجودہ قسط میں یادوں کے ساتھ افکار و خیالات کی زیادہ یلغار ہو رہی ہے، یوں یادیں مضمون جیسی صورت اختیار کر رہی ہیں۔اسی طرح میرے آخری تین افسانوں (مسکراہٹ کا عکس، کہانیوں سے بھاگا ہوا کہانی کار اور اپنے وقت سے تھوڑا پہلے) میں یادوں کے گہرے اثرات کہانی کا رُوپ اختیار کر گئے ہیں۔اگرچہ ایسے اثرات میری دوسری کہانیوں اور دیگر تخلیقات میں بھی ہیں لیکن اتنے گہرے نہیں جتنے مذکورہ تین افسانوں میں در آئے ہیں۔اب تو مجھے ایسا لگنے لگا ہے کہ شاید ان یادوں کی یلغار کسی ناول کا روپ اختیار کرنا چاہ رہی ہے۔ایسا ہو جائے تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ناول اور افسانہ فکشن میں شامل ہیں اور فکشن کو تو لغوی معنوں میں ویسے بھی جھوٹ شمار کیا جاتا ہے۔اوپر سے میں نے اپنی پچھلی قسط میں روزمرہ زندگی میں بے ضرر سے جھوٹ بولنے کا اقرار کیا تو ایک دوست کہنے لگے آپ نے تو خود مان لیا کہ آپ جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ مجھ پر طنز کرنے والے دوست فرینکفرٹ میں ٹیکسی چلاتے ہیں اور یہ ایک کھلا راز ہے کہ ہمارے ٹیکسی ڈرائیور احباب قانونی طور پر دو یا چار گھنٹے کی ملازمت کے پیپرز پُر کراتے ہیں اور بارہ بارہ گھنٹے کام

کر کے بلیک منی کماتے ہیں، پھر دو، چار گھنٹے کی ملازمت کی جتنی آمد ظاہر کرتے ہیں، اس کے نتیجہ میں حکومت کے فلاحی قوانین کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت سے مالی امداد بھی وصول کرتے ہیں۔اس سارے ''ایماندارانہ عمل'' کو مکمل کرنے کے لئے دستاویزی طور پر کتنے ہی ''سچ'' لکھ کر یہ سب کچھ کمایا جاتا ہے۔۔۔اب ایسے دوست خود کو سچا سمجھ کر مجھ پر طنز فرما رہے تھے تو ان کے حصے کی شرمندگی بھی مجھے ہی محسوس کرنا پڑی۔ان کے سچ کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا کہ بھائی کیا یہ بذاتِ خود میرا سچ نہیں ہے کہ میں مان رہا ہوں کہ ہم دن میں کئی بار غیر ارادی طور پر اور کسی کو نقصان پہنچائے بغیر بے ضرر سے جھوٹ بول جاتے ہیں؟ کوئی لاکھوں، کروڑوں جھوٹ بولنے والا اگر اپنے جھوٹ کا اعتراف نہ کرے تو کیا وہ محض اس لئے سچا کہلائے گا کہ اس نے اپنے کروڑوں جھوٹ بولنے کا اقرار نہیں کیا؟ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے زمانہ کے فقیہوں اور فریسیوں کو مخاطب کر کے کیا خوب کہا تھا کہ: ''تم مچھروں کو تو چھانتے ہو مگر اونٹوں کو نگل جاتے ہو''

ہمارا اصل المیہ یہ ہے کہ ہم انسان کو انسان کی سطح پر دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔اگر کوئی ہمارا ہیرو ہے تو وہ ہر عیب سے پاک ہے، اس میں کوئی انسانی عیب ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کوئی ہمارے لئے کسی زاویے سے ولن ہے تو اس بد بخت میں کوئی خوبی ہو ہی نہیں سکتی۔خدا اسے جہنم میں بھیجے نہ بھیجے، ہم خود اس کی زندگی کو ضرور جہنم بنا کر رکھ دیں گے۔حالانکہ ہم سب انسان اچھائی اور برائی، نیکی اور خیر کا مجموعہ ہوتے ہیں۔کسی میں شر کے مقابلہ میں خیر کا پلڑا بھاری ہو تو اتنا ہی کافی ہے۔لیکن مذہبی انتہا پسند اتنی سی بات سمجھ لیں تو پھر ان کا کام کیسے چلے۔

میں نے اپنے خاکوں اور یادوں میں جو کچھ لکھا ہے، وہ سب سچ ہے۔بیتا ہوا سچ، دیکھا ہوا سچ یا سنا ہوا سچ اور وہ انکشافی سچ جو کسی تخلیق کار کو نصیب سے ملتا ہے۔اب جو ناول لکھنے کا ارادہ ہے اگر لکھا گیا تو اس میں بھی سارا سچ ہی لکھوں گا۔کہیں مشکل پیش آئی تو زندگی کے بعض حصے نہیں لکھوں گا لیکن جھوٹ نہیں لکھوں گا۔خدا کرے مجھے اب ناول لکھنے کی توفیق مل جائے کیونکہ میں نے کم از کم ایک پورے ناول کی زندگی بسر کر لی ہے۔

پاکستان میں مجھے ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف رہتی تھی۔جرمنی میں آنے کے بعد سے یہ بیماری ایسی غائب ہوئی ہے کہ جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ یہاں زندگی میں بعض انتہائی تکلیف دہ اور بہت زیادہ دکھی کرنے والے سانحات بھی پیش آئے لیکن ہر مرحلہ پر ذہنی وروحانی دکھ کے باوجود میرا بلڈ پریشر بالکل نارمل رہا۔ایک دو مواقع پر شوگر کی مقدار بڑھ گئی تو ڈاکٹر نے فکرمند ہو کر میرا بلڈ پریشر بھی چیک کرنا شروع کیا۔میں نے مسکرا کر ڈاکٹر کو بتایا کہ فشارِ خون کو تو آپ بالکل متوازن پائیں گے۔میری بات درست نکلی تو ڈاکٹر حیرت سے مسکرا دیا۔تب میں نے اس سے کہا کہ مجھے لگتا ہے جب فوت ہو جاؤں گا تب بھی میرا فشارِ خون دیکھا گیا تو اسی طرح نارمل رزلٹ آئے گا۔کچھ عرصہ کے بعد ایک بار امین خیال جی سے یاہو کے میسنجر پر گفتگو ہو رہی تھی۔میں نے انہیں بلڈ پریشر والی ساری بات بتائی تو وہ کہنے لگے بھائی یہ تو نفسِ مطمئنہ کا مقام ہے۔مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔بہت سارے ''یقین'' کے باوجود میں گنہگار تو ابھی تک ''تذبذب'' کے مراحل سے گزرتا رہتا ہوں۔مجھے نفسِ مطمئنہ کی دولت کہاں نصیب ہوئی ہے۔نصیب ہو جائے تو میری زندگی کا مقصد ہی پورا ہو جائے۔بہرحال بلڈ پریشر کے نارمل رہنے کو خدا کا خود

پر بڑا فضل اور احسان سمجھتا ہوں۔اس نے دوسری بیماریوں اور موسمی علالتوں سے بھی کافی حد تک محفوظ رکھا ہوا ہے۔اور میں غالبؔ کے الفاظ میں ''تندرستی ہزار نعمت ہے'' کا مزہ لیتا رہتا ہوں۔

مجھ پر آنے والے تکلیف دہ دنوں میں سے ایک وہ عرصہ تھا جب بے وزن شعری مجموعے رکھنے والوں اور جعلی شاعروں اور ادیبوں نے مل کر میرے خلاف غلیظ مہم شروع کی تھی۔اس تمام عرصہ میں بھی میرا بلڈ پریشر بالکل نارمل رہا۔میرے خلاف مہم چلانے والے اس لائق نہیں کہ میں ان کے ناموں سے اپنی یادوں کے اس سلسلہ کو آلودہ کروں۔ان کا ذکر کسی اور جگہ پر ہی کافی رہے گا لیکن دو شخصیات اس غلیظ کھیل میں ایسی بھی شریک ہوئیں، جن کا صدمہ مجھے آج بھی ہے۔یہ شخصیات تھیں (تب) سویڈن میں مقیم ڈاکٹر پرویز پروازی اور ہالینڈ میں مقیم جمیل الرحمٰن ۔دونوں صاحبان نے میرے جرمنی پہنچنے کے بعد مجھے خود ڈھونڈا اور خود مجھ سے رابطہ کیا۔پرویز پروازی کا میرے بزرگوں سے بھی تعلق رہا تھا اس لئے ان کے معاملہ میں دوستی کے ساتھ احترام کا تعلق بھی تھا۔انہوں نے اس احترام کا کچھ فائدہ اٹھانا چاہا۔میرے ایک شعر پر اعتراض فرما دیا ۔

متن میں آپ کا ہی ذکر چلا آتا ہے   اچھا ہے بچ کے رہیں حاشیہ آرائی سے

ان کا کہنا تھا کہ متن کی ت پر زبر ہے جبکہ میں نے ت کو ساکن باندھا ہے۔میں ان کا اعتراض والا خط پڑھ کر ہی ساکت ہو گیا۔تو آپ ساری زندگی پاکستان سے جاپان تک ت کی زبر کے ساتھ متن پڑھاتے رہے ہیں؟۔میں نے ادب کے ساتھ وضاحت کی تو انہیں احساس ہو گیا کہ وہ غلط تھے، چنانچہ انہوں نے معذرت کر لی لیکن دل سے شاید مجھے معاف نہیں کیا۔چنانچہ پھر انہوں نے ماہیے کی بحث میں غیر ضروری دخل اندازی فرما دی۔میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ کسی مضمون میں یہ سب لکھیں تا کہ بحث آگے چلے۔لیکن انہوں نے مضمون نہیں لکھا۔میرا ذاتی قیاس ہے کہ انہوں نے جاپانی ہائیکو کے حوالے سے جو کام کیا تھا اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔اس کے برعکس تب ماہیے کی بحث کو کئی بڑے ادبی رسائل اہمیت دے رہے تھے۔اور جہاں بھی ماہیے کی بحث چلتی تھی میرا حوالہ آ جاتا تھا۔اسی دوران جنگ لندن کے ادبی صفحہ پر ہائیکو کے حوالے سے ایک مضمون چھپا جس میں پروازی صاحب کے کام کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے ان کا ذکر تک نہ کیا گیا۔پروازی صاحب کا اس پر غصہ کرنا یا دُکھی ہونا بجا تھا لیکن اس میں ماہیا کا کوئی قصور نہیں تھا۔بہر حال تب انہوں نے اپنے ہاتھ سے اپنی حمایت میں ایک جوابی مضمون لکھ کر مجھے بھیج دیا کہ میں اسے اپنی طرف سے جنگ لندن میں چھپوا لوں۔اس باران کی اس ''بے پایاں محبت'' پر میں صرف ساکت نہیں ہوا، مجھے جیسے سکتہ سا ہو گیا۔جی کڑا کر کے ان کے جرمنی میں مقیم ایک شاگرد کو وہ مضمون دے دیا کہ بھائی! چاہو تو استاد کی استادی کا بھرم رکھ لو۔لیکن ان کے اس شاگرد نے بھی پروازی صاحب کا دفاع کرنے والا مضمون استعمال کرنے سے معذرت کر لی اور وہ مضمون مجھے واپس کر دیا۔اسی دوران پرویز پروازی صاحب نے مجھے حمید نسیم کی خود نوشت میں شامل ایک اقتباس بھیجا جس سے زمانی طور پر چراغ حسن حسرت کو اردو ماہیے کا بانی قرار دلوایا جا سکتا تھا۔یہ تحقیقی اور علمی معاملہ تھا۔اس لئے میں نے بالکل ایسا باور نہیں کیا کہ پروازی صاحب یہ اقتباس مجھے کسی دباؤ میں لانے کے لئے بھیج رہے ہیں۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے اس

موضوع پر مزید تحقیق کرنے کا موقعہ مل گیا۔اس تحقیق کے نتائج حمید نسیم کے حوالے کے ساتھ میری کتاب ''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' کے پیش لفظ میں اور میرے بعد کے ایک مضمون ''مرزا (حامد بیگ) صاحب کے جواب میں'' پوری تفصیل سے موجود ہیں۔(اور ابھی تک تحقیقی حوالے سے حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں، تاوقتیکہ کوئی نئی تحقیق انہیں رد نہ کرے) بس میری ان حرکتوں کے بعد پروازی صاحب مجھ سے ایسے خفا ہوئے کہ ان گھٹیا لوگوں کے ساتھ مل کر میرے خلاف نہایت غلیظ مہم کے روحِ رواں بن گئے۔ان کی شخصیت کا یہ رُخ اخلاقی طور پر اتنا افسوسناک تھا کہ میں ابھی تک ان کے حوالے سے اس صدمے سے باہر نہیں آ سکا۔ جسے تہذیب اور اخلاق کا آسمان سمجھا تھا وہ کیا نکلا ۔ تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو!

جمیل الرحمٰن نے جب میرا اتہ پتہ ڈھونڈ کر مجھ سے رابطہ کیا تب انہوں نے ادبی حوالے سے مجھے تعریف بلکہ ادبی عقیدت کی حد تک جو کچھ کہا، اسے درج کرنا مناسب نہیں ہے۔لیکن جب وہ پرویز پروازی کے کہنے پر میرے خلاف غلیظ مہم کے سپاہی بنے تو مجھے دلی صدمہ ہوا۔وہ جس طرح کی حرکتیں ہالینڈ سے لے کر ہندوستان اور پاکستان تک کر آئے تھے، مجھے ساتھ کے ساتھ ان کی رپورٹ مل رہی تھی۔اس مہم کے بعد کئی بار جمیل الرحمٰن کے فون آتے رہے۔میں نے انہیں ان کی کسی زیادتی کا احساس تک نہیں دلایا لیکن ان کے ساتھ کبھی گرمجوشی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔انسان کتنا ہی کمینگی کر لے اگر اس کی فطرت میں تھوڑی بہت نیکی کی رمق ہو تو ضمیر کچوکے ضرور لگاتا ہے۔چنانچہ ایک بار جمیل نے خود ہی کھل کر معذرت کی اور شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے جو کچھ کیا صرف استاد، شاگرد کے رشتے کی وجہ سے کیا۔میں نے تب بھی خاموشی اختیار کئے رکھی۔وقفے وقفے سے آٹھ دس بار ٹیلی فون کرنے کے بعد ایک بار انہوں نے گلہ کیا کہ وہ اتنی بار مجھے فون کر چکے ہیں جبکہ میں انہیں فون نہیں کر رہا۔میں نے تب بھی بات کو ٹال دیا۔اس سے اگلی بار جب جمیل الرحمٰن کا فون آیا تو مجھ پر برہمی کا اظہار کرنے لگے کہ میں ہر بار فون کرتا ہوں۔آپ فون نہیں کرتے۔تب میں نے اتنا جواب دے دیا کہ میں نے کب آپ سے کہا ہے کہ آپ مجھے فون کیا کریں؟

اس دن کے بعد سے ان کا کوئی فون نہیں آیا یعنی ۔ وہ بھی ہیں آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے

میں اپنے ایک ہم نام کے حوالے سے ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا تھا۔خانپور میں ہی میں نے شاہکار والوں کی چھاپی ہوئی ایک پاکٹ سائز کتاب دیکھی تھی ''ستاروں کا سجدہ''۔اس ناول کو لکھنے والے تھے حیدر قریشی صاحب۔اس نام کے ساتھ ''صاحب'' اس لئے لکھا ہے کہ مذکورہ ناول نگار میں نہیں تھا کوئی اور صاحب تھے۔کون تھے؟ میری بدقسمتی کہ مجھے آج تک ان کے بارے میں علم نہیں ہو سکا۔اب حال ہی میں کراچی سے ایک دوست نعیم الرحمٰن صاحب نے توجہ دلائی تو میں نے انہیں لکھا کہ ان حیدر قریشی صاحب کا کچھ اتہ پتہ کریں۔دیکھیں شاید ان کی بابت کچھ معلوم ہو جائے۔ویسے ایک بات طے ہے کہ وہ جو بزرگ بھی ہیں یا تھے، گزشتہ ربع صدی سے زائد عرصہ سے ادب کی دنیا میں، ادبی رسائل میں کہیں دکھائی نہیں دیئے۔

جرمنی میں بہت ہی معمولی سی مزدوری کر کے گھر کا خرچ چلا رہا ہوں۔ایک بار ایک دوست مجھے میری

جاب پر ہی ملنے کے لئے آئے۔بعد میں گھر پر ملے تو کہنے لگے،اس دن آپ کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا کہ اردو کا اتنا اچھا شاعر اور ادیب اور اتنی معمولی سی ملازمت کر رہا ہے۔میں نے فوراً انہیں کہا کہ بھائی! شاعر اور ادیب تو میں ویسے بھی معمولی سا ہوں لیکن آپ اس ساری صورتحال کو یوں دیکھیں تو آپ کو خوشی ہوگی کہ اتنا معمولی سا مزدور ہے اور خدا نے ایسی صلاحیتیں عطا کر رکھی ہیں کہ چکی کی مشقت کے باوجود اتنا ادبی کام کر رہا ہے۔

جرمنی میں نیشنلٹی لینے کے لئے پہلے اتنی شرائط تھیں کہ بندے کو جرمنی میں رہتے ہوئے سات آٹھ سال ہو گئے ہوں،اپنے ذرائع آمدن ہوں یعنی حکومت سے اسے کوئی امداد نہ ملتی ہو اور جرمن زبان مناسب حد تک آتی ہو۔امریکہ کے ٹریڈ ٹاورز پر حملوں یعنی نائن الیون کے بعد سے پورے یورپ میں بھی رویوں میں قدرے سختی آ گئی ہے۔میرے سارے بچوں کو جرمن نیشنلٹی مل چکی تھی۔میرا اور میری اہلیہ کا معاملہ یوں ہے کہ ہمیں جرمن زبان بالکل نہیں آتی۔میری ملازمت کی آمدنی اتنی کم ہے کہ حکومت کو اپنے فلاحی قوانین کے مطابق مجھے ہر مہینے میری ضرورت کی بقیہ رقم دینا ہوتی ہے۔گویا ہمیں زبان بھی نہیں آتی تھی اور ہماری آمدنی بھی اپنے لئے پوری نہ تھی۔اس لئے ہم دونوں شرائط پر پورے نہیں اترتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ہم نے نیشنلٹی کے حصول والے اپنے فارم پُر کروا کر پانچ سال تک اپنے پاس ہی رکھ چھوڑے تھے۔چونکہ اپنی لیگل پوزیشن کا اندازہ تھا اس لئے اپلائی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔آخر پانچ سال کے بعد میں نے کچھ ہمت کی اور مبارکہ سے کہا کہ اپلائی تو کر دیتے ہیں۔زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ درخواست مسترد ہو جائے گی۔خیر ہے،ایک تجربہ تو ہو جائے گا۔سو،جی کڑا کر کے ہم نے درخواست جمع کرا دی۔روٹین کے مطابق ہمیں جرمن زبان کے ٹیسٹ کے لئے بلاوا آ گیا۔جس دن ٹیسٹ تھا اس دن میں نے علی الصبح انٹرنیٹ پر یاہو کے قسمت کے حال والے حصہ کو دیکھا تو وہاں کچھ اس مفہوم میں واضح احوال لکھا ہوا تھا کہ آپ آج جس خاص کام کے لئے جا رہے ہیں،اس میں کامیابی نہیں ہوگی لیکن ہمت نہ ہاریں اور کوشش جاری رکھیں۔یہ پڑھ کر میں دل میں ہی ہمت ہار بیٹھا۔مبارکہ بیدار ہوئی تو اس نے ایک انوکھا سا خواب سنایا۔اس کی کوئی جاننے والی باجی کوثر ہیں،انہوں نے ہم دونوں کو اپنے گھر پر دعوت دی ہوئی ہے اور ہم باجی کوثر کی دعوت کھا رہے ہیں۔اس خواب سے کچھ امید بندھتی نظر آئی تو میں نے گومگو کی حالت میں مبارکہ کو اپنا آزمودہ ایک ٹوٹکا بھی بتا دیا۔جب زبان کا ٹیسٹ لینے والی کے کمرے میں جانے لگیں تو اپنی انگلی سے اپنی پیشانی پر **یاعزیز!** لکھ لیں۔افسر کا رعب دل پر نہیں رہے گا اور افسر کے دل میں آپ کے لئے نرمی پیدا ہو جائے گی۔

پہلے مجھے ٹیسٹ کے لئے بلایا گیا،ایک اخباری تراشہ کی ریڈنگ کرائی گئی پھر اُس پر گفتگو کی گئی۔مجھے آج تک علم نہیں ہے کہ میں نے کیا پڑھا تھا اور کیا ڈسکس کی تھی۔لیکن مجھے بتایا گیا کہ میں امتحان میں پاس ہو گیا ہوں۔میرے بعد مبارکہ گئی اور وہ بھی اسی طرح پاس قرار دے دی گئی۔میری جرمن زبان اتنی خراب ہے آج بھی کسی ٹیسٹ میں بٹھایا جائے تو فیل ہو جاؤں گا لیکن اللہ کا کرم تھا کہ ہم دونوں کو زبان کے ٹیسٹ میں بھی پاس قرار دے دیا گیا اور آمدن پوری نہ ہونے کی خامی کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔وہ دن اور آج کا دن میں نے اخبارات ورسائل میں اور انٹرنیٹ پر قسمت کے احوال بتانے والے حصے دیکھنا ترک کر دیئے ہیں۔البتہ جس

خاتون نے ہمارا جرمن زبان کا ٹیسٹ لے کر ہمیں پاس قرار دے دیا تھا اس کے لئے کبھی کبھار دعا ضرور کر لیتا ہوں اللہ اسے خوش رکھے! ہمیں نیشنلٹی ملنے کے معاً بعد سے اب یہاں اس کے حصول کا طریق کار پہلے سے بھی بہت زیادہ مشکل کر دیا گیا ہے۔

ہماری جرمن زبان کا حال تو بس ایسا ہی ہے البتہ اگلی نسلوں کے لئے زبان کا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔بچے سکول جاتے ہیں اور وہاں سے انہیں جرمن زبان سیکھنے کے لئے کسی خصوصی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔سب کچھ از خود ہوتا جاتا ہے۔البتہ عربی یا اردو سکھانے کے لئے ان کی ماؤں کو محنت کرنا پڑتی ہے۔اس کے نتیجہ میں کئی مزے کے لطیفے سامنے آتے رہتے ہیں۔جرمن زبان میں بلی کو Katze کہتے ہیں۔یہ انگریزی میں CAT سے ملتا جلتا نام ہے۔میرے دوسرے پوتے جہان زیب کی عمر ابھی چار سال ہے۔اسے عربی قاعدہ کے ساتھ اردو قاعدہ بھی پڑھانا شروع کیا گیا ہے۔الف انار پڑھنے کے بعد جہان زیب نے قاعدہ کی تصویر پر نظر گاڑی ہوئی تھی اور ب: بلی کی بجائے بڑے مزے سے پڑھ رہا تھا ب: کاٹزے (Katze)۔

معمولاتِ زندگی میں احتیاط اچھی چیز ہے لیکن بہت زیادہ احتیاط سے بھی خرابی ہو جاتی ہے۔اپنے گھر کی دو مثالیں یاد آ گئیں۔ پاکستان میں کھانا کھاتے ہوئے اکثر ایسا ہوتا تھا کہ سالن میرے کپڑوں پر گر جاتا تھا۔یہ عادت یہاں بھی قائم ہے۔جتنی زیادہ احتیاط کروں کہ سالن نہ گرے اتنا ہی زیادہ ایسا ہو جاتا ہے۔یوں بیوی کی کڑوی کسیلی سننا پڑتی ہیں۔میری چھوٹی بہن زبیدہ خانپور کے زمانہ میں جب گھر کے برتن دھو رہی ہوتی تو آواز سے پتہ چلتا کہ کوئی گلاس ٹوٹ گیا یا پلیٹ ٹوٹ گئی ہے۔نقصان پر امی جی تھوڑا سا بولتیں تو ابا جی ہنستے ہوئے کہتے کہ بیٹا ایک اور گلاس بھی توڑ دو۔اور اسی وقت دوسرا گلاس ٹوٹنے کی آواز آ جاتی۔ایک بار اسی طرح جب دوسرا گلاس ٹوٹنے کی بھی آواز آئی تو امی جی ذرا غصے کے ساتھ بولیں۔ابا جی نے وہیں سے آواز دی بیٹا! جگ بھی توڑ دو۔بیچاری زبیدہ کی تمام تر احتیاط کے باوجود دھلا، دھلایا جگ اٹھاتے وقت جگ بھی ٹوٹ گیا۔زبیدہ نے اس ناگہانی نقصان پر رونا شروع کر دیا۔اب ایک طرف امی جی کی خفگی بھری آواز ہے دوسری طرف زبیدہ کے رونے کی آواز اور تیسری طرف زبیدہ کو شاباش دیتے ہوئے ابا جی کے ہنسنے کی آواز۔۔۔ابا جی کے ہنسنے کا وہی انداز جس میں ہنستے ہنستے ان کی آنکھ سے پانی بہنے لگتا تھا۔ایک بار امریکہ میں زبیدہ کے ساتھ ٹیلی فون پر ان یادوں کی باتیں ہو رہی تھیں اور ہم دونوں ان پر ہنس رہے تھے۔ہمارے ہنستے ہنستے ابا جی کی آنکھوں کا پانی ہماری آنکھوں میں آ گیا اور ہم دونوں ہی ہنستے ہنستے اپنی بھیگی پلکیں صاف کر رہے تھے۔کبھی کبھی بہت چھوٹی چھوٹی سی بے معنی یادیں بھی ہماری زندگی میں کتنی بامعنی بن جاتی ہیں۔

مغربی ممالک میں عمومی طور پر اور یہاں جرمنی میں خاص طور پر بجلی اور پانی کی فراہمی میں کسی تعطل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ٹیلی فون سروس اب تو ہر جگہ بہت بہتر ہوتی جا رہی ہے لیکن جب دوسرے ملکوں میں اچھی سروس نہ تھی یہاں تب بھی عمدہ سروس ہوا کرتی تھی۔نکاسیٔ آب کا معاملہ ہو یا سردیوں میں گھروں کا ہیٹنگ سسٹم، یہ سہولیات یہاں زندگی کا حصہ شمار ہوتی ہیں۔کوئی انتہائی دور دراز کا گاؤں ہو وہاں بھی سڑکیں جاتی ہیں، بجلی، پانی،

نکاسیٔ آب، ہیٹنگ سسٹم، اور ٹیلی فون کی سہولیات میسر ہیں۔ کسی پائپ لائن کی کوئی مرمت کرنا ہوئی یا انسپکشن کرنا ہوئی تو کئی دن پہلے نوٹس لگا دیا جاتا ہے کہ فلاں تاریخ کو اتنے بجے سے اتنے بجے تک پانی بند رہے گا۔ اپنی ضرورت کا پانی جمع کر رکھیں۔ سڑکوں کی مرمت کا کام بھی ساتھ کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ لیکن جہاں ایسا کچھ ہو رہا ہوتا ہے وہیں متبادل رستوں کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ یہاں فرینکفرٹ شہر کے اندر ٹریفک اور عوام کے ہجوم میں بھی دیکھا کہ کسی بلڈنگ کی تعمیر ہو رہی ہے یا کسی عمارت کی مرمت ہو رہی ہے، مجال ہے کوئی کوڑا کرکٹ اِدھر اُدھر بکھر جائے۔ تعمیراتی اداروں کا ایسا مربوط نظام ہے کہ نہ تو کوئی رستہ بلاک ہوگا اور نہ ہی گرد و غبار پیدا ہوگا۔

ایک بار اس وقت مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب فرینکفرٹ کے بڑے ریلوے اسٹیشن سے لے کر Hauptwache تک انڈر گراؤنڈ ٹریکس کی مرمت کا کام ہونا تھا۔ لگ بھگ ۲۰ دن تک یہ مرمت ہونا تھی اور اس عرصہ میں اُس رُوٹ کو بند رہنا تھا۔ مجھے پہلے دن تشویش ہوئی کہ جاب پر جانے کے سارے اوقات درہم برہم ہو جائیں گے۔ میں نے مین اسٹیشن پر پہنچ کر انفارمیشن والوں سے رابطہ کیا اور انہیں اپنی منزل کا پتہ بتا کر متبادل رُوٹ پوچھا تو انہوں نے ایک منٹ میں متبادل رُوٹ کی پرچی نکال کر میرے حوالے کر دی۔ پہلے دن میں اپنے معمول سے صرف دس منٹ لیٹ ہوا، اور بعد میں صرف پانچ منٹ کی تاخیر سے پہنچ جاتا تھا۔ پاکستان میں کسی ریلوے ٹریک کی مرمت یا کسی سڑک کی مرمت کی صورت میں جو حال ہوتا ہے اس کے بارے میں کیا کہوں۔ سارے اہلِ وطن بخوبی جانتے ہیں بلکہ ایسی صورتحال کو بھگتتے رہتے ہیں۔ ریلوے کے سلسلے میں تو کچھ عرصہ پہلے ''رن پٹھانی پُل'' کے بارے میں ہی جتنی خبریں آتی رہیں، انہیں پڑھ کر اپنے ہاں کے انتظامات پر شرمندگی ہوتی رہی۔ یہاں جرمنی میں ریلوے کے مذکورہ بہترین متبادل انتظام کے ساتھ کمال یہ تھا کہ نہ صرف ہزاروں مسافروں کے معمولات میں خلل نہیں پڑا بلکہ اس دوران کسی قسم کا گرد و غبار پبلک تک نہیں پہنچا۔ سچی بات ہے میں تو اپنی پاکستانی یادوں کی وجہ سے گرد و غبار دیکھنے کو ہی ترستا رہا۔

پاکستان میں ہمیں یہ حدیث شریف تو پڑھائی جاتی تھی کہ صفائی ایمان کا حصہ ہے۔ لیکن جہاں تہاں گندگی کے ڈھیر اب بھی ویسے ہی موجود ہیں۔ ادھر جرمنی میں ایسی کوئی حدیث یا آیت نہیں پڑھائی جاتی لیکن صفائی کا حال سب کے سامنے ہے۔ ہم لوگوں کی خرابی یہ ہوئی ہے کہ ہم گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح چند باتوں اور نصیحتوں کو تو دہراتے رہتے ہیں لیکن ہمارا عمل کا خانہ یکسر خالی ہے۔ قرآن شریف میں سب سے زیادہ دنیا اور کائنات کے اسرار و رموز پر غور و فکر کی تلقین کی گئی ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا جدید سائنسی انکشافات اور ایجادات میں کتنا حصہ ہے؟ اس سوال کے جواب سے پتہ چل سکتا ہے کہ مسلمان آج کل قرآن کی اس سب سے زیادہ تلقین پر کتنا عمل کر رہے ہیں؟۔ ان کے برعکس اہلِ مغرب نے فلسفہ اور دوسرے علوم میں جتنی پیش قدمی کی، سائنسی ترقی کی، جتنی ایجادات کیں، جو نئی ٹیکنالوجی اختیار کی وہ سب دنیا اور کائنات کے اسرار و رموز پر غور کا نتیجہ اور ثمرہ ہے۔ ہم نے تو سوچ بچار اور آزادانہ غور و فکر کو شجرِ ممنوعہ بنا رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے۔ اہلِ مغرب نے آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جو عالمی غلبہ حاصل کر رکھا ہے، یہ سب ان کی آزادانہ سوچ، غور و فکر اور تدبر کا ثمر

ہے۔ وہی آزادانہ سوچ، غور و فکر اور تدبر جس کی قرآن نے بار بار تلقین کی اور ہمارے علماء اور رہنماؤں نے لوگوں کو اسی عمل سے دور رکھا۔

یہاں ایک وضاحت بھی کر دوں ہمارے مصلحین اور مفکرین جب مغربی معاشرے کے مقابلہ میں اپنے مشرقی معاشرہ کے فضائل بیان کرتے ہیں تو اس میں مغرب کی ''بے راہروی'' کو بطور خاص نشانہ بناتے ہیں۔ میں نے اس معاملہ کو ایک اور زاویے سے دیکھا ہے۔ وہ آزادی جو مغرب نے فلسفہ، سائنس، مذہب، ادب اور دیگر علوم میں اختیار کی اسی کے زیرِ اثر ان کے ہاں معاشرتی سطح پر آزادی کا رجحان بڑھا۔ اب صورتحال یوں ہے کہ مغرب میں مرد عورت باہمی رضامندی سے جو کچھ کر لیں روا ہے، لیکن جبراً کرنا منع ہے۔ دوسری طرف ہمارے مشرقی معاشرہ میں مقتدر اشرافیہ طبقہ وہ سب کچھ بھی کرتا ہے جو مغرب میں ہوتا ہے اور جبراً بھی بہت کچھ کر کے الٹا متاثرہ فریق کو گنہگار قرار دلوا کر جیلوں میں سڑوا دیتا ہے۔ ایک طرف عیاشی اور ظلم کی یہ صورت ہے دوسری طرف اخلاقیات اور مذہب کے نام پر عام آدمی کو اس فعل سے روکا جاتا ہے جس کا ارتکاب مقتدر طبقہ دن رات کرتا ہے۔ اس حوالے سے جب میں دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ ہمارا مشرقی معاشرہ مقتدر طبقہ کی منافقت کے باعث استحصالی اور منافقانہ معاشرہ بن گیا ہے۔ ہم نیک بننا نہیں چاہتے، صرف نیک دِکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے برعکس مغرب میں جو سہولیات مقتدر طبقہ کو میسر ہیں وہ انہوں نے عام آدمی کو بھی مہیا کر رکھی ہیں۔ شرط ہر جگہ ایک ہی ہے کہ جو کچھ ہو باہمی رضامندی سے ہو۔ جبراً اگر شوہر بھی اپنی بیوی سے کچھ کرے تو اس پر بھی کیس بن جاتا ہے۔

جنرل ضیاع الحق کے دور میں ہونے والی ادیبوں کی ایک کانفرنس میں قبائلی علاقہ سے آئے ہوئے ایک ادیب فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ صبح سویرے وہ رفع حاجت کے لئے ڈھیلے کی تلاش میں ویرانے کی طرف نکل گئے۔ دیر سے واپس آئے تو بعض ادیبوں کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ڈھیلے کی تلاش میں ویرانے کی طرف چلا گیا تھا۔ ایک ادیب نے انہیں بتایا کہ باتھ روم میں جو ٹشو پیپرز ہیں، آپ انہیں استعمال کر سکتے تھے۔ اس پر انہوں نے انکشاف کیا کہ وہ تو اس پر شاعری لکھتے رہے ہیں۔ ہمارے بعض سخت گیر علاقوں میں استنجہ کے لئے ڈھیلے کے استعمال کو آج بھی بعض لوگ ایمانیات کا حصہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ایسے کئی لطیفے سامنے آتے رہتے ہیں۔ اگر اہلِ مغرب کے عقائد یا معاشرت میں ڈھیلے کا ایسا عمل دخل ہوتا تو مجھے یقین ہے یہ لوگ ڈھیلوں کی ایسی فیکٹریاں بنا لیتے جہاں سے نفیس قسم کے ایسے ڈھیلے تیار ہوتے جو حفظانِ صحت کے مطابق ہوتے اور صفائی کا سارا عمل مقناطیسی اور خودکار طریقے سے مکمل ہوا کرتا۔

سرائیکی میں دو الفاظ کا مطلب واضح کر کے ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ سرائیکی میں ''ہِے'' کا مطلب ''ہے'' اور ''ہا'' کا مطلب ''تھا'' ہوتا ہے۔ خانپور میں ہمارے محلّہ میں ایک تھے چاچا مسُّو لکڑی کے ٹال والے اور ایک تھے چاچا چھتّا موچی۔ چھتا موچی بریلوی مسلک کے مطابق حاضر ناظر کے قائل تھے اور چاچا مسو دیوبندی مسلک کے مطابق اس کے مخالف تھے۔ لیکن علم دونوں کا ہی پورا پورا تھا۔ دونوں میں کلمہ طیبہ کی قرات پر بحث ہو رہی تھی۔ چاچا مسّو کہہ رہے تھے کہ کلمہ شریف یوں پڑھنا چاہئے۔ **لا اللہ الا اللہ محمد الرسول اللہَ**

(یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول تھے۔)''تھے'' کو واضح کرنے کے لئے وہ کلمہ کے آخر میں سرائیکی ''ہا'' پڑھ کر سمجھتے تھے کہ وہ حضور ﷺ کو وفات یافتہ قرار دے رہے ہیں، جبکہ چاچا چھتا موچی اصرار کر رہے تھے کہ کلمہ کی اصل قرات یوں ہے: **لا الٰہ الاالله محمد الرسول اللهِ** یعنی وہ تھے نہیں، بلکہ اب بھی ہیں، حاضر ناظر ہیں۔اس کے اظہار کے لئے وہ آخر میں سرائیکی لفظ کی طرح ''ہے'' پڑھتے۔ میں نے دونوں بزرگوں کی اس عالمانہ بحث کو مزے سے سنا تھا۔

میں نے اپنے نانا جی کا خاکہ لکھا تھا جو ''میری محبتیں'' میں شامل ہے۔منشا یاد نے میری خاکہ نگاری پر مضمون لکھتے ہوئے اس خاکہ کو نسبتاً زیادہ اہمیت دی۔اور خیال ظاہر کیا ہے کہ میرے نانا جی کے بعض خاص اثرات مجھ پر ہیں۔نانا جی کے وہ اثرات یقیناً مجھ پر ہیں اور ان کی طرح دوسرے ان تمام عزیزوں کے اثرات بھی مجھ پر ہیں، جن کے خاکے میں نے لکھے اور وہ سب اپنے اپنے طریق سے میری شخصیت کی بُری بھلی تعمیر کا کام کر گئے۔ابا جی کو تو میں اب براہِ راست اپنے آپ میں دیکھتا ہوں۔منشا یاد کی نشاندہی کے بعد میں نے تھوڑا سا غور کیا تو ایک بڑی عجیب سی مماثلت مجھے اپنے نانا جی میں اور خود میں دکھائی دی۔نانا جی ایک بار لتا کا ایک گانا گنگنا رہے تھے

؎یہ زندگی اسی کی ہے جو کسی کا ہو گیا

ہماری نئی نئی جوانی تھی۔ہم اپنے حساب سے نانا جی کے گانے پر ہنسے تو نانا جی نے ہم سب ہنسنے والوں کو پیار سے اپنے پاس بلایا اور بتانے لگے کہ تم بچے اس گانے کو صرف گانا سمجھتے ہو، اس میں تو بڑی معرفت کی بات ہے۔یہ زندگی اس کی زندگی ہے جو ہمیشہ کے لئے خدا کا ہو گیا اور اس کی محبت میں گم ہو گیا۔نانا جی کی اس تشریح پر ہمیں مزید ہنسی آئی لیکن ان کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے ہنسی کو دبائے رکھا۔

آج ایک عرصہ گزرنے کے بعد جب میں بھی نانا بن چکا ہوں تو بالکل نانا جی والی صورتحال بن چکی ہے۔مجھے متعدد پرانے گانے پسند ہیں۔کسی زمانے میں صوفیانہ کلام سنتے ہوئے جذباتی کیفیت ہو جایا کرتی تھی۔لیکن چند برسوں سے ایک فلمی گانے نے مجھے عجیب طرح سے جکڑ رکھا ہے۔

اک جاں تھی پاس وہ جاں لے کر ہم تیری گلی میں آ نکلے

کیا جانے کیا ارماں لے کر ہم تیری گلی میں آ نکلے

نور جہاں کی آواز میں گایا ہوا یہ گانا میرے لئے ایک عجیب معنویت اور کیفیت کا حامل بن گیا ہے۔جب بھی اس گانے کو سنتا ہوں ایسے لگتا ہے جیسے میں اپنے گناہوں کی گٹھڑی اُٹھائے ہوئے خدا کے دربار کی طرف جا رہا ہوں اور یہ سب گاتا ہوا جا رہا ہوں اور پھر مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔اگر گانا سنتے ہوئے جذب کی کیفیت گہری نہ ہو تو میرے صرف ایک مصرعہ گنگنانے سے ہی جذب کی کیفیت گہری ہو جاتی ہے۔یہ نانا جی کے ساتھ کسی نوعیت کی مماثلت ہے، یا ان کے سوچ کے انداز پر ہنسنے کی سزا ہے؟اگر سزا ہے تو میں اسے بہت بڑی جزا سمجھتا ہوں۔عجیب اتفاق ہے کہ نانا جی کو جس گانے کے بول میں معرفت دکھائی دیتی تھی وہ انڈین فلم انارکلی کا گانا تھا اور مجھے جس گانے نے کئی برسوں سے جکڑا ہوا ہے وہ پاکستانی فلم انارکلی کا گانا ہے۔خدا جانے (اچھی اور میٹھی) موسیقی واقعی

روح کی غذا ہوتی ہے یا نہیں لیکن مذکورہ گانا تو میرے لئے واقعتاً روح کا ایک تجربہ بنا ہوا ہے۔صوفیانہ کلام نہ ہوتے ہوئے مجھ پر اس کا اتنا گہرا اثر کیوں ہے اور میں معرفت کے سوا اسے کسی دوسرے رنگ میں کیوں نہیں لے سکتا؟ مجھے خود اس کی سمجھ نہیں آتی۔شاید کہیں روح کا کوئی تار، اس گانے کے تاروں سے جُڑ گیا ہے۔

کبھی کبھار تھوڑا سا وقت ملتا ہے اور گانے سننے کا موڈ ہوتا ہے تو کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے کوئی سی ڈی لگا لیتا ہوں۔ایک بار صبح سویرے کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے میں نے لتا منگیشکر کا ایک گانا لگایا ''یہ شام کی تنہائیاں، ایسے میں تیرا غم''۔۔۔مبارکہ کمرے کے آگے سے گزری تو کہنے لگی یہ کیا صبح صبح ''شام کی تنہائیاں۔۔۔'' لگا کر بیٹھے ہیں۔میرے پسندیدہ گانوں پر مبارکہ کے تبصرے بعض اوقات اپنا الگ لطف پیدا کر دیتے ہیں۔پنجابی کا ایک پرانا گانا سنتے ہوئے مبارکہ نے میری کیفیت پر بڑا مزے کا تبصرہ کیا تھا۔میں وہ احوال ڈاکٹر نذر خلیق کے نام اپنے ایک خط میں لکھ چکا ہوں، جسے انہوں نے اپنی مرتب کردہ کتاب میں شامل کر دیا تھا۔خط کا وہ حصہ بنیادی طور پر یادوں سے تعلق رکھتا ہے اور اب یہاں گانوں کا ذکر ہو رہا ہے تو اپنے ۱۶رنومبر۲۰۰۲ء کے تحریر کردہ اس خط کا متعلقہ حصہ یہاں درج کئے دیتا ہوں:

''ایک دن میں پنجابی کی ایک ویب سائٹ ''اپنا آرگ ڈاٹ کام'' سے طفیل ہوشیار پوری صاحب کا مشہور گانا ''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' سنتے ہوئے دوستوں کی ای میلز کے جواب دے رہا تھا۔گانے سے اپنی بعض یادوں کے باعث میں کچھ جذباتی سا بھی ہو رہا تھا۔اسی دوران کمرے میں مبارکہ آ گئی اور ہنسنے لگ گئی۔۔۔۔۔میں نے حیران ہو کے پوچھا کیا ہوا ہے؟

کہنے لگی انٹرنیٹ پر ای میلز کے جواب لکھ رہے ہیں اور ساتھ ''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' سن کر جذباتی ہو رہے ہیں۔مبارکہ کی بات سن کر میں اپنی جذباتی کیفیت ہی میں مسکرا دیا۔

لیکن بعد میں غور کیا تو مجھے کبوتروں کے ذریعے پیغام بھیجنے والے دَور سے ای میل کے ذریعے پیغام بھیجنے والے دَور تک کے سارے زمانے اپنے اندر برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔نیا دور اپنی طرف بلاتا ہے اور اس میں بڑی کشش ہے، اس کا مضبوط جواز بھی ہے۔پہاڑ کی چوٹی تک جانا آسان ہے لیکن دوسری طرف پرانے دور کی یادیں مسلسل بلاتی ہیں۔روتی ہوئی، ہنستی ہوئی، ہر طرح کی آوازیں بلاتی ہیں۔مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ گزرے زمانے کی آوازوں پر مڑ کر دیکھنے والے شہزادے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔اس کے باوجود میں نہ صرف مڑ کر دیکھتا ہوں بلکہ ہر قدم پر مڑ کر دیکھتا ہوں اور خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی کوشش بھی کرتا جاتا ہوں۔

''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' جذباتی ہو کر سننا، پہاڑ پر جاتے ہوئے مڑ کر دیکھنے جیسا ہے اور ساتھ ساتھ ای میلز کے جواب لکھتے جانا خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی کوشش ہے۔''

مجھے بہت سارے پرانے گانے پسند ہیں، ان سب کی اچھی موسیقی میری روح پر اثر کرتی ہے اور دل میں سوز و گداز بھی پیدا کرتی ہے۔ان گانوں کے ساتھ میں حال میں رہتے ہوئے اپنے گزرے ہوئے زمانوں کا سفر کر لیتا ہوں

ہر مذہب کے دو پہلو ہیں۔ایک دانش والا اور دوسرا دہشت والا۔دانش والے پہلو میں دوسروں کے

ساتھ مکالمہ بلکہ ایک دوسرے کی تفہیم والے تقابلی مطالعہ کا ظرف پیدا ہوتا ہے۔ یہی پہلو آگے چل کر صوفیانہ ریاضت کی طرف بھی لے جانے میں ممد ہوتا ہے۔ جہاں مختلف علوم ایک نقطے میں یکجا ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے اپنے ظرف کی وسعت کے باعث مذہب کے اس پہلو میں مکالمہ اور تقابلی مطالعہ سے کسی کو گھبراہٹ نہیں ہوتی۔

جبکہ مذہب کا دہشت والا پہلو کسی مکالمہ کی گنجائش نہیں رکھتا۔ اس میں صرف بزور بازو اور خوفزدہ کر کے بات منوائی جاتی ہے۔ یہی رویہ آگے بڑھ کر اس دہشت گردی کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو اس وقت ساری دنیا کو درپیش ہے۔ یہ دہشت گردی امریکہ کے انتہا پسند مسیحی نیوکونز کی ہو یا طالبان کی، کسی پس منظر میں موجود انتہا پسند یہودی گروپ کی ہو یا القاعدہ کی، یہ سارے انتہا پسند انسانیت کے لئے خطرہ ہیں۔

مذہب کا دانش والا پہلو **هاتو برهانكم ان كنتم صادقين** کی دعوت دے کر علم اور دلیل کی بنیاد پر مکالمہ کرتا ہے۔ جبکہ علم اور دلیل سے خائف مذہب کا دوسرا پہلو علم کی تضحیک کر کے، دھمکانے ڈرانے سے لے کر دہشت گردی کی اس صورت تک جاتا ہے جیسا آجکل دنیا میں دکھائی دے رہا ہے۔

اگر مشرق اور مغرب کے عمومی رویوں کو دیکھیں یا پھر صرف پاکستان اور جرمنی کے حوالے سے ہی بات کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ من حیث المجموع اِن لوگوں نے روح کے معاملات کو نظر انداز کیا ہے اور جسم کے معاملات پر ہی زیادہ توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ ساری سائنسی ترقیات اور برکات کا تعلق بھی افادی لحاظ سے جسم سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ ان کے برعکس ہم لوگ جسم کے تقاضوں اور مطالبوں کو یکسر نظر انداز کر کے روح کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ المیہ یہ ہے کہ روح کے حوالے سے بھی ہمارے پاس صرف زبانی کلامی دعوے رہ گئے ہیں۔ روحانی ترقی سے معاشرے میں جو روحانی ترفع دکھائی دینا چاہئے وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ بات ہم روح کی کرتے ہیں دوڑتے جسم کی ضروریات کی طرف ہیں۔ یوں ہم نہ کوئی روحانی معاشرہ برپا کر سکے نہ جدید علوم سے ہی خاطر خواہ طور پر بہرہ ور ہو سکے۔ جسمانی طور پر ہم بے روح ہو چکے ہیں اور روحانی طور پر ہم جسم کے بغیر اپنا ہی بھوت بن کر رہ گئے ہیں۔

روحانی تجربات کی ایک اہمیت ہے اور کسی روحانیت کے دعویدار معاشرہ میں تو اس کی اہمیت بہت زیادہ ہونی چاہئے۔ تاہم روحانی تجربات کا مطلب یہ ہوا کہ اس بندے کو خدا سے پیار ہے اور یہ اپنے رب کی جستجو میں لگا ہوا ہے۔ اس کے برعکس مغربی اسکالرز جو سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیش رفت کر رہے ہیں، ان کا شمار ان لوگوں میں کیا جانا چاہئے جو خدا کے بندوں سے پیار کرتے ہیں۔ کیونکہ کسی مکاشفہ کرنے والے کے مقابلہ میں بیماریوں کے علاج والی ادویات اور انسانوں کے لئے جدید تر سہولیات کی ایجاد کرنے والا کوئی بھی سائنسدان اس لئے زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ کسی (غیر مامور) کا سچا خواب، کشف یا خدا سے مکالمہ بھی اس کی اپنی ذات کی حد تک ہے جبکہ جو ادویات ایجاد کر رہے ہیں، بجلی سے لے کر آج تک کی نت نئی ایجادات میں پیش رفت کر رہے ہیں جن سے ساری انسانیت فیض یاب ہو رہی ہے، وہ سائنس دان اور موجدین اپنی ذات کو نہیں بلکہ پوری انسانیت کو، لاکھوں کروڑوں بلکہ اربوں بندگانِ خدا کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ سو روحانیت کے ساتھ سائنسی ترقی کو بھی نظر انداز نہیں کیا

جا سکتا۔ میں یہاں مغربی ممالک کے سیاسی کردار کو موضوع نہیں بنا رہا۔ اس حوالے سے میری دو کتابوں ''منظر اور پس منظر'' اور ''خبر نامہ'' میں میرا موقف کافی وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں صرف مشرقی اور مغربی معاشروں کی سطح پر روحانی اور مادی امور سے سروکار ہے۔

ایک بار ایک ٹی وی چینل پر روحانیت کے حوالے سے مکالمہ چل رہا تھا۔ شرکاء تھے جسٹس جاوید اقبال، پروفیسر مہدی حسین اور مولانا ڈاکٹر اسرار احمد۔ آخر میں شو کے کمپیئر نے تینوں شرکاء سے پوچھا کہ ان کی ذاتی زندگی میں کوئی روحانی تجربہ ہوا ہے؟

جسٹس جاوید اقبال نے، جو اقبال کے فرزند ہی نہیں لبرل شارح بھی ہیں، ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی والے دن علی الصبح اپنے ساتھ پیش آنے والا ایک واقعہ بیان کیا۔ یہ واقعہ وہ اپنی سوانح حیات میں بھی لکھ چکے ہیں۔ اس میں سوتے ہوئے ان کے اوپر سے چادر کھینچ لی جاتی ہے۔ میرے ساتھ اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ ہوا تھا جس میں مجھ پر کسی نے آ کر رضائی ڈال دی تھی۔ یہ واقعہ میرے افسانہ ''بھید'' اور یادوں کے پہلے باب ''بزمِ جاں'' میں تفصیل سے درج ہے۔ پروفیسر مہدی حسین جنہیں ان کی فلسفہ میں گہری دلچسپی کی وجہ سے اہلِ مذہب ملحد بھی کہنے لگے ہیں، ان سے جب پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ انہیں کسی اچھا یا برا کام کرتے وقت ایسا لگتا ہے جیسے ان کے والد انہیں دیکھ رہے ہیں۔ مجھے یہ بات سن کر بھی خوشی ہوئی۔ کیونکہ میں ایسا ہی اپنا تجربہ اپنے افسانے ''مسکراہٹ کا عکس'' میں لکھ چکا ہوں اور نذر خلیق صاحب نے مجھ سے جو تفصیلی انٹرویو کیا تھا اس میں بتا چکا ہوں کہ یہ ''کہانی خود میرا اپنا نفسی تجربہ تھا جو یہاں جرمنی میں مجھے پیش آیا، اسے آپ سوتی جاگتی حالت کا تجربہ کہہ سکتے ہیں''۔ یہ کوئی بڑے روحانی تجربے نہیں ہیں، بس ہم جیسے گنہگاروں کے ظرف کے مطابق خدا کی طرف سے تھوڑی بہت خیرات ہے، ایسی خیرات ہم جیسے اور ہزاروں گنہگاروں کو بھی ملتی رہتی ہے۔ کسی کو ایسے تجربات سے بدہضمی ہو جائے اور وہ خود کو کچھ سمجھنے لگ جائے تو اس کے لئے ابتلا کا موجب بھی بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے۔ ایسے تجربات کے لئے تھوڑا سا گنہگار ہونا بھی شاید شرط ہو۔ کیونکہ اللہ کے نیک بندے تو ایسے تجربات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ اس لئے انہیں ایسے تجربے ہوتے بھی نہیں۔ خیر بات ہو رہی تھی ٹی وی کے ٹاک شو کی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ روایتی معنوں میں غیر مولوی ہوتے ہوئے بھی، جسٹس جاوید اقبال اور پروفیسر مہدی حسین، دونوں دانشوروں کے ہاں نہ صرف روحانی تجربات موجود تھے بلکہ ان کی نوعیت سے میرے تجربوں کی نوعیت کی بھی تصدیق ہوئی۔ تاہم اس نشست کا سب سے دلچسپ جواب مولانا ڈاکٹر اسرار احمد کا تھا۔ وہ روح اور روحانیت پر بڑی عالمانہ گفتگو فرماتے رہے تھے لیکن ان کا دامن کسی بھی روحانی تجربہ سے خالی تھا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ انہیں زندگی میں کوئی روحانی تجربہ نہیں ہوا۔ اب جبکہ پاکستان کی روحانی ذمہ داریاں ایسے پڑھے لکھے علماء کرام نے سنبھال رکھی ہیں جو کسی روحانی تجربے سے یکسر محروم ہیں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جسم کی نفی کرتے ہوئے، جسم کی ضروریات کی طرف دوڑتا ہوا ہمارا معاشرہ روحانی طور پر کیوں اپنا ہی بھوت بن کر رہ گیا ہے۔

ماہیے امین خیال (لاہور)

جگ کوڑ ٹھکانا ہے
چھوڑ کے گھر نقلی
گھر اصلی جانا ہے

ہر گام ترا سپنا
گِن گِن دانوں پر
کیا نام ترا جپنا

کیا موت سے ڈرتا ہے
پپلی کے پتے
کیا کھڑ کھڑ کرتا ہے

جگ پہ چھا جاتا ہے
وہ اسے پاتا ہے
جو خود کو مٹاتا ہے

رہ میں ڈر جاؤں گا
شام جو ہو گئی تو
گھر کیسے جاؤں گا

بیڑی کا مہانا ہے
اِس پار آئے ہیں
اُس پار بھی جانا ہے

گھر اس کا پایا نہیں
دیکھنا ہے اس کو
جو سامنے آیا نہیں

سینی* سے لو زردہ
حشر میں ہم سب کا
رکھے گا خدا پردا

سختی میں جکڑے گا
اک دن پوچھے گا
اک دن وہ پکڑے گا

انسان سمائے ہیں
زیرِ خاک کئی
طوفان سمائے ہیں

ہنستا کبھی روتا ہے
نفس امارہ بھی
پالا ہوا توتا ہے

بیکار عمل سارا
نفسِ امارہ کو
گر تو نے نہیں مارا

مصروفِ مسافت ہوں
دل کے اندر کی
نت کرتا سیاحت ہوں

ہے وقت کڑا سائیں
بیچ میں دریا ہے
اُس پار کھڑا سائیں

طوفان کا پالا ہوں
ہاتھ پکڑ میرا
میں ڈوبنے والا ہوں

سب دور شکوک کرو
اپنے پیاروں سے
کوئی نیک سلوک کرو

کوئی اور نہیں بھایا
بھول نماز گئی
جب سامنے تو آیا

وہ شاد نہیں ہوتا
عشق جسے مارے
آباد نہیں ہوتا

*سینی پنجابی میں تھال کو کہتے ہیں

ماہیے نذیر فتح پوری (پونہ،انڈیا)

جب دل کا ورق لکھو
بات ہو سادہ سی
کچھ بھی نہ ادق لکھو

لکھی تو بہت ''یاری''
سمجھا نہیں اب تک
لفظوں کی ریاکاری

بے خوابی کی نظمیں ہیں
چین اُڑا دیں گی
یہ ایسی ہی چیزیں ہیں

لب ہیں، نہ دعائیں ہیں
کیسی ہے مجبوری
آہیں نہ صدائیں ہیں

ہر لفظ ہے بازی گر
سینے پہ کاغذ کے
دکھلائے عجب منظر

پھولوں کو ہنسا دینا
طرفہ تماشہ ہے
کلیوں کو رُلا دینا

تفریق بڑھاتے ہیں
دودھ کے آنگن میں
دیوار اُٹھاتے ہیں

آسیب کا سایا ہے
اپنا جو رستہ تھا
وہ آج پرایا ہے

اندھیارے مٹا دینا
دل کی منڈیروں پر
اک دیپ جلا دینا

ساون ہے تو سرگم ہے
کیسے یہ رشتے ہیں
تتلی ہے تو شبنم ہے

مت کوئی وظیفہ پڑھ
خود کے سمجھنے کو
بس دل کا صحیفہ پڑھ

ماضی سے چھڑا مجھ کو
آج کا انساں ہوں
قصے نہ سنا مجھ کو

بے رنگ ادا پہنے
آ گیا پھر ساون
زخموں کی قبا پہنے

اتنی سی تیاری رکھ
سانپوں کی بستی میں
چندن سے نہ یاری رکھ

ہم کاہے سے ڈرتے ہیں
خود سے نہیں ڈرتے
ہمسائے سے ڈرتے ہیں

منظر ہیں عذابوں کے
''ریت سمندر'' میں
نقشے ہیں سرابوں کے

بیداری سے کیا لینا
رات کی پلکوں سے
کچھ اشک اُٹھا لینا

ہر راز بیاں کر دے
اپنی حقیقت کو
تو سب پہ عیاں کر دے

ماہیے

سعید رحمانی (اڑیسہ)

دن یونہی بتاتے ہیں
جاگتی آنکھوں میں
خوابوں کو سجاتے ہیں

حق بات میں کہتا ہوں
جھوٹ سے ہے نفرت
دکھ اس لیے سہتا ہوں

کیچڑ میں کنول جیسی
گاؤں کی وہ گوری
ہے میری غزل جیسی

اک روز وہ آ جائے
کاش اسی صورت
اس گھر میں بہار آئے

کون آیا ہے گاؤں میں
بکھری ہوئی خوشبو
ہر سُو ہے فضاؤں میں

چاندی ہے نہ سونا ہے
زندگی اپنی تو
مٹی کا کھلونا ہے

ماہیے

ساجد حمید (شموگہ)

یہ کونسی بستی ہے
صندلی بن جیسی
دن رات مہکتی ہے

تنہائی کا میلہ ہے
درد کے صحرا میں
مہتاب اکیلا ہے

اس دھوپ کی بارش سے
بچ کے نکلنا ہے
احباب کی سازش سے

یہ کس نے دعا دی ہے
آتشیں لمحوں کو
پھولوں کی قبا دی ہے

وہ لوٹ کے آئیں گے
خواب ستاروں سے
ہم گھر کو سجائیں گے

یہ کون سا موسم ہے
بیٹھ رہا ہے دل
اور آنکھوں میں شبنم ہے

ماہیے

اقبال آصف (بیجاپور)

کہنے کو وہ دریا ہے
کوئی نہیں جانے
اک عمر کا پیاسا ہے

خود جاگتے پہلے تھے
لوگ تھے کیسے جو
سورج کو جگاتے تھے

پھر صبح سے کچھ ایسے
آنکھ پھڑکتی ہے
شاید کوئی آ جائے

مشکل ہے دوانے کو
دشت نہ صحرا ہے
اب خاک اُڑانے کو

یہ نسل ہے پتھر کی
چوٹ نہیں لگتی
اب دل پہ کسی کے بھی

چہروں پہ سجاوٹ تھی
لوگ ملے جتنے
لہجوں میں بناوٹ تھی

ماہیے

اوم پرکاش آزاد بہاولپوری (غازی آباد، انڈیا)

باغوں میں تماشے ہیں
خار تو یکساں ہیں
گل کس نے تراشے ہیں

کیا غور سے دیکھا ہے
بھوک اور غصے میں
باریک سی ریکھا ہے

شکوے نہیں غیروں کے
جو بھی ظلم ہوئے
تھے سارے وہ اپنوں کے

انصاف تو اندھا ہے
بھوک اور بھیک یہاں
بس روز کا دھندہ ہے

یہ رشتہ قریبی ہے
بھوکے کی پونجی
بس ایک غریبی ہے

ان وعدوں پہ مت جانا
ننگے ہیں اندر سے
باہر سے ہے دستانا

ماہیے

فاروق شکیل (حیدرآباد، انڈیا)

بارود ہے ذہنوں میں
آگ لگائیں گے
تقریر سے لوگوں میں

ہر زخم پرانا ہے
درد جو ہے دل میں
یادوں کا خزانہ ہے

چہرے پہ تبسم ہے
بات نہیں کرتا
خاموش تکلم ہے

نفرت کو مٹانا ہے
پیار کی ہریالی
ہر دل میں اگانا ہے

زخموں میں پروتا ہے
درد کو وہ اپنے
ماہیوں میں سموتا ہے

ڈستا ہے ہرا موسم
زخم ہرے کر کے
دیتا ہے سزا موسم

ماہیے

نسرین نقاش (سرینگر)

ہو جاتا ہے دھوکا بھی
کرنا ہی پڑتا ہے
انساں کو بھروسا بھی

ہستی کو مٹانے پر
روشنی پائی ہے
گھر اپنا جلانے پر

بھوگا ہے جو سُکھ میں نے
سُکھ سے ہی پایا ہے
جیون میں یہ دُکھ میں نے

کچھ ہے تجھے اندازہ
تو نے مرے دل کا
ہر زخم کیا تازہ

قسمت کے اشارے پر
ڈوب گئی کشتی
پاس آ کے کنارے پر

ہو جاتے ذرا ہلکے
غم میں ترے لیکن
آنسو ہی نہیں چھلکے

ماہیے: اکمل شاکر (پسنی۔بلوچستان)

صندل کی تو خوشبو
جنگل، بادل میں
ہر جانب تو ہی تُو

رونے کی خواہش ہے
کیسٹ غزلوں کی
میری فرمائش ہے

مجھ کو ہوا اندازہ
درد محبت کا
رہتا ہے ترو تازہ

میں خود سے ہارا ہوں
روشن راتوں میں
اک مدھم تارا ہوں

دل سے اقرار کیا
دنیا سے چھپ کر
ساجن سے پیار کیا

گزرا ہوا قصہ ہے
میرے جیون کا
وہ آدھا حصہ ہے

موجوں سے نہ ڈر ماہیا
اچھا لگتا ہے
موجوں کا سفر ماہیا

کیا لینا زمانے سے
دل یہ بہلتا ہے
ساجن ترے آنے سے

اچھا یا بُرا کیا ہے
اپنے اندر ہی
میں نے سب پایا ہے

یاری تری جھوٹی ہے
دونوں ہیں یکساں
نیت مِری کھوٹی ہے

تالاب کے پانی سے
درد مہکتے ہیں
پھولوں کی جوانی سے

بلبل کی صداکاری
پھول مہکنے تک
کرتی رہی دلداری

پابندی ہے اب ماہیا
آؤ گے اُس دن
مر جاؤں گا جب ماہیا

نمکین ہے کیوں پانی
پسنی میں رہ کر
یہ بات نہیں جانی

دل تھام کے چلتے ہیں
لوگ محبت میں
کیا رنگ بدلتے ہیں

وہ دھوپ کا حصہ تھا
سورج کا سایا
دن آنکھ میں بیٹھا تھا

باہر سے کالا ہوں
لیکن اندر سے
پھولوں کی مالا ہوں

تانگے کی سواری ہے
غم ہی غم پائے
کیسی تری یاری ہے

کتاب گھر

کتاب میلہ تعارف: حیدر قریشی

اقبال اور ترک (تحقیق و تالیف) **محقق و مولف: ڈاکٹر خلیل طوق اُر**

صفحات:155 **قیمت**: 120 **روپے** **ناشر**: بزمِ اقبال۔نرسنگداس گارڈنز،2۔کلب روڈ۔لاہور

ڈاکٹر خلیل طوق اُر ترکی میں اردو کا چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔''اقبال اور ترک'' اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد کتاب ہے۔ پہلے حصہ میں علامہ اقبال کی نظر میں ترک قوم کا ذکر ہے۔سلطنتِ عثمانیہ کے زوال اور خاتمہ کا دکھ اور عربوں کی بے حسی بلکہ بے وفائی کو اقبال نے شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔اس باب میں اقبال کی شاعری کے حوالے دیتے ہوئے ماضی کی تاریخ کے کئی اہم گوشے سامنے لائے گئے ہیں۔حصہ دوم میں ترکوں کی نگاہ میں علامہ اقبال کا مقام و مرتبہ بیان کیا گیا ہے۔اس حصہ میں ایسے ترک دانشور بھی ہیں جو انقلابی ذہن رکھتے تھے اور مذہبی انتہا پسندی سے متنفر تھے،انہوں نے اقبال کو اپنے زاویے سے دیکھا اور پسند کیا ہے۔جبکہ ایسے مذہبی لوگ بھی ہیں جنہوں نے فکر و فلسفہ کی کسی جہت کی بجائے صرف مذہبی عقیدت کے ساتھ اقبال کو چاہا ہے اور اس لگن میں انہیں جنت کی بشارت بھی عطا کر دی ہے۔بہر حال یہ کتاب اقبال اور ترکوں کے حوالے سے بڑی عمدہ معلومات کی حامل کتاب ہے۔اسے خلیل طوق اُر نے صرف مرتب نہیں کیا بلکہ بڑی عرق ریزی کے ساتھ تحقیق بھی کی ہے۔آخر میں علامہ اقبال پر ترکی کی یونیورسٹیوں میں ہونے والے تحقیقی کام کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے جو بلا شبہ قابلِ رشک ہے۔

خوش کن ہے پت جھڑ (ہائیکو) **ہائیکو نگار: سہیل احمد صدیقی**

صفحات:128 **قیمت**:100 **روپے** **ناشر**: کینوپس۔آر۳۹۳۔سٹی ولاز،اسکیم33،یونیورسٹی روڈ،کراچی

سہیل احمد صدیقی اردو ماہیے کے فروغ میں سنجیدہ اور بامعنی کام کر رہے ہیں۔''خوش کن ہے پت جھڑ'' ان کے ہائیکو کا مجموعہ ہے۔اس میں مقفیٰ ہائیکو اور غیر مقفیٰ ہائیکو کو الگ الگ حصوں میں پیش کیا گیا ہے۔غیر مقفیٰ ہائیکو جاپانی مزاج سے زیادہ قریب لگتے ہیں۔دونوں حصوں سے دو دو ہائیکو نمونہ کے طور پیش ہیں۔

اشکوں کا سیلاب
مجھ کو سنگ لے جائے گا
یادوں کا گرداب

بے کل لگتی ہے
دروازے کے پیچھے سے
مجھ کو تکتی ہے

ہر چہرہ شاداب
ہر موسم سے بڑھ کر ہے
چیری کا موسم

منظر پُر اسرار
جنگل کے سناٹے میں
مینڈک کی آواز

غالب تنقید (ایم فل کا مقالہ) **مصنف و محقق: جاوید رحمانی**

صفحات:168 **قیمت**: 110 **روپے** **ناشر**: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

غالبؔ اردو کے ایسے شاعر ہیں جو اپنی زندگی میں ناقدری کا شکار رہے لیکن جن کی وفات کے بعد ان کے فن پر اتنی توجہ دی گئی کہ اردو تنقید و تحقیق میں غالبیات کا ایک شعبہ سا بن گیا۔جاوید رحمانی کی زیرِ نظر کتاب اسی غالبیات سلسلے کی ایک کڑی ہے۔غالب کی زندگی اور فن پر اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے،جاوید رحمانی نے اس میں سے بیشتر اہم تحریروں کو اپنے مقالہ میں سمیٹ لیا ہے۔ایم فل کے تحقیقی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر جاوید رحمانی نے کافی محنت کی ہے اور دوسروں کے تاثرات یا فیصلوں پر اپنی رائے بھی دی ہے۔اس رائے سے اختلاف کے کئی پہلو بھی نکلتے ہیں۔جاوید رحمانی نے کئی جگہ شعوری طور پر غالب کے مخالف اور موافق آراء پر ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے ایک خاص قسم کا توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے باوجود ایسے لگتا ہے جیسے جاوید رحمانی غالبؔ کی عظمت کے قائل نقادوں سے کچھ زیادہ شاکی ہیں،خاص طور پر ان نقادوں سے جن کے بنیادی کام نے غالبؔ کی عظمت کی تفہیم میں بنیادی کردار ادا کیا۔اگر مقالہ کے آخر میں ایک محاکمہ شامل کر لیا جاتا تو ان کی رائے کا مجموعی تاثر زیادہ بہتر طور پر سامنے آ جاتا۔غالبیات کے حوالے سے جو کچھ اب تک لکھا گیا ہے،اس سارے کو سرسری نظر سے دیکھنا ہو تو صرف اسی کتاب کا مطالعہ کافی رہے گا۔اسی کتاب سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالبؔ کو کس زاویے سے مزید سمجھنا ہو تو کونسی پہلی کتابیں زیادہ بہتر رہیں گی۔جاوید رحمانی کو اس محنت پر داد دی جانی چاہئے۔

اردو مرثیے کا سفر **مصنف و مولف: عاشور کاظمی**

صفحات:1224 **قیمت**: 200 **روپے** **ناشر**: عاشور کاظمی فاؤنڈیشن، برمنگھم، انگلینڈ

ایک ہزار دو سو چوبیس صفحات کی بھاری بھرکم کتاب دیکھ کر ویسے ہی بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دینے والی حالت ہو جاتی ہے اور جب کتاب اتنی خوبصورت چھپی ہو کہ کسی چھاپہ خانے کی بجائے بیوٹی پارلر سے چھپی ہوئی دکھائی دے تو اسے چوم کر چھوڑنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔عاشور کاظمی اس نوعیت کی کتابیں مرتب کرنے کا کافی تجربہ رکھتے ہیں۔ان کی پہلی مرتب کردہ کتابوں کا تجربہ ان کے کام آیا ہے اور اسی کے نتیجہ میں وہ ایسی ضخیم کتاب کو مرتب کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔انہوں نے ممکنہ حد تک اپنے موضوع سے انصاف کیا ہے۔سولھویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک کے اردو مرثیہ نگاروں کا تذکرہ ترتیب دینا آسان کام نہیں تھا۔ان سے پہلے جن لوگوں نے بھی اس نوعیت کا کوئی کام کیا ہے، یہ کام بلا شبہ ان سب پر حاوی ہو گیا ہے۔اسے اس موضوع پر مستقل دستاویز کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔عاشور کاظمی ایسا محنت طلب کام اتنی محنت و مشقت اور اتنی خوبصورتی کے ساتھ مکمل کرنے پر داد اور مبارکباد دونوں کے مستحق ہیں۔

کرچیاں: (شاعری مصوری)   **شاعرہ، مصورہ**: **پروین شیر**

صفحات: (کافی ٹیبل سائز) 276 **قیمت**:60ڈالر یا یورو۔ **ناشر**: بزمِ تخلیق ادب۔کراچی

پروین شیر کے فن کی کئی جہات ہیں۔ان میں نمایاں موسیقی،مصوری اور شاعری ہیں۔موسیقی میں ان کی خاص دلچسپی ستار جیسے قدیم ساز میں ہے،مصوری میں انہوں نے تصویر اور منظر کشی کو تجریدیت کے ساتھ ایسے ہم آہنگ کیا ہے کہ تجرید سے اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی بلکہ ناظرین اس کے مفہوم کی پرتیں الٹنے لگتے ہیں۔شاعری میں انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں تاہم آزاد نظم کو زیادہ مرغوب رکھا ہے۔اس میں انہوں نے نظم کا ابلاغ کہیں بھی الجھاؤ کا شکار نہیں ہونے دیا۔بہت زیادہ دانشوری بگھارنے کی کوشش بھی نہیں کی۔اپنے سیدھے اور سچے جذبات اور خیالات کو سادگی کے حسن کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔''کرچیاں''میں ان کی شاعری کے ساتھ ان کی مصوری کے فن پارے بھی شامل ہیں۔شاعری اور پینٹنگز کے ساتھ ان کا انگریزی ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔یہ تراجم کرنے والوں نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔یوں یہ ایک نادر اور منفرد مجموعہ بن گیا ہے۔پروین شیر کی شاعری کا مفہوم ان کی پینٹنگز اور تصاویر میں اپنے معانی کی توسیع کرتا ہے۔یہ ان کا کمال ہے۔کافی ٹیبل سائز کی کتاب کے لحاظ سے بھی شاید اردو میں یہ پہلا مجموعہ چھپا ہے۔شاعری کے ہر فن پارے کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ اور پروین شیر کی اس سے متعلق مصوری، نے اس کتاب کو سہ آتشہ بنا دیا ہے،یوں اسے متنوع مزاج قارئین کا حلقہ دستیاب ہوسکتا ہے۔

عکاس،اسلام آباد(ادبی کتابی سلسلہ:۵)   **مدیران**: **ارشد خالد، محمد افضل**

صفحات:80   **قیمت**:30 **روپے**

ملنے کا پتہ:1164،گلی نمبر2،بلاک سی،نیشنل پولیس فاؤنڈیشن۔سیکٹر O-9 ۔لوہی بھیر،اسلام آباد

ارشد خالد خانپور کے زمانہ سے اپنا ادبی کتابی سلسلہ گاہے بگاہے نکال رہے ہیں۔اسلام آباد آنے کے بعد بھی انہوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا ہے۔ادبی کتابی سلسلہ کی یہ پانچویں کتاب ہے۔اس کا سرورق حضرت امام حسینؑ کے روضہ مبارک کی تصویر سے سجا ہوا ہے۔''ایک گوشہ محرم الحرام کے حوالے''سے دیا گیا ہے۔نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی فرقہ وارانہ تعصب نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سارے شعراء کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر شیعہ سنی کے درمیان کوئی فساد نہیں ہے۔سنی کے نام کی آڑ لینے والے اصل فسادی کوئی اور ہیں۔اہلِ تشیع کے ساتھ سنی شعراء نے بھی اہلِ بیت کی محبت میں ڈوب کر عقیدت کا اظہار کیا ہے۔غیر مطبوعہ کلام کے ساتھ بہت سارا مطبوعہ مگر یادگار اور مستقل حوالے کا کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔حمید سہروردی اور ارشد خالد کے افسانے کربلائی حوالوں کے ساتھ ہیں۔کربلائی موضوع سے ہٹ کر دیگر لکھنے والوں میں ڈاکٹر شہناز نبی،کامران کاظمی اور حیدر قریشی شامل ہیں۔ارشد خالد نے اداریہ کا اختتام ان الفاظ میں کیا ہے:''ادب میں ضخیم رسائل کا'مصر کا بازار'سجا ہوا ہے اور میں اس بازار میں'سوت کی اَٹی'جیسا اپنا عکاس لئے پھر رہا ہوں۔گر قبول افتد زہے عزوشرف!''

پروفیسر نذر خلیق (خانپور)

دیر کبھی نہیں ہوتی

طاہر نقوی اردو افسانے میں ایک جانے پہچانے نام ہیں۔''دیر کبھی نہیں ہوتی''ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے اس سے پہلے''بندلبوں کی چیخ''1982ء میں آدم جی ادبی انعام حاصل کر چکا ہے جب کہ 1989ء''حبس کے بعد پہلی بارش''اور 1998ء میں''شام کا پرندہ''قبولِ عام کا درجہ حاصل کرنے والے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جب کہ مختلف موضوعات پر مضامین اور ٹی وی ڈراموں کا ایک انتخاب شائع ہونے والا ہے۔طاہر نقوی کا افسانوی مجموعہ''دیر کبھی نہیں ہوتی''ادارہ ممتاز مطبوعات''گلشن اقبال کراچی سے شائع ہوا ہے اس میں تقریباً25افسانے شامل ہیں۔

یوں تو اس افسانوی مجموعے میں مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو انسانی کرب اور انسانی جبلتوں کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن اس افسانوی مجموعے میں زیادہ تر افسانے''عورت''کی نفسیات اور''عورت''کی داخلی کمزوریوں اور حقیقتوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔''عورت''جب کسی ایک چیز کو اپنے ذہن اور دل میں بٹھا لیتی ہے تو اس سے چھٹکارا پانا یا اسے چھوڑنا اس کے لیے کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔یہ بات اس افسانوی مجموعے کے افسانے ''دیر کبھی نہیں ہوتی''بیان کی گئی ہے۔طاہر نقوی کے اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ عورت اتنی کمزور ہوتی ہے کہ وہ اپنی عادت اور فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہے مثلاً اس افسانے کی ان سطور سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔

> ''جب تک میں گھر میں موجود رہتا وہ مطمئن رہتی مگر جیسے ہی کہیں جانے کا ارادہ کرتا وہ بھانپ لیتی اور پریشانی اس کے چہرے سے عیاں ہو جاتی شاید اسے اپنی بے بسی جان کر وہ چُپ رہتی میں خود بھی اس کی اس کیفیت کو محسوس کر لیتا اور ناگواری کا تاثر میرے وجود پر چھا جاتا جو میرے چہرے سے ظاہر ہونے لگتا۔وہ خوف سے کچھ نہ بولتی تاہم میرے جاتے وقت وہ رہ نہ پاتی اور وہی سوال کر بیٹھتی شاید یہ بات اب اس کی نفسیاتی کمزوری بن کر رہ گئی تھی۔کہیں بیٹھے بیٹھے مجھے دیر ہو جاتی

تو میں سوچتا کہ گھر فون کر کے بیوی کو اطلاع دے دوں مگر اسی سوال کے ذہن میں آتے ہی میں اپنے اس خیال کو ذہن سے کھرچ دیتا البتہ جب میں رات گئے گھر لوٹتا تو وہ مجھ سے کوئی استفسار نہ کرتی بلکہ کھوجنے والی نگاہوں سے تکتی رہتی۔'' ۱

اس افسانوی مجموعے میں شامل افسانہ ''ستارہ'' عورت اور اونچے طبقے کی جتنی عکاسی کرتا ہے وہ شاید کسی اور افسانے میں نظر آتی ہو۔ اس افسانے سے کئی نفسیاتی اور جبلی حقیقتوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ عورت جو چھوٹی چھوٹی خواہشات کے ہاتھوں اسیر ہو کر زندگی کے اہم فیصلے کر بیٹھتی ہے اور اس پر اسے پشیمانی تک نہیں ہوتی اور زندگی کی شاہراہ پر چلتے چلتے اپنے وجود اور باطن کی عظمت تک کو فراموش کر بیٹھتی ہے۔ وہ اس افسانے میں نمایاں ہے۔ ''ستارہ'' ایک ایسی عورت ہے جو اپنے حسن اور جمال میں بے مثال ہے لیکن اسے اس کا احساس ہوتے ہوئے بھی اپنی اس دولت کو ایک بوڑھے سلطان مرزا کے حوالے اس لیے کر دیتی ہے کہ وہ دولت مند ہے حالانکہ وہ اس دولتِ حسن کو اس کے حوالے کرنا چاہیے تھا جو قدرت نے اسے کا ہم عمر مرد بنایا تھا تا کہ مستقبل میں وہ مسائل پیدا نہ ہوتے جو بعد میں پیدا ہوئے۔ ''ستارہ'' کے ساتھ بھی وہی ہوا جو ہر اس عورت کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنی عمر سے دگنی عمر کے مردوں سے کسی لالچ یا مجبوری کی وجہ سے شادی کر لیتی ہیں۔ خاوند کی وفات کے بعد وہی بے راہ روی اور وہی بدن کی پیاس بجھانے کا عمل اس افسانے کا اہم موضوع ہے۔ اس افسانے کی سب سے نمایاں بات اونچے طبقے کی وہ خرابیاں ہیں جو صرف اس لیے پوشیدہ رہتی ہیں کہ اونچا طبقہ اپنی دولت اور اپنے جھوٹے معیار کی وجہ سے اپنی خامیاں ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ افسانے کی ان سطور کو دیکھا جا سکتا ہے۔

''اس کے حسن کے چرچے دور دور تک پہنچ گئے۔ دولت مند سلطان مرزا بھکاری بن کر اپنی لمبی اور چمکدار گاڑی میں بیٹھ کر اس کے دروازے پر بھیک مانگنے چلا آیا اپنے سے دُگنی عمر معمولی شکل وصورت اور گہنائے ہوئے رنگ کے باوجود سلطان مرزا کے رشتے پر فوراً راضی ہو گئی۔ ایسے مرد کو کم عمر اور خوبصورت لڑکی مل جائے تو اس کے اشاروں پر با خوشی ناچتا ہے۔ ''ستارہ'' کو اپنے حسن کی طاقت کا احساس تھا۔ اس نے اپنے شوہر کو شیشے میں اتارتے ہوئے ایک روز کہا کہ جب مجھ جیسی بیوی تمہارے گھر میں موجود ہے تو تمہیں کلب اور پارٹیوں میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ سلطان مرزا میں اس کے خلاف جانے کی ہمت نہ تھی'' ۲

''ستارہ'' کی ان سطور کے بعد مندرجہ ذیل سطور بھی بہت اہم ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

''مسز خان نے اپنی بات واضح کرتے ہوئے بتایا کہ یہ محفلیں ہر ہفتے شہر کے مختلف پوش علاقوں میں ہوتی ہیں۔ ایسے لڑکوں کا انتخاب متوسط

،غریب اور ضرورت مند گھرانوں سے کیا جاتا ہے کیونکہ وہ معقول معاوضہ لے کر راز داری کا وعدہ کرتے ہیں۔ رات کو بستر پر لیٹے ہوئے بھی وہاں کا منظر ''ستارہ'' کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا وہ دیر تک بیگمات اور لڑکے کے بارے میں سوچتی رہی اسے وہ سب کچھ بے شرمی اور غیر مہذب لگا اور ساتھ ساتھ پُر لطف بھی، کبھی سوچتی کہ ایسے ماحول سے کنارہ کشی کر لے اور کبھی سوچتی کہ اپنی ویران زندگی کے چند لمحات یوں تفریح میں گزر جائیں تو کیا حرج ہے ایسی کشمکش میں اکثر دل کی بات مان لی جاتی ہے۔'' ۳

''ستارہ'' کے علاوہ ان کے دیگر افسانے ''محبت کی ایک اور کہانی'' میں عورت کی ازلی محبت اور بے لوث چاہت کو نمایاں کیا گیا ہے جب کہ ان کا افسانہ ''ضرورت مند'' میں پھر وہی عورت کی جنسی پیاس کو موضوع بنایا گیا ہے کہ جنس ایک جبلت ہے اور جبلت کو قابو کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا تصور کر لیا جاتا ہے۔ بھوک مٹانے کے لیے کچھ کھانا پڑتا ہے اور جنس کی تسکین ہی جنسی جبلت کو قابو میں لا سکتی ہے۔ ''ضرورت مند'' میں کسی کی جبلت بھوک ہے اور کسی کی جنس۔ ''وہ جو اجنبی تھا'' میں بھی اسی جنسی جبلت کو نمایاں کیا گیا ہے جب کہ ''ایک اور پگلی'' میں مرد کی جنسی پیاس اور جبلت نمایاں ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس قدر خود غرضی اور لالچ ایک جنس پرست کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے کہ اپنی جنسی پیاس بجھانے کے لیے ایک خود غرض مرد، ایک پاگل اور اپنے ہوش سے بے خبر عورت کی عزت بھی تار تار کر دیتا ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں یوں تو سارے افسانے سچ لیے ہوئے ہیں اور کوئی بھی افسانہ ساختگی اور تکنیک کی مدد سے مکمل نہیں کیا گیا لیکن اس افسانوی مجموعے کا اہم ترین موضوع اور غالب موضوع عورت ہی ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں عورت اپنے وجود کے ہاتھوں مجبور بھی ہے اور اپنے وجود پر نازاں اور خود سر بھی تاہم اس افسانوی مجموعے میں دو افسانے ''ابھی وقت ہے'' اور ''پاکستان 2010ء'' موجودہ حالات پر اہم افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں معاشرتی خود غرضیاں اور حال اور مستقبل کی کشمکشوں کو موضوع بناتے ہوئے فکری رویے نمایاں ہوئے ہیں۔ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ طنزیہ انداز بھی موجود ہے اس سلسلے میں ''پاکستان 2010ء'' کی ان سطور کو دیکھا جا سکتا ہے۔

''اندھیرا ہمیشہ عجیب وغریب وسیلہ ہوتا ہے کسی کو پناہ دیتا ہے کسی کو ورغلاتا ہے اور کسی کو مجبور کر دیتا ہے اس نے اپنی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو صاف کیے اور سہمے ہوئے لہجے میں گویا خود سے کہا ''ان کے ہتھے چڑھ جاتی تو نجانے وہ میرا کیا حشر کرتے'' معاشی بدحالی مختلف برائیوں کو جنم دے رہی تھی۔ معاشرہ دو مخالف انتہاؤں میں بٹا ہوا تھا اور درمیان میں وسیع خلیج حائل تھی۔ زرینہ میرے کمرے میں ادھر ادھر نظر

دوڑاتی رہی مگر اس نے میری بے سروسامانی پر کوئی حیرت ظاہر نہیں
کی۔ کیونکہ سب ایک دوسرے کے حالات سے واقف تھے۔'' [۴]

طاہر نقوی نے بیانیہ انداز اختیار کیا ہے۔ اپنے افسانوں کو علامت کے بوجھل پن سے دور رکھتے ہیں۔ تجریدیت کی بے مقصد گہرائیوں سے بھی بچتے ہیں۔ بے ساختگی اور فطری انداز ان کے افسانوں میں اجنبیت سے بچاتے ہیں۔ ان کے افسانے ذات اور داخلی حقیقتوں کو لیے ہوئے ہیں۔ ہمیشہ ان سماجی اور معاشرتی موضوعات کو افسانوں میں لے آتے ہیں جو کرب ناک اور چونکا دینے والے ہوتے ہیں۔ تاہم ان کے موضوعات معاشرے میں نظر بھی آتے ہیں اور انسان کی ذات کے اندر پوشیدہ بھی رہتے ہیں۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ طاہر نقوی ایک کامیاب اور اسلوب و موضوعات کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہنے والے افسانہ نگار ہیں۔

حوالہ جات

1۔ دیر کبھی نہیں ہوتی از طاہر نقوی، ادارہ ممتاز مطبوعات گلشن اقبال کراچی ص:۸
۲۔ دیر کبھی نہیں ہوتی از طاہر نقوی، ادارہ ممتاز مطبوعات گلشن اقبال کراچی ص:۱۵
۳ دیر کبھی نہیں ہوتی از طاہر نقوی، ادارہ ممتاز مطبوعات گلشن اقبال کراچی ص:۱۸
۴۔ دیر کبھی نہیں ہوتی از طاہر نقوی، ادارہ ممتاز مطبوعات گلشن اقبال کراچی ص:۱۷۰

آپ کے خطوط، ای میلز اور تاثرات

☆☆☆

☆☆☆ آپ کا خوبصورت جریدہ جدید ادب ملا، شکریہ آپ نے یاد رکھا۔آپ کا میرا رشتہ بہت پرانا ہے۔میرا ایک استاد تھا ہر دلعزیز، دل کے قریب، دل کا سلطان، میرے دل میں ہر دَم حاضر پروفیسر ناصر۔ہائے اب مرحوم کیسے کہوں؟ آپ کا رسالہ دیکھا اور آپ کا مضمون پڑھ کر کیا کیا یادیں تازہ ہو گئیں۔وہ مثل سائبان کے تھا۔۔۔۔۔ جب ملتے کہتے حیدر کے ہاں جانا ہے۔افسوس کے میں ہی ماٹھا نکلا، وہ تیز تھا۔حیدر سے بھی ملتا رہا اور ہم سے چھوٹ کر پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔وہاں ہم سب نے جانا ہے۔
حیدر! رسالہ بھیجنے کا بہت شکریہ، خوبصورت تحفہ ہے۔ **ڈاکٹر ظہور احمد اعوان**۔پشاور

☆☆☆ حیدر قریشی اور نذر خلیق کی ادارت میں جرمنی سے چھپنے والے ادبی جریدہ جدید ادب کا نیا شمارہ نمبر ۸ شائع ہو گیا ہے۔یہ پہلا موقعہ ہے کہ جنوری ۲۰۰۷ء کا یہ شمارہ اپنے وقت سے پہلے ریلیز ہو گیا ہے۔اس میں ڈاکٹر رشید امجد کے لئے ایک گوشہ مختص کیا گیا ہے۔اس گوشہ کے لکھنے والوں میں منشا یاد، ناہید قمر، صفیہ عباد شامل ہیں۔صفیہ عباد کا طویل مقالہ اس گوشے کی ایک اہم پیش کش ہے۔دیگر مندرجات میں معمول کے مطابق مضامین، افسانے، غزلیں، نظمیں، ماہیے، خصوصی مطالعہ اور تبصرے وغیرہ شامل ہیں۔متعدد اہم لکھنے والوں میں سے چند اہلِ قلم کے نام یہ ہیں: جوگندر پال، وزیر آغا، صبا اکبر آبادی، قاضی سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر جمیل جالبی، حمایت علی شاعر، شمیم حنفی، مظفر حنفی، ڈاکٹر شفیق احمد، نذیر ناجی، سلطان جمیل نسیم، تاجدار عادل، حسن عباس رضا قاضی اعجاز محور، خورشید اقبال، عظیم انصاری، خاور اعجاز، ناظم خلیلی، سہیل احمد صدیقی، جان عالم، ھانی السعید المصر ی، شاہد ماہلی، شہناز نبی، ارشد خالد، نصرت ظہیر، اکبر حمیدی، امین خیال، یونس خان، کامران کاظمی، رضیہ فصیح احمد، ناصر نظامی اور نسرین نقاش۔اس شمارہ میں فوت شدگان میں ن۔م راشد، میرا جی، اختر الایمان کی نظمیں قندِ مکرر کے طور پر شامل کی گئی ہیں۔امریکی مصنفہ کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب حضرت محمدﷺ (MUHAMMAD) پر یونس خان کا تعارفی مضمون اور حیدر قریشی کا مضمون ''رہے نام اللہ کا!'' اس شمارہ کی خصوصی تحریریں قرار دی جا سکتی ہیں۔

سعید شباب (خانپور)

(یہ خبر urdu_writers@yahoogroups.com سے مورخہ ۲۹ر نومبر ۲۰۰۶ء کو ریلیز ہوئی)

☆☆☆ جدید ادب کا تازہ ترین شمارہ ملا۔دلّی جا رہا تھا اِس لیے اُسے ساتھ ہی لیتا گیا۔دلی کے دو روزہ قیام کے دوران پورا رسالہ پڑھ ڈالا، یہاں تک کہ خطوط بھی نہ بچے۔زیادہ تر مضامین اچھے لگے۔غزلوں کا انتخاب بھی خوب ہے۔آپ کی محنت کی داد دیے ہی بنتی ہے۔خدا آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔
رشید امجد کے افسانے اچھے ہیں لیکن اُن کا تصورِ وقت اُن کا نہیں۔ولیم جیمز کی دین ہے اور شعور کی رو والے افسانہ یا ناول نگاروں نے اُسے خوب برتا ہے۔ہاں البتہ رشید امجد کے ٹریٹ منٹ میں ندرت ضرور ہے جس کی اُن کو داد دی جانی چاہیے۔ **پروفیسر ظہور الدین**۔جموں، توی، انڈیا

☆☆☆ آپ کا تازہ رسالہ (جنوری سے جون ۲۰۰۷ء والا) مل گیا ہے۔میرے افسانے کی شمولیت کا شکریہ۔۔پچھلے شمارے میں میری ٦ غزلیں اور ڈاکٹر انیس صدیقی کے مجھ پر تحریر کردہ مضمون کو بھی جگہ دی تھی جس پر ڈاکٹر بلند اقبال نے تازہ شمارے میں اپنے ایک مکتوب میں کافکا کے حوالے سے ایک دلچسپ جملہ لکھا ہے۔(اب ہمیں کو ایک دوسرے کو پڑھنا اور ایک دوسرے پر تبصرہ کرنا ہے، عوام تو بیچارے کبھی کے ان بکھیڑوں سے دور ہو گئے)۔
شعرائے کرام سبھی عمدہ ہیں، ایک سے ایک منتخب اور چنیدہ۔لیکن پتہ نہیں کیوں آپ کے جدید ادب کی ابتدا ہمیشہ ٹوپی پہن کر ہوتی ہے۔ایسی ہی کچھ چیزوں نے اردو کو مسلمانوں کی زبان بنا کر رکھ دیا ہے۔اگلا شمارہ کسی عیسائی دعا یا ہندوا شلوک اور دوہوں سے یا سکھوں کی پنتھیوں سے کریں۔۔۔۔خاور اعجاز صاحب کی غزلیں، نظمیں بھی بڑی عمدہ ہوتی ہیں لیکن اپنے سلام میں انہوں نے لفظ موضوعات کو ضرورتِ لفظی کے ذیل میں کچھ دبا سا دیا ہے، جس کی وجہ سے شعر کی روانی میں تھوڑی سی اڑس پیدا ہو گئی ہے۔سرورق پر آپ کا خوبصورت ماہیا دیکھ کر مجھے اپنا وہ اکلوتا ماہیا یاد آ گیا جو میں نے آپ کی ایما پر لکھا تھا۔ وہ شِیر تھی میں خرمار خوب یہ جفتی تھی/ وہ آنکھ تھی، میں سُرمہ

ناظم خلیلی (رائچور)

☆☆☆ جدید ادب حیدر قریشی اور نذر خلیق کی ادارت میں جرمنی سے شائع ہونے والا ایک موقر جریدہ ہے۔جس کے (۲۰۰ صفحات پر مشتمل) تازہ شمارے میں افسانے، غزلیں، نظمیں، مضامین، تبصرے ہی نہیں، گوشۂ ڈاکٹر رشید امجد بھی شامل ہے لیکن یہ گوشہ دیکھ کر کہیں سے یہ نہیں لگتا کہ یہ دوسرے جرائد کی طرح تجارتی نقطۂ نظر کا حامل ہے۔اس گوشے میں ناہید قمر، منشا یاد اور صفیہ عباد کے سیر حاصل مضامین کے علاوہ صاحبِ گوشہ کا ایک افسانہ ''پژمردہ کا تبسم'' جدید ادب کی رونق ہے۔
انٹرنیٹ دیکھنے والے جدید ادب کو اس سائٹ www.jadeedadab.com پر دیکھ سکتے ہیں۔ہندوستان میں جدید ادب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔٦ سے منگا سکتے ہیں۔

(مطبوعہ ادبی صفحہ ''ادب و ثقافت'' **روزنامہ انقلاب بمبئی**۔۲۴ر دسمبر ۲۰۰۶ء)

☆☆☆ Your article in JA was interesting and informative. M.Saleem is my frieind and has published two books.
منشا یاد۔اسلام آباد

☆☆☆ جدیدادب کا تازہ شمارہ مل گیا ہے۔یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے اس میں گوشۂ رشید امجد رکھا ہے۔
ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ۔ہائیڈل برگ، جرمنی

☆☆☆ Thank you very much for your message. I had seen the recent issue of Jadeed Adab on the internet, and have read a bigger part of it.Congratulations.
آپ نے اپنے پرچے کا ایک معیار بنالیا ہے۔ایک بات یقیناً ناقابلِ تردید ہے کہ اس پر آپ کی بھرپور چھاپ ہے جس سے اس پرچے کی ایک اپنی انفرادیت بھی قائم ہوگئی ہے۔مجھے ایک چھوٹا سا اعتراض یہ ہے کہ آپ پرچے میں بہت سی طبع شدہ تحریریں بھی ڈال دیتے ہیں۔ممکن ہے یہ بہت سے لوگوں کے لئے نئی ہوں مگر جو احباب انہیں پڑھ چکے ہیں وہ ان کی بجائے کچھ اور پڑھنا پسند کریں گے۔میں تازہ شمارے میں اپنے ناول پر مضمون نہیں دیکھ سکا۔وہ اس پرچے میں ہے یا آپ اسے اگلے شمارے میں شامل کریں گے؟محبتوں اور نیک تمناؤں کے ساتھ۔
فاروق خالد۔ایمسٹرڈیم۔ہالینڈ

☆☆☆ جدیدادب:۸ جتنی بار دیکھا اور پڑھا،اُسے پہلے سے بہتر پایا اور اسی کی آپ سے توقع بھی رہتی ہے۔
نصرت ظہیر۔دہلی

☆☆☆ ’جدیدادب‘ کا نیا پرچہ دیکھا، جو مجھے جناب سلطان جمیل نسیم صاحب کے وسیلے سے ملا۔میں آپ کی ہمت اور حوصلہ کو ہدیہءتہنیت پیش کرتا ہوں کہ جرمنی میں رہتے ہوئے آپ ایک نہایت معیاری اور شاندار رسالہ مسلسل نکال رہے ہیں، مجھے ذاتی طور پر اندازہ ہے کہ کوئی ادبی رسالہ شائع کرنا اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرنے کے برابر ہے۔یہ اتنی بری لت ہے جو آدمی کو گھر کا رکھتی ہے نہ گھاٹ کا،تخلیقی صلاحیتوں کو بھی یہ شوق گھن کی طرح کھوکھلا کر کے رکھ دیتا ہے۔اس بارے میں زیادہ لکھنے کے بجائے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ سلام آپ کو۔
ڈاکٹر شفیق احمد کا مضمون بہت معلوماتی ہیا ورکیوں نہ ہو وہ تحقیق کے آدمی جو ٹھہرے۔آپ کو شاید یاد ہو جب مرحوم اشفاق احمد اردو ترقی ءبورڈ کے سربراہ تھے تو انہون نے متروک الفاظ کی ایک لغت بھی شائع کی تھی اب کوئی ادارہ اس لغت کو معیار بنا کر ڈاکٹر شفیق صاحب سے اس اہم موضوع پر مزید کام کرا کے شائع کر سکے تو متروک الفاظ یا سوئے ہوئے الفاظ کو دوبارہ اہل قلم بیدار اور متحرک کر سکتے ہیں،لیکن یہ کام کون کرے گا۔!اردو زبان کے بارے میں تو آپ نے اپنی ادارتی شذرہ میں تمام حقیقت کو کھول کے بیان کر دیا ہے۔ برصغیر کے علاوہ یورپ میں جو بقول آپ کے جعلی اہلِ قلم، اپنا پیسہ خرچ کر کے ہندوستان اور پاکستان کے رسالوں سے اپنے گوشے اور نمبر نکلوا

رہے ہیں وہ بھی جناب نذیر ناجی کے مضمون کے مرکزی کردار سے کچھ کم نہیں ہیں،لیکن رسالے والے بھی کیا کریں ان کو اپنا رسالہ بھی چلانا ہے اور گھر کو بھی دیکھنا ہے۔
جدیدادب‘ کی مجھے یہ بات بھی اچھی لگی کہ آپ نے ن م راشد، اختر الایمان اور ڈاکٹر وزیر آغا کی نظمیں نئی نسل کی رہنمائی کے لئے شائع کردیں۔میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ اردو کے کلاسیکی ادب کے لئے ’انشاء‘ کے کچھ صفحات مخصوص کروں۔گزشتہ دنوں شوکت صدیقی، منیر نیازی، محسن بھوپالی اور شریف کنجاہی کی اموات نے زبان وادب کو کچھ اور مفلس کردیا۔آخر میں پھر آپ کی ہمتوں کی داد دیتا ہوں۔رسالے کی اشاعت کے سلسلے میں آپ کی رہنمائی کا منتظر۔مخلص۔
صفدر علی خاں۔حیدرآباد، سندھ

☆☆☆ جدیدادب کا شمارہ:۸ آج ۱۳رجنوری ۰۷ کو یہاں پہنچا۔اتنا اچھا رسالہ پا کر کون کا فرخوش نہ ہوگا؟اگر رسید نہ لکھوں تو سخت بے ایمانی، نااہلی اور کم ہمتی ہوگی۔اس لئے وقت نکال کر یہ چند سطریں ضبطِ تحریر میں لا رہا ہوں۔یہ شمارہ خوبصورت ہے، presentable ہے۔پرچے میں سبھی کچھ ہے۔علمی اور معیاری انداز کا مواد پوری پوری داد چاہتا ہے۔رشید امجد نے ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ہنوز توانا اور تازہ فکر دکھائی دیتے ہیں اور ان کی تخلیقات سے آپ نے اپنا رسالہ سجا کر، نمایاں کر کے ایک مہان قلم کار کا حق تسلیم کیا ہے،اسے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔میری رائے میں اداریہ خوب سوچ سمجھ کر لکھا گیا ہے لیکن بات آگے بڑھتی نظر نہیں آتی،عمل ہوتا نظر نہیں آتا۔اپنے اپنے پسندیدہ موضوعات پر کانفرنس اور سیمینار بلانے والے مل جل کر بیٹھ جاتے ہیں۔اچھی اچھی باتیں بھی کرتے ہیں۔اتنے میں گرانٹ وغیرہ ختم ہوجاتی ہے اور آگے ”فل اسٹاپ“۔جنہیں کام کرنا آتا ہے اور جو اوکھلی میں سر دے کر بھی اُف نہیں کرتے، اُنہیں عطیے لینا، اخراجات بھگتانا اور سرخرو ہونا نہیں آتا۔بہتر یہی ہے جو من میں آئے وہ لکھتے جایئے خواہ انگلیاں فگار ہی کیوں نہ ہوں۔کانفرنس کی سرخی دیرپا نہیں ہوتی مگر لکھا ہوا حرف (گو کانفرنس میں بولنے والے بھی لکھ کر ہی لاتے ہیں) دیر تک شعور کو جگانے کا فعل انجام دیتا رہتا ہے۔یہ ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکری کی مثال شروع میں چھوٹا سا ہی دائرہ بناتا ہے پھر بڑھتا جاتا ہے، بڑھتا جاتا ہے۔ہے نا؟آپ کا معاملہ یوں ہے کہ ”لوگ باتیں بناتے ہیں، سید کام کرتا ہے“ بھائی! حالؔی نے کہا تھا ”کرتے کی سب بدیا ہے“۔پرچہ عمدہ، خوبصورت اور نظر پرور ہے۔
مقصود الٰہی شیخ۔بریڈفورڈ۔انگلینڈ

☆☆☆ جدیدادب شمارہ ۸ موصول ہوا۔دو دن میں اس کا بیشتر حصہ پڑھ لیا ہے۔پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد صاحب کے مضمون سے مکمل طور پر متفق نہیں ہوں۔جہاں تک الفاظ کے متروک اور مروج ہونے کا تعلق ہے اس کے لئے ایک معیار مقرر کرنا ہوگا۔کوئی لفظ چند علاقوں میں تلفظ کے اختلاف بلکہ املا کے خلاف بھی بولا یا برتا جاتا ہے تو اُس کو بے شک متروک نہیں سمجھنا چاہیئے۔مگر ڈاکٹر صاحب بحث کو پھیلاتے ہوئے قدیم حکمرانوں تک لے گئے، اس پر اہلِ علم مباحثہ کر سکتے ہیں۔جب ہندوستان پر ولندیزی اور انگریز حکمران تھے اُس وقت سے ان کی

زبان کے بے شمار الفاظ اردو میں ضم اور مروج ہوئے۔ دوسری بات یہ کہ اردو تو بقول شخصے لشکری زبان ہے، اس سے پہلے مغلوں کے دور میں فارسی سرکاری زبان تھی پھر انگریز آئے تو انگریزی کا چلن عام ہوا مگر ایک نئی زبان بھی ساتھ ساتھ پل اور پنپ رہی تھی۔ اردو میں آج بھی نت نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں تک ڈاکٹر صاحب نے اہلِ زبان اور لغت کی اہمیت کو نہ ماننے کی بات کی ہے وہ بھی اگر مان لی جائے تو زبان کے درست اور نادرست ہونے کے لئے کوئی ایک پیمانہ تو مقرر کرنا ہی ہوگا، اور جو پیمانہ پہلے سے موجود ہے یعنی قوائد تو اس کے مطابق لکھی جانے والی زبان درست مانی جائے تو بہتر ہے۔ مجھے یاد ہے ایک زمانے میں رسالہ نقوش لاہور کے مدیر نے سوال اٹھایا تھا کہ ''میں نے جانا ہے'' کو غلط کیوں مانا جاتا ہے۔؟ اس کا جواب عصمت چغتائی نے یہ دیا تھا کہ ''میں نے'' کے بجائے ''مینوں'' کر لیجئے ہم استعمال بھی کریں گے اور قوائد کی رو سے درست بھی ہوگا۔ میری ان گذارشات کا مقصد ڈاکٹر شفیق احمد صاحب کے خیالات کے ایک چھوٹے سے حصہ سے متفق ہونا نہیں ہے، جس میں وہ بادشاہ سے غالب تک کی نفی کر گئے ہیں۔ میں تو اس بات کا حامی ہوں کہ جب مغربی زبانوں کے بے گنتی الفاظ اردو میں سما گئے ہیں تو برصغیر کے مختلف حصوں میں مروج الفاظ کیوں استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ تقریباً اسی سے ملتی جلتی بات میں نے اپنی حیدر آباد سندھ کی یادوں کو آواز دیتے ہوئے بھی ایک مضمون میں لکھی ہے۔ زبان کی وسعت لازمی ہے اور ساتھ ہی ذہن کی کشادگی بھی۔ لیکن معیار تو کوئی بنانا ہوگا۔۔۔ شوکت تھانوی مرحوم نے اپنے کسی کالم میں یہ بات لکھی تھی کہ جب تک لتا منگیشکر کے گیت سنے جا رہے ہیں ہندوستان سے اردو ختم نہیں ہو گی۔ لتا کے گیت سننے کے باوجود اب ہندستان میں اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ کیوں؟ خود اردو کے ادیب اور شاعر اپنی آنے والی نسل کو اپنی زبان سے بیگانہ رکھ رہے ہیں یہ بات پاک و ہند کے لئے ہے۔ جہاں تک لفظ بھیتر کا تعلق ہے تو یہ نہ صرف ولی دکنی کے یہاں استعمال ہوا بلکہ جگر مراد آبادی نے لکھا.... اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ.... بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ.... لیکن چراغ اور دیئے کے سلسلے میں عرض کروں گا کہ علامہ اقبال کے یہاں چراغ پوری روشنی کے ساتھ موجود ہے اور بعد کے شعرا بھی استعمال کر رہے ہیں یہی صورتِ حال دیئے کی بھی ہے. جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا۔ ان معروضات کا مقصد اختلاف نہیں ہے بلکہ میں نے بات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

آپ کے اداریے کے سلسلے میں ایک روز کراچی سے صفدر علی صاحب کا بھی فون آیا تھا۔ اور وہ جعلی شاعروں کے سلسلے میں آپ سے متفق تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ بھائی اگر شاعری کے لین دین سے دو آدمیوں کا بھلا ہوتا ہے تو ہم شعر بیچنے والے کی روزی پر لات کیوں ماریں۔ یہ کاروبار تو نجانے کب سے چل رہا ہے۔ چلنے دو۔ کوئی ایسا شاعر بتا دو جو شعر خرید کر بھی مستقبل میں شعراء میں شامل رہا ہو۔ میں ادب کا ایک ادنیٰ طالبِ علم ہوں۔ پڑھنے کا شوق ہے اس شوق کی بدولت کچھ سیکھنے کو مل جاتا ہے۔ ورنہ تبصرہ میرا کام ہے نہ منصب۔

نذیر ناجی صاحب کا مضمون (کالم) میں پڑھ چکا تھا۔ نام اور دام ایسے ہی کلنک کے ٹیکوں کو ملتے ہیں۔

رشید امجد کا گوشہ بہت بھرپور ہے۔ ماہیے میں پڑھتا رہا ہوں اور مجھے ہائیکو سے زیادہ دلفریب لگتے ہیں، شاید اپنی

مٹی کی خوشبو ہونے کی وجہ سے۔ میری دعا ہے ''جدید ادب'' اور زیادہ شاندار انداز میں شائع کرنے کی اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت دے۔

سلطان جمیل نسیم۔ ٹورانٹو، کینڈا

☆☆☆ 'جدید ادب' کا آٹھواں شمارہ ملا، جس کی بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ اس کو بڑے خوب صورت گیٹ اَپ میں شائع کیا گیا ہے۔ جس کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس میں گوشۂ ڈاکٹر رشید امجد کی تمام تحریریں جاندار اور خوب صورت ہیں۔ خاص طور پر صفیہ عباد صاحبہ نے اپنا تھیسس ''رشید امجد کے افسانوں کا اسلوبیاتی مطالعہ'' بڑی محنت اور جانفشانی سے تحریر کیا ہے لیکن اس تھیسس کو وائنڈ اَپ نہیں کیا گیا۔ جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے طویل تھیسس سے ایک چیپٹر نکال کر یہاں شائع کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ تھیسس کافی معلومات افزا ہے۔ جس میں رشید امجد صاحب کی افسانوں کے اسلوب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس تھیسس سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف معاشرتی ناہمواری، اخلاقی زوال، معاشی تنگ دستی اور پریشان حالی کو بڑی خوبصورتی سے جدت پسندانہ اسلوب میں ڈھال دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور انہوں نے آپ کی اس خصوصیت کو بڑی خوبصورتی سے اس مقالہ میں آشکار کیا ہے۔ ڈاکٹر ناہید قمر صاحبہ نے ''رشید امجد کا تصورِ وقت'' کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد نے ''اردو اور متروک الفاظ کا مسئلہ'' کو بڑی دردمندی سے پیش کیا ہے لیکن جہاں زبان خود اپنی بقا کے خطرے سے دوچار ہو وہاں متروک الفاظ کا رونا رونا بڑا عجیب لگتا ہے۔ موجودہ ای۔ میل اور ایس۔ ایم۔ ایس کلچر کے حوالے سے اگر اردو کے مستقبل کو دیکھا جائے تو یہ بڑا ہی مخدوش نظر آ رہا ہے۔ کیونکہ ان جدید اور تیز ترین ذرائع میں اردو فونٹ نہ ہونے سے زمانہ رومن اردو استعمال کر رہا ہے جبکہ انگلش ابجد کی کمپوزیشن اردو ابجد کے مقابلے میں آسان بھی ہو تو اسکا مستقبل بہت زیادہ مخدوش ہو جاتا ہے۔ اردو زبان کو مزید خطرہ ٹی۔ وی چینلز سے ہے، ایک طرف اگر ہندوستانی ڈرامہ اور فلم کی وجہ سے روزمرہ زبان میں ہندی الفاظ کی بھرمار ہو رہی ہو اور دوسری طرف پاکستانی چینلز بھی اردو کی بجائے انگلش اور اردو کا کوئی ملغوبہ پیش کر رہے ہوں تو وہاں بہتری کی گنجائش کیا ہو سکتی ہے! اربابِ بست و کشاد کو اس زمرہ میں ضرور سوچ بچار کرنا چاہیے۔

'گفتگو' میں حیدر قریشی نے بھی اردو کی زبوں حالی پر روشنی ڈالی ہے اور اردو کے تینوں مراکز یعنی پاکستان، ہندوستان اور برصغیر سے باہر اردو بولنے والے حلقوں کی اس سلسلہ میں کانفرنس کی سطح پر کچھ کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر عامۃ الناس ہی اپنی زبان سے دور چلی جائے تو پھر ایسی کانفرنسیں کیا کر پائیں گی! ضرورت اس امر کی ہے کہ کیمیونیکیشن کے جدید ذرائع میں اردو کے فروغ کی سنجیدہ کوششیں کی جائیں لیکن جیسا کہ ہمارا معاشرہ جو کہ صرف ایک صارف معاشرہ بن چکا ہے کو کیپٹل ازم کی حامی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے گلوبل ازم کے ہتھکنڈوں سے نبرد آزما ہونے اور جہاں انگلش زبان کو گلوبل زبان کے طور پر پیش کیا جا رہا ہو، سے بچنے اور زبان کو قائم رکھنے کے لئے سرکاری سرپرستی میں سنجیدہ کوششیں ہونی چاہیں لیکن وہاں سے بھی خیر کی امید اس لئے نہیں ہے کہ اگر وہاں بھی گلوبل ازم اور عالمی سرمایہ درانہ نظام کے حامی ہی موجود ہوں جنکو اس سے

کوئی سروکار نہ ہو کہ کوئی زبان مخدوش ہو رہی یا پھیل رہی ہے، تو زبان کو اس کے زوال سے نہیں روکا جا سکتا۔

انگریزی استعمار نے برعظیم پاک و ہند پر قبضہ کیا تو فارسی ختم کر کے اردو کو متوازی زبان کے طور پر ترقی دی۔ ملائیشیا میں ملآیا زبان کے عربی رسم الخط کو ختم کر کے لاطینی رسم الخط نافذ کیا گیا۔ مالٹا میں سامی النسل قدیم زبانوں کو ختم کر دیا گیا۔ مالٹا کی قدیم زبان کا رسم الخط عربی تھا جس کو جبراً لاطینی سے تبدیل کر دیا گیا۔ انگریز سامراج نے براعظم آسٹریلیا کو اپنی پشت در پشت جاگیر سمجھ کر خوب لوٹا، وہاں کی بہت ساری زبانوں کو متروک قرار دے کر انگریزی کو فروغ دیتے ہوئے اسکولوں میں تدریسی زبان بنا دیا گیا۔ انگریزی ادب کو عظیم ادب کے طور پر پیش کیا گیا، جس کی وجہ سے وہاں کے مقامی لوگ اپنی زبانوں کو بھولتے چلے گئے اور ہم تباہی کے اس راستے پر چل پڑے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق دنیا میں اس وقت کل بولی جانے والی پانچ ہزار سے زائد زبانوں میں سے تین ہزار زبانیں تیزی کے ساتھ زوال کا شکار ہیں۔ صرف امریکہ میں اسکے قدیم باشندے جو ایک ہزار زبانیں بولنے کی صلاحیت رکھتے تھے، ان کی یہ صلاحیت اب صرف ۱۵۰ زبانوں تک محدود رہ گئی ہے۔ آسٹریلیا کے ممتاز ماہر لسانیات پیٹر ہوسلر یہ پیش گوئی کر رہے ہیں کہ اگلے سو برسوں میں نوے فیصد زبانیں صفحہ ہستی سے متروک ہو جائیں گی اور صرف پانچ یا چھ بنیادی اہم زبانیں باقی رہ جائیں گی، جن میں انگریزی، ہسپانوی، فرانسیسی، جرمنی، چینی اور عربی زبانیں شامل ہیں۔ جبکہ نوبل انعام یافتہ ہسپانوی ادیب کمیلو جوسی سیلا یہ پیش گوئی کر رہے ہیں کہ اگلی چند صدیوں تک دنیا بھر میں لوگ صرف چار زبانیں استعمال کریں گے۔ یعنی، انگریزی چینی، عربی اور ہسپانوی۔ اس کے علاوہ تمام زبانیں متروک ہو کر محدود ہو جائیں گی اور علاقائی زبانوں کا روپ دھار لیں گی۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس زوال کو روکنے کے لئیے ہم کس حد تک بند باندھ سکتے ہے!

نذیر ناجی چونکہ اکادمی ادبیات کے سربراہ رہ چکے ہیں تو اس لئے ان کے مضمون 'کلنک کا ٹیکہ' کو محض معاصرانہ چشمک کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا، بلکہ سوچنے کی بات تو یہ ہیے کہ فراز صاحب واقعی اس اعزاز کے حقدار بھی تھے؟ یا یہ اعزاز کسی اور کی حق تلفی کر کے حاصل کیا گیا تھا؟ جہاں تک افسانوں کا تعلق ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام افسانے خوبصورت اور معیاری ہیں۔ 'مسلم چوک کا پاگل انور' بہت ہی خوبصورت اظہاریہ ہے۔ اس کی خوبصورتی کا یہ عالم ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے یہ خیال آتا ہے کہ یہ دو نہیں بلکہ تین ڈاکٹروں کی کہانی ہے۔ ان میں ایک ڈاکٹر ناظم خلیلی بھی ہیں۔ اس کا اختتامیہ میری سمجھ سے بالاتر ہے شائد یہاں کچھ کم ہے؟۔

جوگندر پال کے 'افسانچے' خوب صورت ہیں۔ خاص طور پر 'سکونت' کا آخری حصہ تو بہت ہی خوبصورت ہے۔ 'پژمردہ کا تبسم' اور گورکن بہت ہی خوبصورت ہیں۔ خاور اعجاز کا 'سلام' شاہد ماہلی کی 'نئے مکان کی نظمیں' شاکر کنڈان کے 'ماہیے' اور دیگر نظمیں معیاری اور خوبصورت ہیں۔ 'رہے نام اللہ کا' خوبصورتی سے لکھا گیا ہے۔ جس نے مجھے بہت زیادہ انسپائر کیا ہے۔ اسکی باقی تمام تحریریں مثلاً 'اشتہاروں بھری دیواریں' اور 'بھولنے کی بیماری' شاندار ہیں۔ مجموعی طور پر 'جدید ادب' نے اپنا ایک ادبی معیار بنایا ہے اور اسے قائم بھی رکھا ہے۔

محمد یونس خاں (سرگودھا)

جدید ادب کا شمارہ ہشتم بابت جنوری تا جون ۲۰۰۷ء میرے پیش نظر ہے۔ اتنی ضخامت میں اتنا بھرپور ادبی جریدہ نکالنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں......اداریہ حسب معمول فکر انگیز بھی ہے اور ہمارے قومی المیئے کا آئینہ دار بھی۔ ہم اپنی زبان سے جو سلوک کر رہے ہیں' اس کی مثال کم از کم عالمی تاریخ میں نہیں ملتی' ہمیں اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بجائے یہودیوں سے یہ سبق سیکھنا چاہئے کہ کس طرح انہوں نے عبرانی جیسی مردہ زبان کو زندہ کیا اور ہم ایک معیاری' زندہ زبان کا بیڑہ غرق کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

اس مرتبہ میں اپنے ممدوح ڈاکٹر شفیق احمد صاحب کے مضمون پر کچھ نکتہ وار خامہ فرسائی کر رہا ہوں' براہ کرم اسے شامل اشاعت کیجئے۔ ''اردو اور متروک الفاظ کا مسئلہ'' میں انہوں نے دوسرے پیراگراف میں انوکھا تمثیلی انداز اختیار کیا......اچھا لگا۔ آگے چل کر وہ اپنی بات منوانے کے لیے بہت جذباتی ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب یہ تاثر نہایت غلط ہے کہ میر و میرزا کے دور میں ہر کوئی بادشاہ یا نواب کی زبان بول کر کوئی مصنوعی لہجہ اختیار کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے جو آپ پر بہ نظر غائر مطالعے سے عیاں ہوگی کہ اس عہد میں علم و ادب ہر جا سکہ رائج الوقت تھے۔ ہر کوئی معیاری زبان محفل اور عوامی اجتماع میں بولنا پسند کرتا تھا۔ لکھنؤ اور نواح کے حجاموں' پنواڑیوں' نور باف یا اسی قسم کے دیگر پیشہ ور افراد کو کسی بہادر شاہ ظفر' نواب اودھ یا راجہ مہاراجہ کو خوش کرنے کے لیے (باقاعدہ تعلیم حاصل کئے بغیر) اعلیٰ زبان بولنے اور اس میں شاعری کرنے کی کیا حاجت تھی۔ دوسری بات یہ کہ ظفر جیسے استاد سخن کی پوری شاعری پڑھیئے' اس نے جا بجا عوامی لب و لہجہ اختیار کیا اور حد یہ کہ پنجابی میں بھی شاعری کا شوق پورا کیا' جب کہ اس دور میں کوئی پنجابی شاعر کم از کم اُس خطے میں نمایاں نہ تھا......کیا حاجت تھی اسے ایسا کرنے کی؟؟؟ ﴿بہادر شاہ ظفر کے صحیح کلام کے مطالعے اور تنقید کے لیے شان الحق حقی مرحوم کی 'نوادرِ ظفر' ضرور ملاحظہ کیجئے﴾

ڈاکٹر شفیق صاحب زبان کی اصلاح اور سند و معیار کا تعین کوئی تو کرے گا' ورنہ ہر طرح کا آدمی ہر طرح کی زبان بولے گا اور لکھے گا پھر ادبی زبان کا بھی یہی حشر ہوگا جیسے ان دنوں ہمارے ذرائع ابلاغ ہندوستان کے بعض کم خواندہ لکھاریوں کی نقل میں فرد/ افراد کے لیے لوگ بول اور لکھ رہے ہیں (دو لوگ آئے' آپ کتنے لوگ ہوو غیرہ)......اس مسئلے پر میرا ڈاکٹر فہیم اعظمی سے بھی اختلاف رہا کہ ڈاکٹر صاحب جب آپ ہر کسی کو لائسنس دے رہے ہیں اہل زبان (اور شاید ماہر زبان) ہونے کا تو پھر ہماری ادبی زبان کا کیا بنے گا۔ یہاں ایک ضمنی مگر اہم بات کی طرف اشارہ' لفظ فرانسیسی کسی کم علم صحافی کی ایجاد ہے' تاریخی واقعہ ہے کہ ایڈیٹر روزنامہ زمیندار نے اس سب ایڈیٹر کو جھاڑ پلائی تھی کہ میاں یہ کون سی قوم ہے' کہاں بستی ہے؟؟؟ صحیح لفظ فرانس سے فرانسی یا فرانسوی ہے (جیسا کہ اہل ایران بولتے ہیں) فرانسہ ہے (جیسا کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے محاسن کلام غالب میں استعمال کیا) یا فرینچ......اس زبان سے واقفیت کے سبب عرض کروں کہ خود اہل زبان اس کے لیے جو لفظ استعمال کرتے ہیں' اردو گو حضرات کے لیے نہایت ثقیل ہے: ف (خ) انسے ﴿یعنی فے کے ساتھ جڑی ہوئی بلغمی آواز میں حرف خے﴾' لہٰذا فرانسی بہتر ہے۔

لہجے کے اختلاف کا مسئلہ اتنا سنگین نہیں جتنا کہ شین قاف کا۔ ذرا دینی حوالے سے دیکھئے۔ جب آپ کسی آیت یا

حدیث میں شامل لفظ 'قلب' کو کلب بمعنی کتا کہتے یا بولتے ہیں تو کیسا لگتا ہے...... مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ معدودے چند اہل پنجاب تلاوت قرآن میں یہ محنت کرتے ہیں مگر میں اس ضمن میں میمن برادری کی مثال روشن سمجھتا ہوں جنھوں نے ایک دینی اصلاحی تحریک سے متاثر ہوکر اپنا شین قاف درست کرلیا۔ یہ تعصب کی نہیں دین کی بات ہے۔ اردو محض مسلمانوں کی زبان نہیں مگر دین اسلام کی ایک بڑی زبان ضرور ہے۔ اس باب میں شدھ ہندی بولنے والے ہندوؤں سے سبق لینا چاہئے۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے ایک لفظ 'دارالھائے حکومت' لکھا ہے جو بجائے خود غلط اور ایجاد بندہ ہے۔ اسی طرح لفظ سند کی جمع اسانید ہے نہ کہ سندات...... جہاں تک کسی ایک مخصوص پیشے یا شعبے سے متعلق لفظ اور اس کے مترادفات کا تعلق ہے تو یہ کوئی ایسا لاانیحل مسئلہ نہیں' کسی بھی جامع لغت سے حل ہوسکتا ہے۔ میں نے اردو لغت بورڈ کی مفصل لغت پوری نہیں پڑھی' جستہ جستہ دیکھی ہے مگر میرا خیال ہے کہ اس جیسی لغت میں یہ مسئلہ اس طرح نہ ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ بہت سال پہلے ڈاکٹر نسیمہ ترمذی (عرف نسیمہ بنت سراج) نے اپنے اخباری کالم میں ازراہ تفنن یہ بات چھیڑی کہ اردو کا دامن حرف 'ڑ' سے شروع ہونے والے الفاظ سے خالی ہے۔ جواب میں مختلف زبانیں بولنے والے حضرات نے اپنی اپنی طرف سے الفاظ کی کچھ مثالیں دیں کہ انہیں شامل اردو کرلیا جائے۔ ایک عرصہ بعد جب میں ٹیلی وژن کے لیے تحریر و تحقیق کا سلسلہ شروع کیا...... (۱۹۹۳ء میں) پروگرام ''ٹی وی انسائکلو پیڈیا'' کے لیے حرف 'ڑ' کا تعارف اس مواد کی مدد سے لکھنا چاہا تو میری تگ و دو کے بعد محترمہ سے محض ٹیلی فون پر طویل اور لاحاصل گفتگو ہوسکی' انہوں نے مواد نہ فراہم کیا...... بالآخر میں نے اردو لغت بورڈ کی لغت سمیت مختلف ذرائع سے وہ مختصر اسکرپٹ مکمل کیا۔

آخری بات ڈاکٹر شفیق احمد کے مضمون کے حوالے سے' میرے دادا مرحوم ہاپڑ (میرٹھ) سے آبائی تعلق کے باوجود چوں کہ ہندوستان کا چپہ چپہ گھومے تھے' پوربی اور پنجابی میں آزاد تک بندی کرتے تھے' ان کی زبان سے ہم نے لفظ 'کبھی' ہمیشہ 'کدی' سنا جو قدیم اردو اور پنجابی میں مشترک ہے۔ اسی طرح میری والدہ مرحومہ کپورتھلہ میں پیدائش اور لاہور و بہاول پور میں قیام کے سبب اکثر ایسی زبان بولتی تھیں کہ اکثر میرٹھ کی بجائے پنجابی گلابی اردو لگتی تھی۔ بات یہ ہے کہ زبان میں شعوری اختلاط بے جا ہے مگر غیر شعوری اور فطری انداز میں کسی بھی علاقے کے لوگوں کا کوئی لہجہ ہوسکتا ہے جو کتابی یا علمی و ادبی زبان آسانی سے نہیں بنتا......اس حوالے سے اہل فرنگ کی مثال بھی دی جاسکتی ہے' اگر برا نہ لگے۔

میں کبھی بھی نذیر ناجی کا مداح نہیں رہا مگر انہوں نے روزنامہ جنگ میں' کلنگ کا ٹیکہ کے عنوان سے احمد فراز کی پول کھول کر اپنے محبّ اردو ہونے کا ثبوت دیا۔ احمد فراز کے اندھے مقلدین کے لیے اس کالم کا پڑھنا نصابی ضرورت ہے۔ بہاول پور سے ڈاکٹر روبینہ رفیق نے محمد خالد اختر کی مزاح نگاری پر بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے جس سے ادیب موصوف کی کتب پڑھے بغیر ہی اچھا تعارف حاصل ہوجاتا ہے۔ گوشہ رشید امجد اس قدر معلومات افزا ہے کہ اسے جدا کتابی شکل میں شائع ہونا چاہئے نیز گوشے کے شروع میں اکبر حمیدی کے خاکے ''علامتی افسانے

کا اکبر اعظم'' سے اقتباس بہت عمدہ اور دل چسپ ہے۔ ایسے خاکے کم ہی لکھے جاتے ہیں۔ اکبر حمیدی صاحب اگر شاعری کے بجائے اس طرف زیادہ توجہ دیں تو یہ ناقدانہ شکوہ دور ہوگا کہ اردو میں بہت کم اچھے خاکہ نگار ہیں۔

نصرت ظہیر صاحبہ (اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ خاتون ہیں) نے نسیان پر بہت پُر لطف پیرائے میں قدیم طنز و مزاح نگاروں کی یاد تازہ کردی ہے۔ آپ کا انشائیہ ''رہے نام اللہ کا'' ایک مرتبہ پھر پڑھا' فکر انگیز اور پُر خیال نگارش ہے۔ آپ نے حدیث قدسی کے مفہوم میں یہ بدیع خیال پیش کیا کہ اگر خدا دہر ہے تو دہریہ کا مطلب ہوا خدا پرست۔

شاعری میں مظفر حنفی صاحب کی پہلی غزل خاصہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کے یہ شعر بہت اچھے لگے:

جھلستی ریت میں زندہ گڑے ہو' کیا ہوا تم کو   تمہارے ہاتھ پر بیعت کبھی منجدھار کرتے تھے

ہماری راہ میں دیوار کی مانند حائل ہیں   وہ جن کے واسطے ہم راستے ہموار کرتے تھے

حسن عباس رضا نے ایک مصرع میں لفظ 'مرجانی' استعمال کیا ہے جو غالباً پنجابی ہے......اگر انہوں نے عربی لفظ مرجان سے یہ لفظ تخلیق کیا ہو تو وضاحت درکار ہے۔ کاوش پرتاب گڑھی کی غزل میں نظم مسلسل کا انداز محسوس ہوا۔ قاضی اعجاز محوؔر نے پہلی غزل کے مقطع میں لفظ 'انکارا' برتا ہے جو اردو میں تو اس طرح استعمال نہیں ہوتا' ممکن ہے اہل پنجاب اسی طرح بولتے ہوں' البتہ ان کی دوسری غزل ہر لحاظ سے اچھی لگی۔ خورشید اقبال کی غزل عمدہ ہے' اس سے قبل ان کا ایسا کلام نظر سے نہیں گزرا۔ اس مرتبہ کسی سبب آپ سے چوک ہوئی کہ ہمارے دوست فیصل عظیم کے بعد آپ کے ماموں صادق باجوہ کا کلام دیکھنے کو ملا' میرا خیال ہے کہ حفظ مراتب کے تحت ناموزوں ہے' بہرحال فیصل کا یہ شعر منفرد ہے:

یہاں پرشان جاتی ہے' وہاں پر جان جاتی ہے   زمیں چھوٹی تو لگتا ہے کہ چھوٹا آسماں اپنا

خاور اعجاز کا یہ شعر منفرد ہے:

راستہ روک رہی تھی مِرے سائے کا مگر   دھوپ کے ساتھ ہی دیوار میں دَر آیا ہوں

بزرگ افسانہ نگار سلطان جمیل نسیم کا افسانہ گورکن اچھا لگا' اس موضوع پر اردو میں ایک آدھ ادیب نے ہی لکھا ہوگا۔ ناظم خلیلی کا افسانہ انداز تحریر کے لحاظ سے منفرد ہے' مگر اس کا اکثر حصہ مجھے انشائیہ معلوم ہوتا ہے۔ غالبؔ جیسے قد آور شاعر کے فارسی کلام کا منظوم ترجمہ صباؔ اکبرآبادی کے قلم سے ایسا جان دار ہے کہ اگر میرزا صاحب کے دور میں ہوتا تو شاید وہ اپنے مقبول اردو کلام اور اس زبان کو ہیچ نہ سمجھتے' بلکہ یہ تراجم ان کے فارسی کلام کو نہ سمجھنے والوں میں انہیں اسی وقت مقبولیت کی سند عطا کردیتے۔ قاضی اعجاز محوؔر کے مکالماتی ماہیے بھرپور اور جدید عہد کے عکاس ہیں۔ نسرین نقاش محض ماہیا نگاری میں ہی اختصاص کریں تو اردو کی پہلی بڑی ماہیا نگار شاعرہ کہلائیں گی۔

قاضی سلیم کے بارے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان کی وفات کب ہوئی۔ میری ہائیکو کی شمولیت اور محترمہ وضاحت نسیم کی کتاب پر مختصر تبصرے کے لیے صمیم قلب سے شکریہ قبول کیجئے۔

حصہ مکاتیب میں نعیم الرحمٰن صاحب کے خط کے حوالے سے اتنا کہوں گا کہ میرے چودہ سالہ ٹیلی وژن کیرئیر

(بطور لکھاری و محقق) کا اہم ترین مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر پڑھے لکھے جہلاء ان اہم مناصب پر فائز ہیں جہاں ماتحتوں کی اصلاح زبان و انداز کی توقع از بس کی جاتی ہے...... پی ٹی وی میں اسکرپٹ ایڈیٹر کا عالم فاضل ہونا شرط نہیں بلکہ ایک مخصوص فرقے کا پیروکار ہونا لازم ہے۔اس بارے میں اگر لب کشائی کروں تو بہت سا ناگفتنی مواد سامنے آئے گا۔ **سہیل احمد صدیقی** (کراچی)

''جدید ادب'' کا ہر شمار جدید ہوتا ہے۔کچھ نہ کچھ نیا ہو تو باذوق قاری ادب سے دور نہیں بھاگتا بلکہ قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔جدید ادب کا اپنا ایک مزاج ہے،جس میں اُردو ورلڈ کے تمام اہل قلم نظر آتے ہیں۔ جدید ادب کے سات (7) شماروں اگر ورق گردانی کی جائے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ رسالہ جرمنی، پاکستان اور بھارت علمی ادبی و ثقافتی سطح جوڑ رہا ہے۔حیدر قریشی اور نذر خلیق کی ادارت میں نکلنے والا جدید ادب مجلّاتی صحافت میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔شمارہ (7) میں پاکستان کے بلند قد ادیب شاعر اور ناقد ڈاکٹر انور سدید صاحب کے نظامِ فکر و فن پر گوشہ ایک اہم باب ہے،جس میں سدید صاحب کے فکر و فن کو خراجِ تحسین عطا کرنے والے اکبر حمیدی، عمران نقوی اور شفیع ہمدم مبارکباد کے مستحق ہیں۔پروفیسر رشید امجد، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر انیس صدیقی کے مضامین خوب تر ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا، احمد ہمیش، پروفیسر حمید سہروردی، صبا اکبر آبادی اور ناظم خلیلی کا کلام بلاغت نظام اپیل کرتا ہے۔محترم حیدر قریشی، بلند اقبال اور سلطان جمیل نسیم کے کہانی افسانہ متاثر کن ہیں۔کتابوں کے خصوصی مطالعے کے تحت محترم حیدر قریشی، ڈاکٹر نذر خلیق اور ناصر عباس کے تبصرے اور تاثرات نے جدید ادب میں جان ڈال دی ہے۔جدید ادب کے شمارے کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن اس ماہیے سے آباد رہا۔

یوں روشن جان ہوئی
دل کہیں جیسے
مغرب کی اذان ہوئی

ڈاکٹر غضنفر اقبال۔گلبرگہ۔ (انڈیا)

Hyder Qureshi Bhai Jaan: I've today received a copy of Jadeed Adab through Mrs. Parvin Shere. Thanks for remembering me. I am in Canada getting treatment for prostate cancer. It is a cumbersome, prolonged and painful process, radiation therapy and all. But Allah is great and He will not let me die before I've had the fullest exposure of my creative faculty through poems....Jadeed Adab is beyond my expectations. Your editorial is thought-provoking. Indeed, it is not the spokesmen of Hindu-Hindi fundamentalism alone who are responsible for dubbing Urdu as the language of the Muslims in India, but some misguided Muslims

themselves also.

.Rashid Amjad deserves a thousand pages of critical appreciation for his immortal effort to enrich Urdu fiction. He is nine years my junior in age, but so tall in his literary stature that I feel a pygmy before him. The articles about him, particularly Dr. Naheed Qamar's and Safia Abbad's, touch two very important aspects of his art which are experimental and yet rooted in tradition. In his manipulation of fictional time sequence, he doesn't follow the path paved by Qurratulain Hyder, who herself had actually taken her cue from James Joyce and Virgine Woolf, but it is an approach which is purely Rasheed Amjad's own. I'm going to write a letter in Urdu to you as soon as I am strong enough to sit in a chair (my pelvis-skin is burnt through radiation and I feel difficulty in sitting up), and also send a couple of my poems to you....Remember Hyder bhai, I've always had great regards for you. My phone number here is 519-621-8951, and my postal address is as under: 367, Burnett Avenue, Cambridge. Ontario. N1T-1G6. Canada. Yours: Satyapal Anand

ستیہ پال آنند(اونٹاریو۔کینڈا)

☆☆☆ جدید ادب کا شمارہ ۸ فردوس نگاہ ہوا۔اس خوبصورت ادبی سوغات کے لیے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اداریئے میں آپ کی یہ تجویز لائق توجہ ہے کہ اردو کے تینوں مراکز پاکستان، ہندوستان اور برصغیر سے باہر کی بکھری ہوئی پاکٹوں کی ایک ایسی کانفرنس بلائی جائے جو اردو کی بقا و ترویج کے لیے کوئی لائحہ عمل ترتیب دے سکے۔مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہل کیسے ہو؟
متروک الفاظ کے سلسلہ میں ڈاکٹر شفیق احمد صاحب کی اس بات سے اتفاق کر لینا چاہئے کہ معاشرے میں رائج لفظوں کو اردو زبان و ادب کا حصہ مان لیں۔''کلنک کا ٹیکہ''میں نذیر ناجی صاحب نے احمد فراز کے قول و فعل میں تضادات کی واضح نشاندہی کی ہے۔وہ لائق مبارکباد ہیں کہ بڑی بے باکی کے ساتھ حقائق پر سے پردہ اُٹھایا ہے۔ محمد خالد اختر کی مزاح نگاری اور ان کی ہمہ جہت شخصیت کا احاطہ ڈاکٹر روبینہ رفیق صاحبہ نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔''بھولنے کی بیماری'' ایک عمدہ فکاہیہ ہے جس کے لئے نصرت ظہیر لائق مبارکباد ہیں۔مگر ان سب میں آپ کی یادوں کا مضمون ''رہے نام اللہ کا'' حاصلِ مطالعہ رہا۔جو بے حد مفید اور معلوماتی ہے۔خصوصاً سائنس کے منفی رجحانات سے الوہیت کے اثبات کا نتیجہ اخذ کرنا آپ کی مذہب سے گہری وابستگی کی روشن دلیل ہے۔گوشۂ رشید امجد ایک عمدہ خراجِ عقیدت ہے جس کے مطالعہ سے صاحبِ گوشہ کی اسلوبیاتی، فکری اور تخلیقی جہات روشن ہوتی ہیں۔شعری حصہ بھی وقیع اور معیاری ہے۔ **سعید رحمانی** (اڑیسہ،انڈیا)

☆☆☆حسبِ سابق جدید ادب کے تازہ شمارہ نمبر ۸ کے بھی شعری و نثری دونوں حصے معیاری و وقیع

ہیں۔مضامین میں ''اردو اور متروک الفاظ کا مسئلہ'' غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔نذیر ناجی صاحب نے 'کلنک کا ٹیکہ' بھی خوب لکھا ہے۔آپ کا تحریر کردہ اداریہ سو فیصد حقیقت پر مبنی ہے۔

کاوش پرتاپگڈھی (دہلی)

☆☆☆ جدید ادب کا آٹھواں شمارہ موصول ہوا،شکریہ۔دیارِ غیر میں رہ کر بھی آپ جس حوصلہ مندی سے رسالہ نکال رہے ہیں،مبارکباد کے مستحق ہیں۔خالص ادبی خدمت اسی کو کہتے ہیں۔رسالے کے تعلق سے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ یہ اسم بامسمّٰی ہے۔ساری تخلیقات پسند آئیں۔رشید امجد کا گوشہ بھی خوب ہے۔نظموں اور غزلوں کا حصہ بے حد معیاری ہے۔میں آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتا ہوں۔گزشتہ دنوں خورشید اقبال کے مکان پر گفتگو کے دوران آپ کا ذکر نکل آیا اور دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔انہوں نے آپ کی کتاب ''میری محبتیں'' دکھائی۔میں اسے گھر لیتا آیا اور اول فرصت میں پڑھ گیا۔کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کے اثرات دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔میں ''میری محبتیں'' کا شمار بھی انہیں کتابوں میں کروں گا۔آپ کی تحریر نہایت شگفتہ ہے۔خاکے عموماً جس مزاج اور جس طرزِ تحریر کا تقاضا کرتے ہیں وہ آپ کے یہاں موجود ہے۔

معید رشیدی (۲۴۔نارتھ پرگنہ۔مغربی بنگال)

☆☆☆ سلام مسنون۔شمارہ ۷ میں اعلان کیا گیا تھا کہ ''جدید ادب'' (جرمنی) کا شمار نمبر ۸ جولائی ۲۰۰۷ء میں شائع ہوگا۔اس لیے میں نے شمارہ سات آہستہ آہستہ پڑھا لیکن اگلے روز پہلے نذر خلیق صاحب نے اور پھر آپ نے یہ بتا کر حیرت زدہ کر دیا کہ آٹھواں شمارہ تو چھپ چکا ہے۔ہمارا ڈاک کا نظام اتنا اچھا اور ترقی یافتہ ہے کہ اکثر غیر ملکی پرچے منزلِ مقصود پر نہیں پہنچتے۔سو ''جدید ادب'' کا نیا شمارہ (۸) بھی مجھے موصول نہ ہوا۔میں ڈاکٹر نذر خلیق کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے خان پور سے مجھے پرچہ عنایت فرمایا۔

میں نے اردو زبان کے مسئلہ پر آپ کا اداریہ بڑے غور سے پڑھا ہے۔اردو کو مسلمانوں کی زبان کے طور پر آگے لانا محلِ نظر نہیں تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ''اردو'' اس وقت بھی ہندو پاک کی واحد زبان ہے جو دونوں ملکوں کے ہر مقام پر بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے اور اب اس کی بستیاں پوری دنیا میں پھیل گئی ہیں۔''اردو'' کی مخالفت انیسویں صدی میں شروع ہوگئی تھی کیوں کہ یہ عربی سے ملتے جلتے رسم الخط (نستعلیق) میں دائیں طرف سے لکھی جاتی تھی اور اس میں فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش بھی زیادہ تھی جس کے خلاف سر سیّد احمد خان کے زمانے میں ردِعمل پیدا ہوا۔فارسی کی سرکاری اہمیت ختم کرنے کے لیے اور ہندی اور اردو میں تنازع پیدا کرنے کے لیے انگریزی سرکار نے ''بی جمالو کا'' اپنا کردار ادا کیا لیکن کوئی زبان جب تک عوام میں زیرِ استعمال ہے اسے ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس میں نئے الفاظ شامل ہوتے اور اس کے ذخیرے میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اس کے لئے جو اصول انشاء اللہ خان انشاء نے وضع کر دیا تھا اور وہ آج تک مستعمل ہے۔ڈاکٹر گیان چند جین نے امن و آشتی کی اس زبان کو فرقہ پرستی کے لیے استعمال کیا ہے۔چنانچہ ان کی مخالفت ہر جگہ ہو رہی ہے۔ڈاکٹر گیان چند جین کو جو عزت اور شہرت اردو زبان نے دی ہے اس پر انہوں نے خود جھاڑو پھیر دیا ہے۔کیوں کہ اردو کی ترویج و ترقی میں ہندو ادیبوں کے حصے کو کوئی خرد مند اور صاحب شعور نظر انداز نہیں کر سکتا۔ڈاکٹر جین کے اس اقدام میں سیاست اور سازش کا عمل دخل بھی ظاہر کیا جا رہا ہے۔جین صاحب کو یہ دل آزار کتاب لکھنے کی انگیخت دینے والوں کے نام تک لئے جا رہے ہیں اور وہ اپنا دفاع کرنے میں بھی مصروف نظر آتے ہیں کیوں کہ خود ان کو عزت، عظمت اور شہرت اردو زبان و ادب نے ہی دی ہے۔جین صاحب نے اپنے بارے میں جو وضاحت فرمائی ہے وہ متاثر نہیں کرتی ہاں ان کی علالت پر ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔وہ صحت مند ہوتے تو اپنا دفاع مضبوط پیمانوں سے کرتے یا شاید یہ کتاب ہی واپس لے لیتے خدا انہیں صحت دے!

ڈاکٹر شفیق احمد نے مقالہ ''اردو اور متروک الفاظ کا مسئلہ'' محنت سے لکھا ہے لیکن بعض ضعیف الفاظ کے متروک کر دیئے جانے کے عمل کی نفی وہ لسانی بنیادوں پر نہیں کر سکے۔دنیا کی ہر زبان نئے الفاظ قبول کرتی ہے اور بعض الفاظ متروک کر دیتی ہے۔اس کے لئے میں اوپر انشاء اللہ خان انشا کے اصول کا حوالہ دے چکا ہوں جو وسعتِ زبان کے بارے میں ہے۔بعض الفاظ کے متروک ہونے کا عمل بھی عوامی نوعیت کا ہے اور اس کا پیمانہ بھی عوامی قبولیت ہے۔کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ بیرونی ممالک میں اردو کی بستیاں قائم ہونے کے بعد اردو کے بہت سے نئے الفاظ ان ممالک کی لغتوں میں شامل کر لئے گئے ہیں جبکہ بے شمار ایسے الفاظ ان ممالک کی لغتوں میں موجود ہیں جو بالکل استعمال نہیں ہوتے۔اور اگر کوئی شخص اپنی علمیت کے اظہار کے لیے انہیں استعمال کرتا ہے تو وہ جنبی نظر آتے ہیں۔یہاں مجھے سرگودھا کی ایک محفل یاد آ رہی ہے جس میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، سجاد نقوی، پرویز بزمی، ڈاکٹر خورشید رضوی اور چند دوسرے ادب دوست حضرات موجود تھے۔ڈاکٹر صفدر حسین (مرحوم) تشریف لائے تو انہوں نے وہاں موجود اصحاب کو ''پنجابی ڈھگے'' کہا، جیلانی صاحب نے ان پر ''تلیر'' کی پھبتی کسی اور پھر بحث چل نکلی جس میں ڈاکٹر صفدر حسین نے ''اردو'' کو اپنی ادبی ضرورت قرار دیا اور اس زبان کے لیے پنجاب نے جو خدمات انجام دی تھیں ان کا اعتراف کیا اور اپنی روزمرہ دیہاتی بولی جو نواح دہلی کے دیہات میں مستعمل تھی کی مثال دی تو اسے ہم سب سمجھ نہ سکے۔کسی زبان میں الفاظ کی جمع اور تفریق کا عمل کسی فارمولے یا ضابطے کی پیروی نہیں کرتا۔زبان لالہء خودرو کی طرح پھیلتی ہے اور اس کی شاخ کے ساتھ لگا ہوا جو لفظ کا پھول خشک ہو جاتا ہے وہ خود بخود گر جاتا ہے میری ناچیز رائے میں اس کے لئے نجم الغنی اور خالد حسن قادری سے معیار کی سند حاصل کرنا ضروری نہیں اور کسی تخلیق میں جھانکنا بھی اہم نہیں۔ہاں ادبی تقاضے کے تحت کد کداں یہ کام کر لیں تو معیوب نہیں۔

نذیر ناجی کا کالم ''کلنک کا ٹیکہ'' میں پڑھ چکا تھا آپ نے اسے احمد فراز کے ضمیر کی ''بیداری'' یا ''عدم بیداری'' سے منسلک کر دیا ہے اور نذیر ناجی کے کالم کی حقیقت دریافت کی ہے۔۔؟ میں اس کالم پر اپنا ردِعمل اخبار میں پیش کر چکا ہوں۔احمد فراز کا سجاد ظہیر کی نظریاتی ترقی پسند تحریک سے تعلق صرف شہرت کے لئے تھا، عملی زندگی میں انہوں نے صرف اپنی ذاتی ترقی، دولت، شہرت اور جنسی طور پر عورت میں دلچسپی لی ہے۔آخری مسئلے پر ان کے

ایک مجادلے کی خبر بھی اڑی تھی جو مری کے ایک ''عورت پسند'' شہوت پرست اخلاق باختہ شاعر سے ہوا تھا۔ بُک فاؤنڈیشن میں بدعنوانیوں کی خبریں بھی اڑتی رہیں۔اس قسم کے شعرا ہر دور میں کام آنے والی نظمیں لکھ رکھتے ہیں اور نجی محفلوں میں سنا کر اپنی انسان دوستی کا بھرم قائم رکھتے ہیں۔کبھی اسلام کے آسمانی صحیفوں کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن فوج کی آمریت کی مخالفت کرتے ہیں لیکن در پردہ انعام و اکرام حاصل کرتے ہیں۔ نذیر ناجی کا یہ دعویٰ ضرور درست ہوگا کہ انہوں نے ہلالِ امتیاز کے لیے صدر مشرف سے خصوصی سفارش کرائی ہوگی، بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے ادوار میں نیشنل بُک کونسل کے عہدہ جلیلہ پر قائم رہے اور سابق تمام واجبات وصول کئے۔ایک ایوارڈ نمائش اور شہرت کیلئے واپس کر دیا لیکن جنرل (ر) جاوید اشرف قاضی سے جو دو ایوارڈ وصول کئے تھے اور جن کے ساتھ کثیر مال بھی وابستہ تھا اپنے پاس ہی رکھا۔نذیر ناجی کا کالم ۲۶ جولائی ۲۰۰۶ء کو جنگ میں چھپا۔شاعر موصوف نے اس کے کسی لفظ کی تردید نہیں کی۔آپ نے اس کالم کو دوبارہ چھاپ کر اخبار کی بجائے رسالے میں زیادہ محفوظ کر دیا ہے۔اب یہ حوالے کے طور پر استعمال ہوتا رہے گا۔

اس پرچے میں ممتاز افسانہ نگار رشید امجد پر ایک وقیع گوشہ پیش کر کے آپ نے اس درویش ادیب کی تحسین کا حق ادا کرنے کی سعی کی ہے جو احمد فرزانہ اور ندیم قاسمیانہ مزاج سے مختلف مزاج کے ادیب ہیں اور ''ادب فروشوں'' سے فاصلہ رکھتے ہیں۔منشا یاد نے انہیں اسلوب کی تازگی، اختصار اور گہری معنویت کا افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ ہر چرن چاولہ کو ان کے افسانوں اور کرداروں میں ایک بالکل کنوارے اور نئے منطقے کی تصویر نظر آئی۔صفیہ عباد اور ڈاکٹر ناہید قمر نے رشید امجد کو نئے زاویوں سے پڑھا۔ان کے مقالات کا حاصل انوکھا ہے۔ تجرید اور علامت کے متعدد اہم افسانہ نگار منظر ادب سے اوجھل ہو گئے ہیں رشید امجد زندہ ہیں مجھے ان کی توسیع سلیم آغا قزلباش، محمد سعید شیخ، طارق محمود، شبہ طراز اور ''اشتہار آدمی'' کے مصنف محمد عاصم بٹ کے فن میں بھی نظر آئی، ان سب نے تجرید کو نئے انداز میں استعمال کیا۔علامت کی تہہ داری سے استفادہ کیا اور جدید تر افسانے میں کہانی کی اہمیت کو تسلیم و قبول کیا۔کامران کاظمی نے محمد عاصم بٹ کے افسانوں کا اچھا تجزیہ کیا ہے لیکن ان کے سب نتائج سے اتفاق ممکن نہیں سچ یہ ہے کہ کامران کاظمی کی تنقید میں آمریت کا عنصر دیکھا جا سکتا ہے اور وہ محمد عاصم بٹ کی تخلیقی آزادی پر حملہ زن نظر آتے ہیں جب کہ اشتہار آدمی کے افسانے ''شکاری''،''تیز بارش میں ہونے والا واقعہ اور ''گڑھے کھودنے والے'' حقیقی عصریت کے آئینہ دار افسانے ہیں اور افسانہ نگار کے گہرے مشاہدے اور وسعت نظر کی گواہی دیتے ہیں۔

اس مرتبہ آپ نے اکبر حمیدی، رضیہ فصیح احمد، اور خاور اعجاز کی چار چار غزلیں اور شاہد ماہلی، شہاز نبی اور ارشد خالد کی چار چار نظمیں پیش کر کے ان کے تخلیقی عمل کے مطالعے کا اچھا موقع دیا۔شاہد ماہلی کی نظموں میں ''نیا مکان'' ایک اہم حوالہ بن گیا ہے جس سے ''نیم پلیٹ''، ''لیٹر بکس'' اور ''ڈسٹ بن'' کی نئی معنویت سامنے آتی ہے۔اکبر حمیدی کا انشائیہ ''اشتہاروں بھری دیواریں'' اور نصرت ظہیر کا مزاح پارہ ''بھولنے کی بیماری'' بڑی دلچسپی سے پڑھے۔اکبر حمیدی کے انشائیے میں اشہارات شہر کی شخصیت پر غالب نظر آتے ہیں اور جناب نصرت ظہیر نے

دراصل میری ''بیماری'' کا ذکر کیا ہے۔اپنی زندگی کا ۷۵واں عبور کرنے کے بعد میں بھول کے مرض میں بری طرح مبتلا ہوں۔خدا جانے نصرت ظہیر صاحب کو دہلی میں یہ خبر کس نے دے دی کہ انہوں نے میرا نام لئے بغیر میری کہانی بیان کر دی۔

کھٹی میٹھی یادوں کے مضمون ''رہے نام اللہ کا'' (از حیدر قریشی) میں باتیں ذاتی ہیں لیکن ان کے نتائج غیر ذاتی بھی نکالے جا سکتے ہیں اور یہ بالعموم دانشِ مشرق پر منتج ہوتے ہیں ان دنوں مصنف کی طرح میں بھی ''پوتا مخلوق'' سے دوچار ہوں اور بڑھاپے کے مزے لوٹ رہا ہوں۔اس مضمون کی یادنگاری انوکھی نوعیت کی ہے۔
سرورق کے اندرون حمایت علی شاعر اور شمیم حنفی کی غزلیں چھپی ہیں اور ان سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔حمایت علی شاعر کا مصرعہ: ''ٹوٹے ہزار بت تو بنا خانہ خدا'' ان کی تلمیح نگاری کا آئینہ دار ہے۔۔شمیم حنفی کا یہ مصرع میری آج کی کیفیت کو آشکار کرتا ہے۔''لئے جاتا ہے اک دریائے بے تابی کدھر ہم کو''
میں نے مختصر خط لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن شوق نے بات بڑھا دی اور یہ دفتر لکھا گیا۔کیا اس طول بیانی کے لئے معذرت ضروری ہے؟ خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

انور سدید (لاہور)

☆☆☆ رشید امجد کے فکر وفن پر پہلی بار ایسا روشن، باوقار اور محبتوں کے لفظوں سے گندھا ہوا گوشہ مطالعہ میں آیا۔ رشید امجد میرے پسندیدہ افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ میں نے نہیں پڑھا لیکن بھارت اور پاکستان کے ادبی رسائل کے توسط سے ان کے افسانے مختلف وقتوں میں پڑھنے کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔میں اس گوشے کی اشاعت پر آپ کو اور ڈاکٹر رشید امجد صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔
ڈاکٹر شفیق احمد کا مضمون بہت اہم ہے۔جدید ادب کے توسط سے پہلے بھی موصوف کے علمی اور لسانی مضمون پڑھ چکا ہوں۔موجودہ مضمون میں آپ نے ولی دکنی کے حوالے سے لفظ 'بھیتر' کا ذکر کیا ہے۔یہ لفظ راجستھان میں بھی رائج ہے۔میں نے ایک شعر میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے، جس پر بعض احباب نے تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب اردو میں لفظ ''اندر'' موجود ہے تو ''بھیتر'' کی کیا ضرورت ہے۔

وہ جس کے روپ کی مہکار تھی فضاؤں میں　　　ہماری روح کے بھیتر گلاب اسی کے تھے

یہاں وزن کے لحاظ سے ''اندر'' بھی لایا جا سکتا تھا لیکن مجھے جو گہرائی اور اپنا پن ''بھیتر'' میں نظر آیا اس کی ہلکی سی رمق بھی لفظ ''اندر'' میں نہیں ہے۔میں تو ''تلک'' کو بھی متروک نہیں سمجھتا۔میں ڈاکٹر شفیق احمد کے خیالات سے پوری طرح متفق ہوں۔

نذیر فتح پوری۔(پونہ۔انڈیا)

تجھ تلک پہنچا ہوں خاصی دیر سے عمرِ کہن
پہلے آنا تھا مگر رہ میں جوانی پڑ گئی　(حیدر قریشی)